گوشۂ مختار شمیم

اردو ادب کا نمائندہ رسالہ

سہ ماہی

انتساب

سرونج



ڈاکٹر سیفی سرونجی

مدیرہ
آسیہ سیفی

سہ ماہی سرونج
انتساب

معاون
آفاق سیفی

اشاعت کا تیئیسواں سال

سرپرست : انل اگروال

شمارہ نمبر ۵۷

گوشۂ مختار شمیم

ہمارے نمائندے

کنیڈا میں : شمس جیلانی
انگلینڈ میں : گلشن کھنہ
انگلینڈ میں : پرویز مظفر (برمنگھم
اٹلی میں : ارشد اقبال آرش
پاکستان میں : سید معراج جامی
ابوظبی میں : یعقوب تصور
مدینہ منورہ میں : خادم حسین خاکسار

قیمت فی شمارہ ہندوستان	:	50/-	روپے	زر رفاقت : 200/-	روپے
برطانیہ و دیگر یوروپی ممالک	:	5/-	پونڈ	20/-	پونڈ
امریکہ	:	8/-	ڈالر	30/-	ڈالر
سعودی عرب	:	15/-	ریال	60/-	ریال
عرب امارات	:	15/-	درہم	60/-	درہم

اس شمارے کی قیمت : سو روپئے

ترتیب : ڈاکٹر سیفی سرونجی

رابطہ : سیفی لائبریری، سرونج، (ایم. پی.) ۴۶۴۲۲۸

Saifi Sironji, Saifi Library, SIRONJ (M.P.) 464228

Phone : 07591-253819, Mob.: 9300782056

SAD BHAWNA MANCH, SIRONJ Ph.:253211

فہرست

کمپوزنگ و طباعت: فاس کمپیوٹرانکس، ۳۷، چوکی تلیا، بھوپال - 462 001

FAS COMPUTERONICS, 37 OPP. CHOWKI TALAYYA, BHOPAL

نعت رسولِ اکرم ﷺ

اے مری فکرِ رمیدہ ذرا اس سمت بھی چل
منزلِ شوق میں ہے دشتِ تمنّا کا محل
داغ پیشانی سے ظاہر جو ہوا نورِ امل
بن گیا آنکھ میں وہ سوزِ یقیں کا کاجل
چشمِ نظارہ کہ ہے آئینہ تمثال سنبھل
دیدہ و نور سجالائے اُجالوں کے کنول!
دہن و لب پہ چٹکنے لگے غنچے شاداب
مسکرائے تو سجے چاند ستاروں کے محل
عظمتیں آپؐ کے قدموں پہ نثار آمادہ
رفعتیں صدقے ہوئی جاتی ہیں ہر دم ہر پل
آپ کا لطف و کرم ! رحمتِ عالم کی دلیل
خلق سے آپؐ کے ہے عظمتِ انصاف کو بل
دونوں عالم کے امیںؐ ، شاہِ مبیںؐ ، سرورِ دیںؐ
بالیقیں احمدِ مختارؐ نبیِ مرسلؐ!
اُن کی نسبت سے ہے تقدیر منوّر میری
میری جھولی میں ہے اک اُنؐ کی تمنّا کا عمل
چشمِ حسرت کے لیے لایا ہے مختار شمیم
دلِ بیتاب، اُمیدوں کا امنڈتا بادل!

مختار شمیم

ڈاکٹر سیفی سرونجی

اداریہ

مختار شمیم : ایک سچا تخلیقی فنکار

پروفیسر مختار شمیم سرونج کے ان منتخب ادبی شخصیات میں شامل ہیں جن کے قلم میں زبردست توانائی ہے۔ وہ جتنے اچھے شاعر ہیں اس سے کہیں بہتر نثر نگار۔ وہ ایک اچھے ناقد ہی نہیں بلکہ ایک نامور محقق کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ ان کی تحریر میں ایک ایسا توازن ہوتا ہے کہ قاری کو کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ جانبداری سے کام لے رہے ہیں یا کہیں کاٹا اور لے دوڑی کا وطیرہ اختیار کر رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب ''ظہیر دہلوی حیات وفن'' کو اردو کے تحقیقی ادب میں ایک کارنامہ تسلیم کیا گیا ہے ان کے اس تحقیقی کام کو ادبی دنیا میں بے حد سراہا گیا۔ ان کی تحقیقی دلچسپیوں اور کارناموں کے پیش نظر مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے انہیں نواب صدیق حسن خاں ایوارڈ برائے تحقیق سے نوازا ہے۔ اپنے تحقیقی مقالے ظہیر دہلوی حیات وفن قلم بند کرتے وقت انہیں ظہیر دہلوی کی ایک رباعی کے اوزان میں اشتباہ ہوا تو انہوں نے بشمول ماہرین عروض نامور محقق کالی داس گپتا رضا سے بھی رجوع کیا۔ اور ان کے حوالے کے ساتھ اسے پیش کیا کالی داس گپتا رضا صاحب سے جب راقم الحروف نے اس سلسلے میں گفتگو کی تو انہوں نے بتایا کہ مدھیہ پردیش میں اگر کوئی صحیح تحقیقی مزاج رکھتا ہے تو وہ ہیں مختار شمیم۔ مختار شمیم صاحب بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن وہ ایک نثر نگار اور محقق کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ ان کی شاعری سے بھی متعلق گفتگو کی جائے لہٰذا ان کے دیگر کارناموں پر بات نہ کرتے ہوئے ان کی شاعری پر چند تاثرات قلم بند کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری ہے وہ غزل کے مقابلے میں نظم میں زیادہ کھل کر اور طاقتور لہجے کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔ بحیثیت نظم نگار وہ مدھیہ پردیش کے نمائندہ نظم نگاروں کی فہرست میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔

ان کی نظموں میں ایک گہری معنویت دکھائی دیتی ہے۔ ان کے یہاں لفظ بہت اہمیت رکھتے ہیں وہ لفظ کو بہت قیمتی سمجھتے ہیں۔ اور یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ لفظوں کے صحیح پارکھی ہیں۔ لفظوں کی قدر و قیمت جتنی ان کے یہاں ہے اس قدر میں نے ان کے ہمعصروں میں کم دیکھی ہے۔

نظم ہو کہ نثر وہ نپے تلے جملوں میں بہت بڑی اور گہری بات کہہ دیتے ہیں خود وہ اپنی گفتگو میں بھی ان کا انداز محتاط رہا ہے اور بے کار فضول کی باتوں میں اپنا وقت نہیں گنواتے۔ جو بات دوسرے ایک پیرا گراف یا ایک مضمون میں کہتے ہیں وہ بات مختار شمیم صاحب ایک جملے میں بیان کرتے ہیں یہی امتیازی پہلو ان کی نظموں میں نمایاں ہیں۔ چند نظمیں دیکھئے:

ہجر کی صبح ہجر کی شام

جنگل جنگل گونج اٹھا سناٹا کیسا
نازک نازک شاخیں ہاتھ پسارے چیخ رہی ہیں
برگ و بار ٹوٹے بکھرے خاک ہوئے ہیں
مٹی دھول اور راکھ ہوئے ہیں
نازک نازک موتی جیسے شبنم قطرے
جگ مگ جگ مگ کرتے جھلمل جھلمل تارے
ڈالی ڈالی پتی پتی چوم رہے ہیں
اپنی خوبی اپنی چاہت پر وہ کیسے جھوم رہے ہیں
سارے جہاں میں چھم چھم چھم چھم دھوپ جو اتری
کیسی خوشی تھی
کس کو خبر کہ سورج کی کرنوں میں آئی تھی (موت چھپی تھی)
نازک نازک موتی جیسے شبنم قطرے لرز گئے ہیں
پتی پتی پھول سے جدا ہوئے ہیں
تنہا شاخ پہ تنہا پرندہ تنہا چاند کے سناٹے میں دیکھ رہا ہے
جانے کیا کیا سوچ رہا ہے
ہجر کی صبح ہجر کی شام
اس کی قدرت اس کا نظام

☆

اس نظم کے ایک ایک لفظ کو دیکھئے تو پتہ چلتا ہے کہ معنی کا ایک سمندر ہے جو لفظوں کی تہوں میں چھپا دیا گیا ہے اس میں غضب کا ردم ہے۔ ایک مختصر نظم بھی دیکھئے:

گلابوں کی قطاروں کا یہ منظر
کسی کی یاد کا اک سلسلہ ہے
کبھی یہ شعر بھی میں نے کہا تھا
گلاب اب بھی کھلے ہیں میرے آنگن
کسی یاد کی خوشبو نہیں ہے

☆

اس طرح کی کئی نظمیں شمیم صاحب کی پیش کی جاسکتی ہیں جن میں شاعر اپنی پوری توانائی کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر دیتا ہے اور اپنی پوری فکری توانائی کے ذریعہ قاری کو اپنی گرفت میں لینے کے ہنر سے نہ صرف واقف ہے بلکہ اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ایسا نہیں کہ شمیم صاحب نے صرف اپنی نظموں میں یہ رویہ اپنایا ہے بلکہ ان کی دیگر تحریروں میں بھی یہ بات نمایاں ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ مختار شمیم کی نظمیں ہوں یا غزلیں ہوں افسانے ہوں یا مضامین ہوں یا کوئی تحقیقی مقالہ ہو ان کے یہاں زبان و بیان کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ لفظوں کی قدر و قیمت اور ان کے استعمال اپنے پورے فنی تقاضوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ جہاں ان کی نظموں میں ایک طرف تہہ داری اور گہری معنویت نمایاں ہے تو دوسری طرف وہ ایک مفکر کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں ان کے یہاں احتیاط بہت ہے۔ جس طرح انہوں نے اپنی شخصیت کو الگ تھلگ کر اور ساری گروہ بندیوں سے محفوظ رکھا ہے۔ بالکل اسی طرح اور یہی احساس ان کی شاعری میں نمایاں ہے وہ قدم قدم پر احتیاط برتتے ہیں ان کے یہاں کوئی لفظ بے عمل یا ایسا نظر نہیں آئے گا جو بھرتی کا ہو، بلکہ کہیں کہیں تو وہ ایسے غیر مانوس الفاظ کو بھی ایسا استعمال کرتے ہیں کہ لفظ جگمگا اٹھتا ہے اور زندۂ جاوید ہو جاتا ہے۔ چند شعر دیکھئے:

کسے پڑی ہے جو دریا کے پار اتارے گا
تہوں میں ڈوب بھی جاؤں تو کون دیکھے گا

حرف ہے نا معتبر سوچا کئے　　　　سادہ کاغذ دیر تک دیکھا کئے

اپنی حیرانی کو لے جاتے کہاں یہ آئینے
آنکھوں ہی آنکھوں میں رازِ گفتگو بنتے گئے

جلتی دھوپ میں سبز سمندر رکھتے ہیں
ان آنکھوں میں کیسے منظر رکھتے ہیں

باقی صفحہ ۴۸ پر....

افتخار امام صدیقی

پیکری فوٹو گرافی

''میانہ قد، بارعب چہرہ، سوچ رنگ آنکھیں، کشادہ جبیں، پلکوں میں پروئے ہوئے خواب مستقبل، وضع قطع میں فنکار، مختارات و متروکات کے مالک، پوشاک میں انفرادیت پسندی، صلح حدیبیہ کے قائل، مذہب مزاج، حق شناس، دنیا بے زار، موسیقی شعار، نرم گفتار، نثر و نظم میں تجربوں کے قائل، زندگی آمیز اور زندگی آموز تحریریں، درس و تدریس کو عبادت کا درجہ دینے والے، ظہیر دہلوی مرحوم کے شارح اور ان ہی کے شعر کا پیکر:

چاہت کا جب مزا ہے کہ وہ بھی ہوں بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی



ڈاکٹر مختار شمیم، اپنے اندرون میں لفظ و معنی کے گم شدہ آفاق ہیں۔ ابھی وہ اپنی ہی سیاحت میں مصروف ہیں اور شعر و نثر میں سے اُبھر کر، کچھ ندرت آمیز جواہر پارے، فنون کے پارکھوں کو دے جاتے ہیں، یہ تخلیقی عمل، مسلسل متواتر ہے۔ کہانی سے تحقیق تک کے سفر میں انہوں نے ایک صادق اور حرف و لفظ کے امین کا جو مثبت کردار ادا کیا ہے، وہ خال خال ہی ملے گا۔ اپنے فن میں ایسا استغراق، اتنی محویت اور گم شدگی نے انہیں اُردو زبان و ادب کا ''صوفی'' بنا دیا ہے۔ سراپا فن بن گئے ہیں مختار شمیم۔ لیکن ایک خاص بات اور بھی ہے، وہ اپنے مختلف ہونے کا شور نہیں ڈالتے بلکہ انہوں نے اپنا قاری تلاشا ہے۔ موصوف مکالمہ پسند ہیں۔ بقول ظہیر دہلوی

چاہت کا جب مزا ہے ہوں کہ وہ بھی بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی



(شاعر بمبئی، گوشۂ مختار شمیم، شمارہ فروری ۲۰۰۵ء)

نور محمد یاسؔ

(رباعیات)

ڈاکٹر مختار شمیم کی نذر

معروف ہیں معتبر ہیں ذی منصب ہیں
خود مکتبۂ فکر ہیں خود مکتب ہیں
تحقیق کا موضوع بنایا جائے
مختار شمیم اس کے لئے انسب ہیں

☆

نظمیں لکھیں "دریچۂ گل"[1] کھولا
غزلیں جو کہیں تو "نامۂ گل"[1] مہکا
وہ جوہرِ فکر "حرف حرف آئینہ"[1]
یہ صورتِ فن کہ لفظ لفظ اِک چہرا

☆

تحقیق "ظہیر دہلوی"[1] پر کی ہے
تنقید "تناظر و تشخص"[1] بھی ہے
افسانے "پسِ غبار"[1] کیوں رہ جائیں
جاری ہے سفر، کام ابھی باقی ہے

☆

کیا بیٹا بیٹی ہیں صباؔ اور تبریزؔ
تقدیر کی خوبی ہیں صبا اور تبریز
مختار شمیم کا ہیں سرمایۂ زیست
کشورؔ[2] کی نشانی ہیں صبا اور تبریزؔ

---

[1] مختار شمیم کی تصانیف
[2] مختار شمیم کی مرحوم اہلیہ (اوّل)

عارف عزیز

ڈاکٹر مختار شمیم - شخصی سرخروئی کی مثال

کسی زمانہ میں حمیدیہ کالج میں تعلیم کے ساتھ معیاری انسان بنانے کا کام بھی انجام دیا جاتا تھا، افسوس کہ آج ملک کے تعلیمی اداروں نے اپنی یہ ذمہ داری ادا کرنا چھوڑ دیا ہے، وہ صرف ڈگریاں تقسیم کرر ہے ہیں، حمیدیہ کالج کا شعبۂ اردو تو کبھی ادیبوں، شاعروں اور قلم کاروں کی ٹکسال ہوا کرتا تھا جس نے نہ جانے کتنے رائج الوقت سکّوں کو ڈھالنے کا کام کیا، ان میں سے ایک ڈاکٹر مختار شمیم بھی ہیں جو اردو کے ادبی حلقوں میں شاعر، ادیب، ناقد، شعبۂ اردو کے استاد اور کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے اپنی کئی شناختیں رکھتے ہیں لیکن بحیثیت انسان اس سے زیادہ صفات اور خوبیوں کے مالک ہیں۔ مختار شمیم کی نوجوانی سے اب تک کم و بیش پچیس سال دیکھتے ہی دیکھتے میری نظروں کے سامنے سے گزر گئے، لیکن ان میں کہیں جھول کا شائبہ نظر نہیں آتا بلکہ بامقصد اور اس سے زیادہ مفید زندگی گزارنے کی تڑپ نے اُن کا رشتہ اس اخلاقیات سے جوڑے رکھا جو شخصیت کی سرخروئی کا باعث ہوتی ہے۔

شاعری اور ادب دونوں مختار شمیم کی گھٹی میں پڑے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے موضوعات و مسائل پر بھی گہری نظر ہے، مختلف تحریکوں اور رجحانوں کی معلومات سے ہمیشہ آراستہ رہتے ہیں، تاہم بات چیت میں علمیت کی نمائش تو دور اس کا اظہار تک نہیں ہونے دیتے، بلکہ اپنے مافی الضمیر کو سہلِ ممتنع کی دلاویز مثال کی طرح نہایت سلیقہ اور نپے تلے الفاظ میں ادا کردیتے ہیں۔ جہاں اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے وہاں اس سے بچتے نہیں، لیکن کسی کے دل کو ٹھیس پہنچانے والے لب و لہجہ سے پرہیز کرتے ہیں اور انکساری کا یہ عالم ہے کہ بقول خود اُن کے۔

سچ پوچھئے تو اہلِ نظر میں شمیم آپ
سادہ ورق ہیں علم و ہنر کی کتاب میں

ڈاکٹر مختار شمیم اپنے کارِ منصبی کے دوران اندور میں رہے ہوں، بڑواہ میں یا سیہور میں، ہر جگہ انہوں نے اپنی شخصیت کی دردمندی اور گہرے خلوص کے نقوش ثبت کئے ہیں۔ بظاہر کم سخن لیکن

باطن دنیا کی خبر رکھنے والے اور شعر و ادب کے نبض شناس ہیں، احباب کی مجلسوں یا ادبی محفلوں میں گفتگو کرتے ہیں تو اُن کی شوخی کا بھی اظہار ہو جاتا ہے۔ شعر و ادب اور تنقید و تحقیق کے لئے اُن کی خدمات پیہم جاری ہیں اور ان میں حشو و زوائد کے بجائے معیار و مقام کے وہ شروع سے قائل رہے ہیں۔ یہ معیار و مرتبہ آج ان کی شخصیت کا حصہ بن گیا ہے لیکن اس کے لئے ان کو کتنی جوانمردی کا مظاہرہ اور جدوجہد کے مراحل سر کرنا پڑے یہ ایک الگ داستان ہے، جن سے گزر کر وہ موجودہ مقام تک پہنچے، ان راہوں پر دوسروں کو چلتا دیکھتے ہیں تو مدد کے ساتھ حوصلہ افزائی ضرور کرتے ہیں۔

دینی، ملّی اور قومی امور میں مختار شمیم کی رائے گہری معنویت کی حامل ہوتی ہے، ان کے کتنے ہی اشعار ہیں جن میں اظہار کی پختگی، آہنگ کی صلابت، خودترحمی سے انکار اور لفظیات کا تنوع قدم قدم پر ملتا ہے، لیکن اُن کے زورِ قلم کا اس سے بھی زیادہ اندازہ تنقیدی مضامین سے ہوتا ہے جو گہرے مطالعہ، فکری تہہ داری، اعتدال و توازن اور نثری ندرت سے آراستہ ہیں۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں پہلے اس سے مکمل آگاہی حاصل کر لیتے ہیں، خاص طور پر تنقید میں وہ جس اسلوب کو اپناتے ہیں اس کا خمیر گہرے کلاسیکل رچاؤ کا نتیجہ ہے۔ اردو تنقید میں اس کی بنیاد شبلی نعمانی نے رکھی اور آل احمد سرور نے اسے پروان چڑھایا، اپنے مضامین میں انہوں نے بعض ایسے پہلوؤں کو اُبھارنے کی کوشش کی جو عام نہیں اور جسے اُن کی تنقیدی بصیرت نے ایک اعتبار بخش دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم ہو یا نثر دونوں میں صالح فکر اور جرأتِ گفتار کے سوتوں کو پھوٹتے ہوئے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

مختار شمیم نے میری چوتھی کتاب ''تلاش و تاثر'' پر کئی سال پہلے تبصرہ کیا تھا اور چھٹی کتاب ''حدِ نگاہ'' پر ابھی حال میں ''ایک سچ'' کے عنوان سے پیش لفظ تحریر کیا ہے۔ دونوں ان کی محبت اور تعلقِ خاطر کے آئینہ دار ہیں، ایسے مجسم اخلاق انسان، معیاری شاعر، افسانہ نگار اور اعلیٰ درجہ کے ناقد پر میرا کچھ لکھنا اس بڑھیا کی طرح ہے جو اپنی نوکری میں سوت لے کر آتی ہے اور یوسف کے خریداروں میں نام درج کرا جاتی، یہ چند سطور لکھ کر میں بھی مختار شمیم کے پرستاروں میں اپنا نام لکھوا رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی بے پایاں محبت میرے لئے کسی خوشگوار اثاثہ سے کم نہیں۔

☆☆☆☆

(سورج، چاند، ستارے صفحات ۶۴-۶۵، یکے از مطبوعات مدھیہ پردیش اردو اکادمی)

کوثر صدیقی بھوپال

ڈاکٹر مختار شمیم - ہمہ جہت قلمکار

سرونج ایک قدیم بستی ہے۔ اس کی تاریخ ہندوستان میں مسلم حکومتوں کے قیام سے بہت پہلے کی ہے۔ مغلیہ دور میں ملک میں جائے وقوع کی وجہ سے یہ ایک اہم شہر تھا۔ مغلیہ دور کے زوال پر نواب امیر خاں نے مرہٹوں سے فتح کر کے ٹونک سے پہلے سرونج کو ہی دارالخلافہ بنایا تھا۔ نواب مذکور کے مصاحبین اور فوجیوں میں صاحب ذوق لوگ کافی تعداد میں تھے اس لئے شعر و ادب کا ماحول بھی ٹونک سے پہلے سرونج میں ہی قائم ہوا۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو شعر و ادب کے ارتقاء میں ٹونک کا جو مشہور حصہ ہے اس کی جڑ میں سرونج ہے۔ دارالخلافہ ٹونک منتقل ہو جانے اور سرونج کی حیثیت ایک پرگنے کی رہ جانے کی وجہ سے مورخین ادب کی خاطر خواہ توجہ نہیں پا سکا۔

۲- سرونج کو علم و ادب کی نرسری کہنا غلط نہیں ہوگا۔ یہیں سے لے جائے گئے پودوں نے ملک کے مختلف مقامات پر (مع بھوپال) تناور درخت کی شکل اختیار کر کے علم و ادب کی جڑوں کو مضبوط کیا اور رہ نوردانِ شوق کو سایہ فراہم کیا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اسی سلسلے کے ایک پودے کا نام ہے ڈاکٹر مختار شمیم جس نے بھوپال کی زرخیز مٹی میں اپنی جڑیں جما کر یہاں کے گلشنِ علم و ادب میں ایک شجر سایہ دار کی شکل میں اپنی پہچان الگ بنائی ہے۔ آج کے مادہ پرستی کے دور میں جبکہ نئی نسل پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کر کے حصولِ جاہ و مراتب کی دوڑ میں لگی ہوئی ہے، یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ سرونج جیسے قصبہ نما شہر کی نئی پود میں بھی ایسے لوگ نکل رہے ہیں جو گیسوئے اردو کی مشاطگی کو ہی اب بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں لیکن یہ بھی غور طلب ہے کہ اس مشاطگی سے خوش ہو کر لیلٰیٔ اردو بھی ان پر مہربان ہے۔

۳- مختار شمیم سرونج سے جس خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں وہ علم کے چراغ سے روشن ہے۔ ان کے والد ایک تجربہ کار اور مخلص معلم تھے۔ والدہ بھی نیک اور دیندار خاتون تھیں۔ اردو سے ذوق و شغف رکھتی تھیں۔ بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے رموز سے آشنا تھیں جس کا اعتراف مختار شمیم نے اپنی تحقیقی کتاب ''ریاست ٹونک اور اردو شاعری'' کے انتساب میں کر کے اپنی سعادت مندی کا ثبوت دیا ہے۔ مختار شمیم کے ادبی ذوق کا خمیر گھر کے ایسے ماحول سے اٹھا

سرونج کے ادبی ماحول نے انہیں مزید ابھارا۔ سرونج سے ہائر سیکنڈری کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مختار شمیم نے بھوپال کی طرف 1961 میں رخ کیا۔ بھوپال آکر یہاں کی مشہور درسگاہ گورنمنٹ حمیدیہ کالج سے منسلک ہوئے جہاں اس وقت ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر ابو محمد سحر جیسے مقتدر اصحاب سے نہ صرف کالج بلکہ بھوپال کا اردو کے پورے عالم ادب میں نام روشن تھا۔ حصول علم کی لگن اور مذکورہ بالا اساتذہ کے فیضان نظر نے انہیں ''مختار احمد شمیم'' سے 'مختار شمیم' بنادیا۔ مختار احمد شمیم کو مختار شمیم بنانے میں ان کی اہلیہ ڈاکٹر کشور سلطان مرحومہ (کشور) کا رول بھی اہم ہے۔ وہ خود بھی دانشور اور صاحب قلم تھیں۔ جاں نثار اختر پر ان کی تحقیق پورے ملک میں آج بھی حوالہ جاتی کتاب ہے۔ وہ بھوپال کے ایک معزز تعلیم یافتہ اعلیٰ خاندان کی بیٹی تھیں اور راقم الحروف سے بھی بہت محبت کرتی تھیں۔ کشور مختار شمیم کی شریک حیات تو تھیں ہی، ایک ہی کالج میں ان کی ہم پیشہ اور ہم منصب بھی تھیں۔ گھر کے اور کالج کے کام کے ساتھ بچوں کی نگہداشت، تعلیم و تربیت کی وجہ سے انہیں ادب کی تخلیق کے لئے وقت نہیں ملتا تھا لیکن پوری توجہ اس پر رکھتی تھیں کہ مختار شمیم کے لکھنے پڑھنے میں کوئی خلل نہ ہو اور ان کا قلم متحرک اور شگفتہ رہے۔

-۴ ظرف جب اپنی Capacity سے زیادہ بھر جاتا ہے تو متوازن حالت میں وہ چاروں طرف چھلکتا ہے۔ مختار شمیم ابتداء سے کثیر المطالعہ ہیں۔ ادب کے تمام موضوعات بالخصوص تحقیق طلب امور کی کتابیں زیادہ شوق سے پڑھی ہیں اور پڑھتے رہتے ہیں۔ اردو کے شعری اور نثری ادب کی تمام اصناف کو پڑھ کر سمجھ کر ذہن میں ٹھونس لینے کی حد تک بھر لیا ہے۔ اس لئے مختلف موضوعات و اصناف ان کے ذہن سے چھلک کر کاغذ پر نگارشات کی شکل میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ نثر اور شاعری دونوں میں ان کا قلم ایسی مشاقی اور شگفتگی سے چلتا ہے کہ یہ طے نہیں ہو پاتا کہ بحیثیت شاعر ان کا قد اونچا ہے یا بحیثیت نثر نگار۔ شاعر کی حیثیت سے ان کے کلام کا جائزہ لیتے وقت پریشانی مزید بڑھ جاتی ہے۔ مختار شمیم غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظمیں بھی۔ نظموں میں آزاد بھی اور پابند بھی۔ کچھ ترائیلے اور دوہے بھی کہے ہیں۔ اسی طرح جب نثر نگاری کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو کبھی تاریخ کے میدان میں شہسواری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کبھی تحقیق کے میدان میں۔ کبھی نقاد بن کر تنقیدی میدان میں نبرد آزمائی میں مصروف نظر آتے ہیں۔ کبھی انسانی، سماجی اور دوسرے مسائل کو افسانوی رنگ میں پیش کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ ایسی صورت میں مختار شمیم

کی تخالیق وتصانیف کا احاطہ کرنا اور ادب میں ان کا مقام متعین کرنا بڑا دشوار کام ہے اور مجھ جیسے ہیچ مدان کے لئے تو ناممکن ہی ہے اس لئے زیر نظر مضمون میں تاثرات کے بطور کچھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تنقیدی جائزے کا کام تو نقاد حضرات کا ہے۔

۵- مختار شمیم نے دریچۂ گل کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ پندرہ سولہ برس کی عمر یعنی اسکولی تعلیم کے زمانے میں ہی شاعری کا چسکہ لگ گیا تھا۔ اسی زمانے میں جذبات واحساسات کے اظہار کے وسیلہ کے بطور افسانے بھی لکھے۔ گھر کے بزرگوں کے منع کرنے کے باوجود "چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی" کے مصداق شعر وادب کا نشہ اترنے کے بجائے اور چڑھتا گیا۔

۶- تخلیقات کا رسائل میں اشاعت کا سلسلہ تو لڑکپن ہی میں شروع ہو گیا تھا کتابی شکل میں اشاعتی سفر 1976 میں مدھیہ پردیش پاٹھیہ پستک نگم کے لئے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی گئی نصابی کتاب "مہاتما گاندھی" کے منظر عام پر آنے کے ساتھ شروع ہوا۔ تب سے اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

۱- مہاتما گاندھی (ترجمہ) برائے ٹیکسٹ بک کارپوریشن 1976

۲- ریاست ٹونک اور اردو شاعری 1977

۳- نامہ گلا (شاعری) 1978

۴- پسِ غبار (کہانیاں) 1980

۵- دریچۂ گل (نظمیں) 1982

۶- حرف حرف آئینہ (غزلیں) 198

۷- ظہیر دہلوی، حیات وفن (تحقیق) 1991

۸- تناظر وتشخص (مضامین) 2000

اس کے علاوہ بی اے کے نصاب کے لئے بھی کچھ کتابیں مرتب کی ہیں۔ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کو سامنے رکھتے ہوئے مختار شمیم کی تخالیق کو مندرجہ ذیل خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱- تاریخ (ادبی)

۲- تحقیق

۳- شاعری

۴- افسانہ نگاری

۵- ترجمہ

مندرجہ بالا نکات کی تفصیل حسب ذیل ہے

(۱) مختار شمیم بحیثیت ادبی مورخ

مختار شمیم کی پہلی باقاعدہ کتاب ''ریاست ٹونک اور اردو شاعری ہے۔ آزادی وطن سے قبل سرونج نوابی ریاست ٹونک کا ایک پرگنہ تھا اس رشتے سے بھی اور دہلی لکھنؤ کے بعد ہندوستان میں اردو کے جو دوسرے اہم مراکز ہیں ان میں ٹونک کا خصوصی مقام ہونے کی وجہ سے بھی مختار شمیم کی پہلی تحقیقی نگاہ ٹونک پر پڑی۔ یہ کتاب اگر چہ پی ایچ ڈی کے لئے لکھا گیا مقالہ نہیں ہے لیکن جس معیار کے تحقیقی مقالے آج کل کے طلباء لکھ رہے ہیں ان سے بدرجہا بہتر ہے اور فی الواقع اصل تحقیق(Original research) کے زمرے میں رکھے جانے کی مستحق ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں تاریخ اور تحقیق دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہیں اور چونکہ تحقیق کی بنیاد تاریخ پر رکھی ہے اس لئے دونوں نقطہ نظر سے یہ کتاب اہم ہے۔ اس میں ریاست کے قیام سے لے کر 1947 میں آزادی وطن تک کے تمام نوابین کا ذکر ہے۔ ان سے منسلک درباری شعراء اور ادباء کا بھی ذکر ہے۔ ٹونک کے اس دور کے تہذیبی اور علمی وادبی ماحول کا بیان بھی ہے جس میں مومن اور غالب کے ٹونک سے تعلق کی تفصیل بھی ہے۔ ٹونک میں شعر وادب کا آغاز، ارتقاء، شعرائے کرام کا اردو کی ترویج وترقی میں حصہ وغیرہ غرض کہ ہر پہلو پر غیر ضروری تفصیل سے احتراز کرتے ہوئے ذکر موجود ہے۔

بیرونی مشاہیر اور شعرا جو دربار ٹونک سے منسلک رہے ان میں مضطر خیر آبادی اور ظہیر دہلوی سر فہرست ہیں۔ ظہیر دہلوی کا ٹونک میں قریب سولہ سال قیام رہا۔ انہوں نے ٹونک میں رہ کر بھی اور یہاں سے لوٹ کر بھی اردو شاعری کو بہت نکھارا لیکن بعد میں مورخین اور محققین نے انہیں وہ مقام جس کے وہ بجاطور پر مستحق تھے، دینے میں بخل سے کام لیا۔ غالباً اسی خیال کے تحت مختار شمیم کو ظہیر دہلوی پر پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ لکھنے کا خیال آیا ہوگا۔ حالانکہ اگر وہ ''ریاست ٹونک اور اردو شاعری'' کو ہی پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقی مقالے کی شکل میں تبدیل کر دیتے تب بھی انہیں ڈاکٹریٹ مل جاتی۔ بہر کیف میری ناقص معلومات کے مطابق یہ کتاب ٹونک کی علمی، ادبی، تہذیبی تاریخ کے لحاظ سے کلیدی حیثیت رکھتی ہے اور بعد کے طلباء نے اس سے ضرور استفادہ کیا ہوگا۔ وسط ہند اور راجستھان کی اردو ادب کی تاریخ میں یہ کتاب ایسا مستقل مقام رکھتی ہے جس کی افادیت وقت گزرنے کے ساتھ ہمیشہ بڑھتی ہی رہے گی۔ یہ کتاب نسیم بک ڈپو، لکھنؤ سے شائع ہوئی ہیں۔

(۲) مختار شمیم بحیثیت محقق

سہل روی کے آج کل بڑھتے ہوئے رجحان کے تحت جہاں ایک طرف زندہ یا ہلکی پھلکی شخصیات پر مقالے لکھ کر ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے وہیں دوسری طرف پی ایچ ڈی. کے گائڈ اساتذہ حضرات بھی وقت طلب امور میں طلباء کی رہبری نہیں کر پاتے جس کے نتیجہ میں زیادہ مقالات ایسے تحریر کئے جا رہے ہیں جنہیں ادب میں نیا اضافہ کہنا تو دور کی بات ہے اسے فی الواقع تحقیقی مقالہ قرار دینے میں ہی پس و پیش محسوس ہوتا ہے۔ طرفین کی جانب سے مقالے کی تکمیل کی جلد بازی کے نتیجہ میں مقالے مکمل ہو کر بھی تشنۂ تکمیل رہ جاتے ہیں۔

مختار شمیم فطرتاً دقت پسند محقق ہیں اس لئے وہ تاریخ کے تاریک گوشوں میں نظر سے اوجھل نوادرات کو ڈھونڈ نکالنے کی صعوبت راہ سے پریشان ہوتے ہیں نہ دل برداشتہ بلکہ لطف محسوس کرتے ہیں۔ ظہیر دہلوی ذوق کے خاص شاگردوں میں تھے بہادر شاہ ظفر اور قلعہ معلیٰ تک ان کی رسائی تھی۔ 1858 میں مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد دہلی کے باکمال حضرات نے تلاشِ معاش میں جب وہاں سے ادھر اُدھر ہجرت کی اسی دور میں ظہیر دہلوی ٹونک آئے اور دہلی میں حالات نارمل ہونے کے بعد 16 برس تک ٹونک میں قیام کر کے واپس دہلی لوٹ گئے۔ ظہیر دہلوی اور مرزا داغ نہ صرف ہم عصر تھے بلکہ ایک ہی استاد ذوق کے شاگرد تھے۔ دونوں نے ایک ہی ماحول میں پرورش پائی تھی۔ ظہیر بھی ذوق کی طرح فطری شاعر تھے مگر ذوق اور غالب کی چشمک کے نتیجے میں جہاں غالب کے طرفداروں نے ذوق کو حاشیے مین ڈال دیا وہیں ذوق کے شاگردوں کو بھی۔ اس طرح ذوق کے ساتھ ظہیر کی شاعری بھی دب کر رہ گئی۔ اس کے علاوہ داغ دہلوی اور امیر مینائی کی شہرت اور مقبولیت نے بھی ظہیر کو پس پشت ڈال دیا اور ان کو اپنا اصل مقام حاصل نہیں ہو سکا۔ اسی کسک یا ناانصافی کے تحت مختار شمیم نے ظہیر دہلوی کی حیات وفن پر پڑی ہوئی وقت کی گرد کو صاف کر کے اردو شاعری میں ان کا اصل مرتبہ اور مقام متعین کرنے کی پہل کی ہے۔

کانِ ادب میں کان کنی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ چٹانوں کا سینہ چیر کر اور ریزہ ریزہ مٹی چھان کر گوہر تلاش کرنا پڑتے ہیں۔ اس کام کے لئے ذوق وشوق کے ساتھ محنت اور مہارت بھی ضروری ہے۔ کان کنی کے وقت ماہر نگراں ہونا بھی ضروری ہے۔ مختار شمیم میں ایک جوجھنے والے کان کنی کی تو تمام صفات تو ہیں ہی، ان کی خوبیٔ قسمت ہے کہ انہیں ڈاکٹر ابو محمد سحر جیسا ماہر اور لائق رہنما بھی مل گیا جن کی نگرانی میں مختار شمیم نے ظہیر دہلوی جیسے گوہر کو جو زمین میں دب گیا تھا نکال

کر صاف کیا، چمکایا اور اس کے ہم پلہ دوسرے گوہروں کے ساتھ رکھ کر قدر و قیمت کا تعین کیا۔

مختار شمیم کا یہ تحقیقی مقالہ جو قریب چار سو صفحات پر مشتمل ہے 1990 میں شائع ہوا ظہیر دہلوی پر ایک مکمل مبسوط دستاویز ہے۔ اس میں ان کے خاندانی حالات، پیدائش، تعلیم، پیدائش، مشاغل، اسفار، 1857 کا ہنگامہ، استادی شاگردی، غزل گوئی کے ساتھ دیگر اصناف شاعری پر طبع آزمائی، نمونہ کلام وغیرہ کا دستاویزی ذکر ہے۔ مختار شمیم تحقیق کے معاملے میں تخیل، امکانات اور اندازے یا قیاس آرائی سے کام نہیں لیتے۔ ان کا قلم اس وقت تک نہیں چلتا جب تک کہ اپنی دریافت کے ثبوت میں دستاویز حاصل نہیں کر لیتے' تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت' مختار شمیم کی یہ محتاط روش ہی ان کی تحقیق کو وقار بخشتی ہے۔

تحقیق و تاریخ کی گزشتہ صفحات میں مذکورہ دو کتابوں کے علاوہ مختار شمیم نے مختلف موضوعات اور شخصیات کے فن اور تخلیقی خدمات پر فرداً فرداً مضامین تحریر کیے ہیں جو ملک کے مختلف رسائل کی زینت بنتے رہے ہیں۔ یہ مضامین اگرچہ مختصر ہیں لیکن اہم ہیں۔ ان میں مختار شمیم نے جہاں تنقیدی نظریات سے کام لیا ہے وہیں بے لاگ مصلحتوں اور عام رواداری سے دامن بچاتے ہوئے جن بے باک خیالات کا اظہار کیا ہے وہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو تنقیدی اصولوں کا دیانت داری سے پابند ہو، مختار شمیم کے ان مضامین کا مجموعہ 2000 میں ''تناظر اور تشخص'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

(۳) مختار شمیم بحیثیت شاعر

مختار شمیم کی شاعری کا جائزہ لینے بیٹھے تو نظر ان کی شاعری پر بھی جاتی ہے اور یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ وہ شاعر بڑے ہیں یا محقق۔ ویسے یہ فیصلہ ابھی ممکن بھی نہیں ہے کیونکہ دونوں میدانوں میں ابھی ان کا تخلیقی سفر سرگرمی کے ساتھ جاری ہے اور منزل پر پہنچنے پر ان کے پاس کیا اثاثہ ہوگا اور قدر و قیمت کے لحاظ سے کیسا ہوگا اس کا اندازہ لگا پانا ممکن نہیں ہے۔

مختار شمیم کی شاعری کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں غزل گوئی اور دوسرے حصے میں نظم گوئی۔ ان دو حصوں کو درج ذیل مزید خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱-غزل گوئی

(۱) ابتداء سے 1978 میں نامہ گل میں شامل غزلوں تک

(۲) وسط مدت 1978 سے 1986 میں حرف حرف آئینہ کی

اشاعت تک مطبوعہ اور اس کے بعد 1997 تک غیر مطبوعہ

(۳)1997 سے تا حال غیر مطبوعہ کلام کی بنیاد پر

۲-نظم گوئی

(ا)ابتداء سے 1978 میں نامۂ گل میں شامل نظموں تک

(۲) 1978 سے 1984 میں دریچہ گل کی اشاعت تک مطبوعہ اور اس کے بعد 1984 سے 1997 تک غیر مطبوعہ

(۳)1997 سے تا حال

مندرجہ بالا ادوار کا مختصر جائزہ اس طرح ہے

۱-غزل گوئی (ا) ابتداء سے 1978 میں نامہ گل میں شامل غزلوں تک

مختار شمیم کا یہ پہلا مختصر شعری مجموعہ ہے جو 27 غزلوں اور 6 آزاد نظموں پر مشتمل ہے۔ نظموں کے بعد میں شائع مجموعے دریچہ گل میں مختار شمیم نے لکھا ہے کہ پندرہ سولہ برس کی عمر میں غزل گوئی کا چسکہ لگ گیا تھا۔گھر والوں نے شعر گوئی پر پابندی عائد کردی تو افسانہ نگاری کے میدان میں اشہبِ قلب دوڑانا شروع کردیا مگر یہ واضح نہیں ہے کہ گھر والوں کی پابندی لگ جانے کے بعد چوری چھپے یہ ذوق جاری رہا یا وقتی طور پر موقوف کر کے دوبارہ شروع کیا۔بہر کیف بیس بائیس برس کی عمر کے آس پاس پختگی کے ساتھ شعر گوئی کا آغاز مان لیا جائے تو نامہ گل میں قریب دس بارہ سال کا کلام ہونے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔میر کے مطابق غزل کہنا نہ آتا تھا تو سوسو شعر کہتے تھے،مختار شمیم نے بھی غالبؔاً ابتدائی دور میں سوسو شعر ہی کہے ہونگے لیکن نامہ گل تک پہنچتے پہنچتے انہیں شعر کہنا آ گیا اس لئے ایسا لگتا ہے کہ نامہ گل میں ابتدائی دور کا منتخب کلام ہی شامل کیا گیا ہے۔سبھی غزلیں اور نظمیں صاف ستھری،ظاہری عیوب سے پاک،اعلیٰ خیالات کی ترجمان اور مکمل مگر مختصر ہیں اور ایسا نہیں لگتا کہ" کاتا اور لے دوڑی" کے تحت اس مجموعے کی اشاعت عمل میں آئی ہو۔اس میں بھی مختار شمیم نے جو سوت کاتا ہے اس میں ان کی اس فن پر پکڑ اور انگلیوں کی مہارت واضح نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی نے نامۂ گل کے پیش لفظ میں مختار شمیم کی شاعرانہ عمر خاصی بتائی ہے جو صحیح نہیں ہے جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے اس مجموعے میں دس بارہ سال سے زیادہ کا کلام نہیں ہے۔مظفر حنفی کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ" اس نے جو کچھ کہا بڑی خود اعتمادی کے ساتھ خیال کو جذبے میں تحلیل کر کے اور لہو میں رچا کر کہا ہے۔

"اس کی غزل انفرادی تجربات کی آنچ سے گرم اور شدت احساس سے نرم ہو کر ہمیں ایک

ایسے ذائقے سے روشناس کراتی ہے جو اس عمر کے شاعروں میں کم یاب ہے۔"

نامہ گل مختار شیم کے شعری سفر کا نقطۂ آغاز ہے۔ یہ درمیانی پڑاؤ ہے نہ منزل۔ اس لئے اسے حتمی نظر سے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس مجموعے کی تھوڑی سی غزلوں میں چونکا دینے والے اشعار کی تعداد کی کثرت ہے مثلاً

ڈوب کے آئے تھے کالے سمندروں میں جسے
وہ آفتاب بلندی پہ جگمگاتا ہے

☆

ہم شہرِ تصور میں تنہا بھی نہیں رہتے
ہم شہرِ تصور میں رہتے ہیں مگر تنہا

☆

میں بھٹکتا رہا خوابوں کے سفیروں کی طرح
نگراں تھیں مری راہوں میں تمہاری آنکھیں

طوالت کے خوف سے اشعار کے حوالوں سے احتراز کرتے ہیں نامہ گل میں شامل غزلوں کے مطالعہ کے بعد یہی کہا جا سکتا ہے کہ مختار شیم کی ابتدائی دور کی غزلیں صرف قافیہ پیمائی کے لئے نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر تجربوں اور مشاہدوں کی بنیاد پر کہی گئی غزلیں ہیں۔

(۲) وسط مدت 1978 سے 1986 میں حرف حرف آئینہ کی اشاعت تک مطبوعہ اور اس کے بعد 1997 تک غیر مطبوعہ

(الف) حرف حرف آئینے تک مطبوعہ غزلیں۔ حرف حرف آئینہ بنیادی طور پر غزلوں کا مجموعہ ہے۔ نظمیں تین چار ہی ہیں لیکن وہ بھی غزل کی ہیئت میں۔ نامہ گل سے چل کر حرف حرف آئینہ تک کے سفر نے مختار شیم کو دشتِ غزل کا پختہ طبع سیاح بنا دیا ہے۔ نامہ گل کی غزلوں میں خیالات الفاظ کی آغوش میں بے قراری محسوس کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جبکہ حرف حرف آئینہ میں خیالات الفاظ کے ساتھ انکھیلیاں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہیں الفاظ خیالات کو پر پرواز عطا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حرف حرف آئینہ 8-7 برس کی مدت میں کہی گئی غزلوں پر مشتمل ہے۔ غزلوں کی کم تعداد یہ اشارہ کرتی ہے کہ مختار شیم کی شاعری خالص موڈ اور آمد کی شاعری ہے۔ غیب سے مضامین نوکِ قلم آنے پر ہی وہ غزل کہتے ہیں۔

مختار شمیم غزل کی اسی روایتی ڈگر کے شاعر ہیں جس پر غزل کا قافلہ چلتا چلا آرہا ہے وہ کہیں کہیں کچھ کھوج بین کے لئے نئے تجربے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر جلد ہی واپس مقررہ ڈگر پر ہی آجاتے ہیں اس کے باوجود ان کے قدم کی چاپ اور نقشِ پا بھی دوسروں سے کچھ الگ ہے ان کی غزل کا مزاج روایتی حسن و عشق کی چاشنی میں عصری مسائل کی آمیزش سے بنا ہے لیکن وہ محبوب کو بے پردہ نہیں کرتے نہ خود اس کے غم میں گریباں چاک کرتے ہیں۔ عصری مسائل اور ملک کی زبوں حالی پر بھی ترقی پسندوں کی طرح وہ نعرہ بازی کرتے ہوئے بھی نظر نہیں آتے۔ مختار شمیم جب غزل کہتے ہیں تو غزل کے فریم میں ہی تخیل اور تفکر کی تصویر کشی کرتے ہیں اس کے باہر ان کا موقلم نہیں چلتا۔

حرف حرف آئینہ کی غزلوں میں شوخی، تندی یا ظرافت قطعی نہیں ہے۔ شروع سے آخر تک ایک باوقار سنجیدگی ہے۔ ان کے اشعار قاری کے ذہن پر ایک ایسا آہنگ پیدا کرتے ہیں جو دیرپا ہوتا ہے۔ ان کے اشعار گھن گرج کے ساتھ برس برسا کر رخصت ہو جانے بادل نہیں بلکہ ایسے شبنمی قطرے ہیں جو رات کی بے خواب آنکھوں سے ٹپک کر خار و گل دل و جاں کی گہرائی تک تر بتر کر دیتے ہیں۔

مختار شمیم ڈاکٹر ابو محمد سحر کے طالب علم رہے ہیں۔ میرے علم کے مطابق مختار شمیم نے شاعری میں ان کے سامنے زانوئے تلمذ خم نہیں کیا اس کے باوجود ان کی غزلوں میں کہیں کہیں سحر صاحب کے آہنگ کی جھلک نظر آتی ہے۔ بہر کیف مختار شمیم نے شاعری میں مع نظم گوئی اپنا راستہ خود بنایا ہے وہ کسی کی تقلید کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔

برصغیر کے نامور اہل قلم حضرات نے مختار شمیم کی غزل گوئی پر اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے اظہارِ خیالات کئے ہیں چند چیدہ اقتباسات پیش ہیں:

ڈاکٹر کرامت علی کرامت: آپ کا ایک شعر دیکھ کر چونک پڑا

ایک لفظ کن امینِ عالمِ امکاں ہزار
ایک اک لمحے سے تو صدیوں کا اندازہ لگا

''آپ نے شاعرانہ کشف کے ذریعہ ان صداقتوں کا عرفان حاصل کر لیا ہے جو مابعد الطبیعی ہوتے ہوئے بھی سائنسی ہیں۔''

وقار واثقی: ''مختار شمیم کی غزلیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ زمانے کی بدلتی ہوئی قدروں پر ان کی گہری نظر ہے وہ نئے شاعر ہیں اور نئے شعراء سے قدم سے قدم ملا کر چل رہے ہیں لیکن ان کی رفتار متوازن ہے۔ روایت اور جدیدیت کا حسین امتزاج ان کے کلام میں ملتا ہے وہ انسانیت اور اپنے ماحول پر سوچنے کا منفرد انداز رکھتے ہیں۔''

کمال احمد صدیقی: ''مختار شیمم کو خدائے سخن میر تقی میر سے گہری عقیدت ہے اور یہ قدرتی بھی ہے کیونکہ وہ اپنے گردوپیش کی زندگی سے اپنے اصولوں کی وجہ سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ یہ تو نہیں کہ ان کی ناآسودگی میر کی ناآسودگی کا عکس ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کے مزاج اور ان کے لہجے میں میر اور درد کے اثرات ہیں اگرچہ عقیدت کا اظہار انہوں نے صرف میر سے کیا ہے۔

چھپے سے مگر دل کا ہر راز بتادے گا
وہ میر کے لہجے میں اک شعر سنادے گا
دماغ ہم بھی مگر انتخاب رکھتے ہیں
سرہانے میر کی ہر دم کتاب رکھتے ہیں

مختار شیمم کی نظر اردو ادب کے سرمائے پر گہری ہے وہ غزل میں لہجے، موضوع اور فکر کے تجربے کر رہے ہیں بعض تجربے کامیاب ہیں۔

جو دیکھئے تو یہ عالم تمام حیرت ہے
جو سوچئے تو ہر اک واہمہ حقیقت ہے

شاعری کا سمندر مشترک ہے اس کو کھنگال کر آبدار موتی لانا اور ان کو غزل میں پرونا انفرادی سعی ہے۔ شاعری اپنی انفرادیت سے پہچانی جاتی ہے جو اجتماعی زندگی کے سمندر کو متھنے سے ابھرتی ہے۔''

(ب) حرف حرف آئینہ کے بعد 1997 تک کی غیر مطبوعہ غزلیں

حرف حرف آئینہ کی 1986 میں اشاعت اور 1997 ان دس سالوں میں مختار شیمم کی چالیس پچاس غزلوں کا پتا چلتا ہے جن میں زیادہ تر ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہوچکی ہیں۔ مذکورہ مدت میں 93-1992 ایک ایسا سال ہے جس نے ملک کے تمام دردمند اہل قلم حضرات کے ذہن کے ساتھ قلم کو بھی متاثر کیا خصوصاً اردو شعر وادب میں یہ سال تخلیقات کے رجحان کو بدلنے کے لئے بہت اہم ہے۔ اکثر شعراء کی تخالیق میں 93-1992 سے پہلے اور اس کے بعد کی تخالیق میں کسی نہ کسی شکل میں جارحانہ فرقہ پرستی کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ہر شاعر نے اس دور کے فرقہ وارانہ فسادات اور ملک کی مکدر فضا کا ذکر اپنے اپنے انداز میں کیا ہے غزل گو شعراء بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں لیکن قاری کو حیرت ہوتی ہے کہ اس دور میں مختار شیمم کی کہی گئی غزلوں میں ان فسادات کی بازگشت نہیں ہے۔ مختار شیمم نے اپنی غزلوں کو سیاسی زہر کی آلودگی سے کس طرح محفوظ رکھا یہ تحقیق کا موضوع ہے۔ میر جیسے خدائے غزل کی غزلوں میں عصری کرب کی جھلک ملتی ہے۔ ایسی صورت میں مختار شیمم

حالات سے بیگانہ رہے ہوں یا ان کا دل بے حس رہا ہو ایسا ہرگز نہیں ہے۔ وہ حساس شاعر ہیں انہوں نے شاعر کی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے نظموں کے ذریعہ بابری مسجد کی شہادت اور فرقہ وارانہ فسادات پر اپنے غم وغصہ، دکھ درد اور جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ وہ غزل کی پاکیزگی کے قائل ہیں۔ غزل کو غزل ہی رکھنا چاہتے ہیں اور جو رنگ غزل انہوں نے اختیار کیا ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی انہیں گوارا نہیں ہے۔ غزل گوئی کی اپنی اسی روش پر سختی سے قائم رہنے کی وجہ سے ہی 1986 سے 1997 کے عہد میں کہی گئی غزلوں کا رنگ و آہنگ بھی وہی ہے جو حرف حرف آئینہ کی غزلوں کا ہے۔ تھوڑا فرق یہ نظر آتا ہے کہ وقت کے ساتھ کلام میں مزید پختگی آئی ہے۔ نئے نئے مشاہدات اور تجربات نے پرواز تخیل کو مزید بلندیاں عطا کی ہیں۔ الفاظ کو نئے معانی اور استعاراتی پیکر بنانے کی بھی کامیاب کوشش کی ہے مثلاً

وہ ہے سنگِ گراں یا بہتا پانی لکھ نہیں سکتا
مجھے خوابوں نے جو دی ہے نشانی لکھ نہیں سکتا
وہ پیلی دھوپ، پھیکی چاندنی یا زرد موسم ہو
کسی افسردہ دل کی میں کہانی لکھ نہیں سکتا
لہو کی روشنائی میں تڑپتے لفظ چیخیں تو....
میں اپنے عہد کی سچی کہانی لکھ نہیں سکتا

عصرِ حاضر میں بکھرتے ہوئے سماج میں رشتوں کو توڑتے بھی نہیں بنتا اور جوڑے رکھنا بھی ایک مسئلہ ہے۔

سبھی کو پتھراؤ کی ہے عادت سبھی کے گھر کانچ کے ہیں لیکن
شمیم رشتوں کی نازکی میں سوال یہ ہے کسے نباہیں

مختار شمیم کی غزل گوئی تفصیلی تجزیہ چاہتی ہے جس کا یہ مختصر مضمون متحمل نہیں ہوسکتا۔ مختصر یہ کہ ان کی غزل گوئی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو میر سے شروع ہو کر مومن، ذوق اور داغ سے ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے۔ ان کی غزل گوئی کا دوسرا وصف یہ ہے کہ وہ غزل کو اس کی روایتی شکل میں ہی رکھنا پسند کرتے ہیں۔ ترقی پسندوں یا جدید غزل گو شعرا کی طرح تجربوں کی دلدل میں پھنسا کر اس کی شکل بگاڑنا مختار شمیم کو گوارا نہیں ہے۔

(ج) 1997 سے تا حال، غیر مطبوعہ کلام (غزلوں) کی بنیاد پر

جیسا کہ پچھلے صفحات میں تحریر کیا ہے مختار شمیم کی غزلوں میں پروقار سنجیدگی ہے، غمِ ذات کو

وہ اس طرح عوامی (Generalise) کر دیتے ہیں کہ قاری اسے اپنے دل کی دھڑکن محسوس کرنے لگتا ہے۔ 1997 میں ان کی اہلیہ پروفیسر (ڈاکٹر) کشور سلطان (کشور) کے کینسر کے موذی مرض میں مبتلاء ہوکر چند مہینوں کی مختصر علالت کے بعد ہی داغ مفارقت دے جانے کے المیے سے مختار شمیم کے شب و روز دکھ درد کے گہرے سمندر میں ڈوب گئے۔ ان کے صبر و ضبط کا باندھ یکبارگی ٹوٹ گیا اور اس میں ڈوب کر نکلے تو ان کا لب ولہجہ بدلا ہوا تھا۔ ان کے ہونٹوں پر مجروح بلبل کی طرح نالے تھے۔ آواز میں درد اور سوز تھا جس نے انہیں عندلیب جگر پاریدہ کی طرح نواریز کردیا۔ مختار شمیم ''سرہانے میر کی ہردم کتاب رکھتے'' تھے، پڑھتے بھی تھے مگر غزل اپنے رنگ و آہنگ میں ہی کہتے تھے۔ کشور کے انتقال کے بعد مختار شمیم کی غزل کا رنگ و آہنگ تو وہی رہا لیکن کبھی آہ اور کبھی میر کے سوز و گداز کی بھی جھلک نظر آنے لگی۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں زیرِ لب کراہ کی صدا سنائی دینے لگی جسے سن کر سامع بھی اپنے دل میں ٹیس محسوس کرنے لگتا ہے مثلاً یہ غزل:

تمہیں جاناں بہت ہی یاد کرتے آئے ہیں ہم بھی
کہ ہر اک سانس جیتے اور مرتے آئے ہیں ہم بھی
نہیں معلوم پیچ و خم ہے کیا، سود و زیاں کیا ہے
مگر اک دل کا سودا دل سے کرتے آئے ہیں ہم بھی
عجب مجبوریاں ہیں سینہ چاکان تمنا کی
ترے کوچے سے اکثر آہیں بھرتے آئے ہیں ہم بھی
شمیم اک آفتابِ غم سے اپنی زندگی روشن
بہر لحظہ بہر صورت نکھرتے آئے ہیں ہم بھی

☆

حیرتِ آئینہ کس سوچ میں گم ہے آخر
کوئی صورت ہو وہ صورت نہیں ملنے والی
تیرا احساں ہے شبِ ہجر! تری عمر دراز
زندگی تا بہ قیامت نہیں ملنے والی

☆

میں اپنے آئینے کو توڑ دوں یہ بھی نہیں ممکن
کہ اس میں صرف میرا ہی نہیں تیرا بھی چہرا ہے

کسی کی یاد نے نشتر چبھوئے ؛ کسی کے آنسوؤں نے زخم دھوئے
میں گھر میں آؤں تو سناٹا چیخے ؛ میں گھر سے جاؤں تو تنہائی روئے
یہ کس نے توڑ دیا میرا آئینہ ربا
یہ کون ہے جو مری روح میں سسکتا ہے



آنسوؤں میں ایک کاغذ بھیگا بھیگا سا شمیم
چپکے چپکے رات کے پچھلے پہر سے دیکھنا

۲-نظم گوئی (ا) ابتداء سے 1978 میں نامہ گل میں شامل نظموں تک

مختار شمیم نے جیسا کہ دریچہ گل کے دیباچے میں لکھا ہے ان کی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی تھی لیکن نامہ گل میں شامل نظموں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ نظم گوئی اور خصوصاً آزاد نظم کی طرف بھی ابتدا سے ہی ان کا رجحان رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ابتداء میں ادھر زیادہ توجہ نہیں دی۔ نامہ گل میں اگرچہ صرف چھ مختصر آزاد نظمیں ہیں، پابند نظم ایک بھی نہیں ہے لیکن تعداد کی کمی کے باوجود ان میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو کسی نظم کو معیار بخشتی ہیں۔ ان میں تخیل کی بلندی ہے، آہنگ ہے، دلکشی بھی ہے اور تاثر بھی۔ آزاد نظم کی حیثیت سے ہر نظم اپنے آپ میں مکمل ہے۔ اس سلسلے میں نامہ گل میں شامل ڈاکٹر مظفر حنفی کے پیش لفظ کا اقتباس کا حوالہ ضروری ہے۔

"اس کی (مختار شمیم) جتنی نظمیں میری نگاہ سے گزریں ان کی بنا پر میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ اسے بنیادی طور پر غزل کا شاعر کہوں یا نظم کا۔ 'جنم دن' 'کاغذی ہے پیرہن' اور 'تنہائی' جیسی ایسی نظمیں ایسے نقوش ہیں جو شاعر کی اس جستجو کی نشان دہی کرتے ہیں جس کے سہارے تجربات کے سمندروں سے نئی دنیائیں ابھرتی ہیں۔"

یہ چھ نظمیں ہی آگے چل کر آزاد نظم گوئی کی حیثیت سے مختار شمیم کے لئے ادب میں اپنا مقام بنانے کا پیش خیمہ تھی جو بعد میں دریچہ گل کی اشاعت سے صحیح ثابت ہوا۔

(۲) 1978 سے 1984 میں دریچہ گل کی اشاعت تک مطبوعہ
اور 1984 سے 1997 تک غیر مطبوعہ نظمیں

شاعری میں غزل کے علاوہ جتنی اصناف ہیں وہ نظم کے زمرے میں آتی ہیں جسے ہم مرثیہ، قصیدہ، رباعی، مثنوی وغیرہ مختلف ناموں سے جانتے ہیں اور شناخت کرتے ہیں۔ ان نظموں کو

جنہیں ہم پابند نظم کہتے ہیں۔ ان کی ایک خاص ہیئت میں دیکھنے کی ہماری ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ اس سے ہٹ کر کوئی تخلیق ہمیں نظم نظر نہیں آتی۔ عام طور پر اوزان و بحور کے ایک آہنگ اور شکل میں ردیف قافیوں کے جھولے پر جھولتے ہوئے اشعار کو ہی شاعری سمجھنا اردو کے سامعین اور قارئین کی فطرت بن گئی ہے اس لئے انگریزی ادب کے زیر اثر جب آزاد نظم کی طرف اردو کے شعرا رجوع ہوئے تو قدامت پرست بہت سے غزل گو شعرا نے اسے اچھوت قرار دے کر محفل سے باہر کر دیا جس کے نتیجے میں غزل گو اور آزاد نظم گو شعراء میں عرصہ دراز تک تنازعہ قائم رہا اور آج بھی بہت سے غزل گو شعراء آزاد نظم کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ پابند نظم میں خارجیت زیادہ اور داخلیت کا عنصر کم ہوتا ہے۔ ایک مضمون کو سو سو طرح باندھ کر الفاظ کا جادو اور کرتب دکھا کر قاری یا سامع کو مسحور تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے پیچھے معنویت اور مقصدیت کی کمی ہوتی ہے۔ آزاد نظموں میں خارجیت کا عنصر نہیں کے برابر ہونے کی وجہ سے شاعر بنا کسی لمبی چوڑی تمہید کے نفسِ مضمون پر آ جاتا ہے اور چونکہ اس کے پاس ردیف قافیہ کا سہارا نہیں ہوتا اس لئے اسے اظہار خیال کے لئے موزوں الفاظ کا سہارا ہی لینا پڑتا ہے اس لئے آزاد نظم بہ اعتبار موضوع و بیان رسیلی ہونے کے باوجود پھیکی نظر آتی ہے۔

مختار شمیم بیک وقت غزل بھی کہتے ہیں اور آزاد نظم بھی۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں لکھا جا چکا ہے، وہ غزل کے اپنے مخصوص رنگ و آہنگ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ پسند نہیں کرتے اس لئے ایسے تمام حوادث و واقعات جنہیں عام غزل گو شعرا غزل کی اشاروں اور کنایوں کی زبان میں بیان کرتے ہیں، ان کے لئے وہ آزاد نظم کا انتخاب کرتے ہیں۔ مختار شمیم میانہ رو شاعر ہیں وہ غزل کے مشاق اور پختہ شاعر ہونے کے ساتھ آزاد نظم کہنے پر مکمل قدرت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حرف حرف آئینہ (جسے غزلوں کا مجموعہ ہی کہنا چاہئے) کے بعد اکثر آزاد نظمیں ہی کہی ہیں۔ دریچہ گل میں نظموں کی تعداد 34 ہے۔ ایک ترائیلہ، ایک نظم پس دیوار فنا، ایک گیت نما پابند نظم اور ساقی کو چھوڑ کر سب آزاد نظمیں ہیں۔

آزاد نظم کو سنجیدہ فکر کا کلام موزوں کہا گیا ہے جس سے اس کے بارے میں دو اشارے ملتے ہیں۔ پہلی چیز (جسے مزید خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے) سنجیدہ ہونا لازمی ہے۔ دوسری چیز پیشکش (Presentation)۔ آزادی بھی کچھ بندشوں کے تحت ہوتی ہے۔ بنا بندش کی آزادی لاقانونیت اور نراج کو جنم دیتی ہے۔ اس لئے اوزان و بحور کی بندش میں موزوں کلام جتنے اچھے انداز میں پیش کیا جائے گا اتنا ہی دلکش اور موثر ہوگا۔ آزاد نظم گوئی بہ ظاہر بہت آسان نظر آتی ہے لیکن

حقیقت غزل گوئی سے کم نہیں ہے۔

مختار شمیم کی تمام آزاد نظمیں مندرجہ بالا کسوٹی پر کھری اترتی ہیں جن کی تصدیق دریچہ گل کی نظموں پر ملک کے نامور اہل قلم حضرات کے تاثرات اور اظہار خیال سے ہوتی ہے۔ طوالتِ مضمون سے بچنے کے لئے صرف ابراہیم یوسف مرحوم کے خیالات کا اقتباس پیش ہے:

''دریچہ گل کی نظموں کو دیکھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ مختار شمیم احساسات اور جذبات کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کو عصری آگہی نے بنایا، سنوارا اور احساسات نے تند و تیز کیا ہے اس مجموعہ کی اضافی صفت نظموں کا اختصار ہے۔ مختار شمیم اتنا وقت کیسے نکال لیتے ہیں کہ مختصر نظموں میں خیالات کو قید کرسکیں۔ اس میں مشاقی کو اتنا دخل نہیں جتنا جگر کاوی کو ہے۔''

1984 میں دریچہ گل کی اشاعت سے 1997 تک کی مدت میں مختار شمیم نے غزلیں زیادہ کہی ہیں اور نظمیں نسبتاً کم۔ اس عہد میں بھی ان کے شہوار قلم کی شاہراہ وہی ہے جس پر چل کر انہوں نے دریچہ گل کی تخلیق کی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اس دوران انہیں اپنے سفر میں کہیں خون کے دریا ملے تو کہیں آگ کے۔ جس سے متاثر ہو کر انہوں نے چھ دسمبر، وشو ہندو پریشد، سالِ نو کی آمد پر جیسی نظمیں لکھ کر فرقہ پرستی کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ 1984 سے 1993 کا عہد فرقہ وارانہ تنافر کے لحاظ سے بدترین دور تھا۔ بابری مسجد کی شہادت جیسے واقعہ پر بھی اگر واضح طور پر ان کا قلم نہ اٹھتا تو بزدلی یا مصلحت کوشی کے تحت خاموش رہنے کا الزام ان پر لگ سکتا تھا۔

اس مدت میں کہی گئی نظموں میں مایوسی، ایک تاثر، سناٹا، گم شدہ گھر وغیرہ کامیاب نظمیں ہیں۔ ''یورشیں'' ایک تجرباتی نظم ہے جس میں مختار شمیم نے سال بھر کے خاص سانحات کے چار طغیانی خیز دریاؤں کو چار کوزوں میں بھرنے کی کوشش کی ہے۔

(۳) 1997 سے تا حال

1984 سے 1997 کی مدت کے مقابلے میں زیر نظر مدت میں تعداد اور معیار دونوں لحاظ سے مختار شمیم کی نظم گوئی بلند مقام پر نظر آتی ہے۔ کشور اگرچہ جسمانی طور پر ان سے جدا ہوگئی ہے لیکن اس کی روح کی پرچھائیں ہر وقت ساتھ رہتی ہے۔ ''یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آرہے وہ جا رہے ہیں'' جیسا منظر ہر دم ان کی نگاہوں میں رہتا ہے۔

مختار شمیم نے متعدد نظمیں اسی غمِ فراق میں کہی ہیں۔ ''کشور کے لئے ایک نظم'' کے چار مصرعے ملاحظہ فرمایئے۔

لوگ کہتے ہیں میری آنکھوں میں
خون کا منجمد ہے سناٹا
اور یہ سناٹا مجھ کو ڈستا ہے
اشکِ خوں بن کے زخم رستا ہے

☆

نظم ''ہجر'' کے آخری چار مصرعے

مگر اب دن یہ کیسے دن ہیں کشور
نہ جیسے اب خوشی و خوش دلی ہے
ہر اک لمحہ سسکتی زندگی ہے
کسی کی یاد ہے اور بے کسی ہے

☆

کشور سے منسوب چند نظموں کے علاوہ اس کے فراق کے کرب کی پرچھائیں مختار شمیم کی دوسری نظموں میں بھی نظر آتی ہے۔ اس پرچھائیں سے ان کی نظم کے رنگ و آہنگ میں 1997 کے بعد ایک ایسی نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے کہ وہ قاری جسے اس المیے کا کچھ پتا نہ ہو، وہ بھی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سوز و گداز شاعری کی جان ہے جو درد اور درد مند دل سے پیدا ہوتا ہے۔ درد کے لئے چوٹ ضروری ہے۔ درد کی اس پرچھائیں کو دوسری عام نظموں میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ نظم ''رنگ'' کا آخری بند

یہ چہرا ترا جیسے پاکیزہ کوئی صحیفہ کھلا
اور پھر مجھ پہ یہ منکشف بھی ہوا
اس صحیفے کا میں ایک حرفِ وفا
موجب و وجہِ تخلیق صرف ایک میں
تو مری زندگی میں ترا رنگ ہوں
تو مری روشنی، میں ترا انگ ہوں

ان پرچھائیوں کا اعتراف مختار شمیم نے نظم ''پرچھائیں'' میں خود کیا ہے۔

مرے خون میں
یہ چلتی پھرتی، اٹھتی بیٹھتی پرچھائیاں کیسی

میں ان پرچھائیوں کے جال سے کیسے نکل آؤں

یہ ممکن ہے؟

مرے خون میں کبھی کوئی کرن بے لوث چمکے، بے غرض ٹوٹے

تو شاید پھر اجالوں کے نئے امکاں سجاؤں گا

اجالوں سے مگر پرچھائیاں کیسے چھڑاؤں گا

ذات سے چل کر غمِ محبوب کے کوچے سے گزرتے ہوئے غمِ دوراں تک مختار شمیم کی نظموں کا پھیلاؤ ہونے کے ساتھ ظالم کے خلاف خنجر بدست اور مظلوم کے لئے مرہم بکف نظمیں بھی نظر آتی ہیں۔ جن میں ''امریکہ امریکہ'' اور ''عراق'' خاص ہیں۔

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے

مختار شمیم کا اشہبِ قلم نئے جہانوں اور نئی جہات کی تلاش میں محوِ تگ و تاز ہے اور امید کی جاسکتی ہے کہ وہ ان اقلیموں کو زیرِ نگیں کرے گا جس کے خواب ہر شاعر کی آنکھیں دیکھتی ہیں۔

(۴) مختار شمیم بحیثیت افسانہ نگار۔ پس غبار کے پس منظر میں

کہانی کہنا، گھڑنا اور سننا انسان کا سب سے پرانا شوق ہے جو آفرینشِ عالم سے آج تک جاری ہے۔ کاغذ قلم کے وجود میں آنے سے پہلے اس کا تعلق انسانی ذہن، لب و دہن اور سماعت تک محدود تھا۔ تہذیب اور علم و ادب کے ارتقاء کے نتیجے میں کہانی یا افسانہ ایک فن کی شکل میں ابھر کر وجود میں آیا۔

مختار شمیم نے اپنے بچپن میں نانی دادی سے کہانیاں ضرور سنی ہوں گی۔ اس دور میں یہ کہانیاں عموماً پریوں، دیوزادوں اور مافوق الفطرت شہزادوں وغیرہ کے حیرت انگیز کارناموں پر ہوتی تھیں جنہیں سن کو بچے سوچ میں پڑ جاتے تھے۔ یہی سوچ بچوں کو قوتِ متخیلہ بخشتی تھی۔ مختار شمیم نے اپنی نظموں کے مجموعے ''دریچہ نگل'' میں لکھا ہے

''اسکول کی پڑھائی کے دوران ہی میں نے افسانہ نگاری کو اپنے جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ رسائل میں جب یہ افسانے شائع ہوئے تو گویا میری ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔

یہ پتا نہیں کہ یہ افسانے کب اور کہاں شائع ہوئے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ ابتدائی اور مشق کے زمانے کے ہونے کی وجہ سے افسانوی مجموعے ''پس غبار'' میں شامل نہیں ہوئے ہونگے۔ پسِ غبار میں غالب اُ منتخب افسانے ہی شامل ہیں۔

ابراہیم یوسف مرحوم نے اس مجموعے کے پیش لفظ میں ایک جگہ لکھا ہے۔

''واردات ایک ہی ہو سکتی ہے لیکن اس کے بیان کرنے کا ڈھنگ الگ ہو سکتا ہے اور جو ڈھنگ پڑھنے سننے والے کو اپنی جانب سب سے زیادہ متوجہ کرے وہی ڈھنگ سب سے زیادہ کامیاب ہے۔ مختار شمیم کا واردات بیان کرنے کا ڈھنگ دلکش اور موثر ہے جو افسانوں کی کامیابی کا راز ہے۔''

ابراہیم یوسف نے آگے چل کر اس طرح بھی اظہار خیال کیا ہے

''مختار شمیم نے ان چند کہانیوں میں ہمیں جدید اور روایتی دونوں انداز لی کہانیاں سنائی ہیں۔ اگر ''نانی ماں'' ''وہی کارواں وہی مرحلے'' اور ''پسِ غبار'' وغیرہ مختار شمیم ہمیں کہانیاں سناتے ہیں تو ''پہچان'' اور ''کتنی بلندی کتنی پستی'' میں کہانی سے اس طرح بھی انحراف کرتے ہیں کہ کہانی کو مرنے نہیں دیتے۔ یہی وہ چیز ہے جو جدید ہوتے ہوئے بھی اپنی کہانی کو ان حدود میں داخل نہیں ہونے دیتے جیسی آج کل جدید کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ مختار شمیم نے خواہ کہانی سنائی ہو یا اپنی پہچان کے تانے بانے بنے ہوں، ان کا انداز جدید ہے۔''

پسِ غبار کی اشاعت کے بعد مختار شمیم کا قلم تحقیق، تنقید اور شاعری کے میدان میں تو اپنے جوہر دکھاتا رہا اور اب بھی دکھا رہا ہے لیکن وہ کون سے عوامل تھے جن کے سبب انہوں نے افسانہ نگاری سے ترکِ تعلق کر لیا، تحقیق طلب ہے۔ حالانکہ اس کے بعد دو چار کہانیاں لکھی جو شائع بھی ہوئیں مگر وہ نہیں کے برابر ہے۔

(۵) مختار شمیم بحیثیت مترجم۔ 'مہاتما گاندھی' کے پس منظر میں

ترقی کی تیز رفتاری کے اس دور میں علوم کی ترقی کے ساتھ زبانوں کے پھیلاؤ کا دائرہ بھی وسیع ہو رہا ہے۔ یہ پھیلاؤ اسی لئے ممکن ہو رہا ہے کہ دنیا کے لوگ ایک دوسرے کی زبانوں کو پڑھ رہے ہیں سمجھ رہے ہیں۔ دوسروں کی زبانوں کو سیکھ کر ان کے علوم وفنون سے بہرہ ور ہونے کا راستہ طویل اور دشوار ہے اس لئے آسان راستہ ہے ترجمے کا۔ ہم ترجموں کے ذریعہ دنیا کی کسی زبان کے بھی ادب اور علوم سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

ترجمہ کا یہ کام آسان نہیں ہے اس کے لئے مترجم کو دونوں زبانوں کی پوری واقفیت ہونے کے ساتھ ان کا مزاج داں ہونا بھی ضروری ہے تا کہ ترجمہ ترجمہ نہ رہ کر تخلیق نظر آئے۔ مختار شمیم اگرچہ مترجم کی حیثیت سے معروف نہیں ہیں لیکن انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے پر انہیں مکمل دسترس

باقی صفحہ ۳۹ پر.....

محمد ایوب واقف
منگل آشیش، بی ۴۳، سیکٹر ۱۲، کوپرکھیرانے، نئی ممبئی-400709

ڈاکٹر مختار شمیم کا تنقیدی و تحقیقی شعور

گذشتہ سال جولائی کے مہینے میں بھوپال جانے کا اتفاق ہوا، یہاں ''اقبال سمان'' نامی قومی ایوارڈ کی جیوری کی میٹنگ تھی، میں چونکہ اس جیوری کا رکن نامزد کیا گیا تھا اس لئے اس کی میٹنگ میں شرکت کی غرض سے میرا وہاں جانا ہوا تھا۔ جس روز جیوری کی میٹنگ تھی اسی روز شام میں اقبال مرکز کے ہال میں منعقد کئے جانے والے ایک جلسے میں بھی ہمیں مدعو کیا گیا تھا۔ یہ جلسہ ماہر اقبالیات جناب جگن ناتھ آزاد کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ اس جلسے میں بھوپال کے بیشتر اہل قلم موجود تھے، یہاں اور لوگوں کے ساتھ مختار شمیم صاحب بھی موجود تھے۔ بھوپال کے مشہور و معروف ادیب و شاعر اور سہ ماہی ''کاروانِ ادب'' کے لائق و فائق مدیر جناب کوثر صدیقی صاحب کے دولت کدے پر دعوت کھانے ہم مختار شمیم کی کار میں ہی گئے۔ کوثر صدیقی سے تو ممبئی میں ملاقاتیں ہو چکی تھیں لیکن مختار شمیم صاحب سے پہلی بار ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اقبال مرکز سے گنوری روڈ پر واقع کوثر صدیقی صاحب کے مکان تک پہنچنے میں جو مختصر موقع اور وقت مجھے حاصل ہوا اس کا میں نے فائدہ اٹھایا اور مختار شمیم کے سراپے پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں۔ متوسط قد و قامت کے حامل گول مٹول چہرے والے اور صاف ستھری رنگت کے مختار شمیم مجھے آج تک یاد ہیں اور اس وقت جبکہ میں ان کی شخصیت اور فن پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے بیٹھا ہوں وہ یادیں تازہ ہو گئی ہیں۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ وہ اس مختصر ملاقات میں پوری طرح کھل نہیں سکے تھے۔ وہ کار چلا رہے تھے، میں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھا تھا، ممکن ہے کھل نہ پانے کی یہی وجہ رہی ہو۔

ڈاکٹر مختار شمیم متنوع اور گوناگوں (Multifarious) خوبیوں کے فنکار ہیں، بنیادی طور پر تو وہ شاعر ہیں، لیکن تحقیقی و تنقیدی شعور بھی کافی منجھا ہوا ہے۔ ان کی تحقیقی کتاب ''ظہیر دہلوی- حیات و فن'' اور تنقیدی امور پر مبنی کتاب ''تناظر اور تشخص'' اس کا بین ثبوت ہیں۔ مختار شمیم صاحب نے کہانی نویسی کے میدان میں بھی اپنی ہنرمندیوں کو ظاہر کیا ہے، ان کی کہانیوں کا مجموعہ ''پسِ غبار'' شائع ہو چکا ہے، وہ کالج کے پرنسپل ہیں، اس اعتبار سے ان کی ذمہ داریاں بے پناہ ہیں لیکن مسرت کا مقام ہے کہ

لکھنے پڑھنے کا کام انھوں نے تواتر سے کیا ہے۔ایک بات یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر کشور سلطان ان کی رفیقہ حیات تھیں، ان کے بارے میں لوگوں کا عام خیال یہ ہے کہ وہ بڑی خوبیوں کی خاتون تھیں، گھریلو ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ نبھانے میں وہ ماہر تو تھیں ہی اس کے ساتھ ساتھ وہ مختار شمیم صاحب کو زیادہ سے زیادہ موقع اور خوشگوار ماحول فراہم کرتی تھیں تاکہ وہ اپنے قلم کی جولانیوں کو بغیر کسی رکاوٹ کے منظرِ عام پر لاسکیں، شاید یہ کشور سلطان کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہو کہ مختار شمیم صاحب ''ظہیر دہلوی - حیات اور فن''، ''ریاست ٹونک اور اردو شاعری''، ''حرف حرف تیشہ''، ''نامۂ گل''، ''پسِ غبار'' اور تناظر اور تشخص'' وغیرہ کو دنیائے ادب میں پیش کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ بات بہت مشہور ہے کہ ہر کامیاب انسان کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے، لہٰذا یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ مختار شمیم صاحب کی کامیابیاں بھی کسی حد تک ان کی شریکِ حیات کشور سلطان کی مرہونِ منت ہیں۔

ہم نے ابھی ابھی یہ عرض کیا ہے کہ مختار شمیم صاحب ادب کے کسی ایک پہلو کے اسیر نہیں ہیں، وہ محقق ہیں، تنقید نگار ہیں، شاعر ہیں اور فنِ افسانہ نگاری کی جوت بھی جگائے ہوئے ہیں لیکن ادھر جب میں نے ان کی کچھ غزلیں اور نظمیں پڑھیں تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ بنیادی طور پر وہ شاعر ہیں، اُن کی شاعری میں تخلیقیت کے عناصر بطریقِ احسن موجود ہیں، مثلاً ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

جلتی دھوپ میں سبز سمندر رکھتے ہیں
ان آنکھوں سے کیسے منظر رکھتے ہیں

☆

میں اپنے آئینے کو توڑ دوں یہ بھی نہیں ممکن
کہ اس میں صرف میرا ہی نہیں تیرا بھی چہرہ ہے
کسے پڑی ہے جو دریا کے پار اترے گا
تہوں میں ڈوب بھی جاؤں تو کون دیکھے گا

☆

کتنی پرچھائیاں ہیں، ہیولے کئی، یورشِ وقت ہے اجنبی رات ہے
سوچتا ہوں مگر صبحِ میزان میں زندگی تیرے انعام بھی کم نہیں

☆

یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں نے مختار شمیم صاحب کی زیادہ تحریریں نہیں پڑھیں، ادھر جب

سہ ماہی 'انتساب' کے ایڈیٹر جناب سیفی سرونجی نے ان کا گوشہ نکالنے کا ارادہ کیا اور مجھ سے فرمائش کی کہ میں ان کے بارے میں کچھ لکھوں تو پھر مختار شمیم صاحب کی تحریروں کی تلاش شروع ہوئی، میں سیفی سرونجی صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مختار شمیم صاحب کی کتاب'' تناظر اور تشخص'' بھیج دی۔ اس سے کام آسان ہو گیا، کیونکہ یہ کتاب مختار شمیم صاحب کے تنقیدی شعور کی آئینہ دار ہے۔'' تناظر اور تشخص'' میں کل اٹھارہ مضامین شامل ہیں، جن مختلف عنوانات پر یہ اٹھارہ مضامین قلمبند کیے گئے ہیں ان کے عنوانات اسطرح ہیں: (۱) مطالعہ اقبال کی ایک جہت، (۲) ذوق ایک مطالعہ، (۳) قصہ ممتاز، (۴) ڈاکٹر سیدہ جعفر کی تنقید نگاری، (۵) شعر سچ بولتا ہے، (۶) ابراہیم یوسف بہ حیثیت ناقد و محقق، (۷) ناطق مالوی کی شاعری کی ذہنی و فکری اساس، (۸) اردو قصیدہ کی شناخت کا مسئلہ، (۹) اردو افسانہ منزل بہ منزل، (۱۰) اردو غزل پر ایک مختصر نوٹ، (۱۱) نظمانے اور ردِ کفر کے بہانے، (۱۲) ہمارا مشترکہ کلچر اور اردو شاعری، (۱۳) ہمارا ادب اور قدروں کا مسئلہ، (۱۴) مدھیہ پردیش میں جدیدیت کے اثرات، (۱۵) فضل تابش-شخص اور شاعر، (۱۶) ذکرِ احتشام، (۱۷) مدھیہ پردیش کے دانش کدوں اور درس گاہوں میں اردو تحقیق، (۱۸) ثانوی درجات میں اردو کا نصاب اور تعلیم۔

مختار شمیم صاحب کے مندرجہ بالا اٹھارہ مضامین کل ۱۲۸ ؟صفحات تک محدود ہیں۔ اس کا صاف اور صریح مطلب یہ ہوا کہ طوالت کے بجائے اجمال اور اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ یہ چیز کبھی تو خوبی کا روپ دھارتی ہے اور کبھی عیب بن جاتی ہے۔ اگر مصنف اپنی بات کو کم سے کم الفاظ میں بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور اپنے نقطۂ نظر کو اس طرح واضح کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ اس کے قلم کا بہت بڑا وصف ہے، یہ چیز اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مصنف کو اپنے افکار و خیالات کی ادائیگی پر پوری قدرت حاصل ہے۔ جب میں نے'' تناظر اور تشخص'' کا جستہ جستہ اور بالاستیعاب مطالعہ شروع کیا تو یہ بات مجھے خاص طور پر محسوس ہوئی کہ جناب مختار شمیم نے آج کے مصروف قاری کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے خیالات کو اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے اور پھر قاری کو یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ مصنف نے اپنی بات کو اس کے سامنے رکھنے میں کہیں کوتاہی سے کام لیا ہے یا پھر بخل کیا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یقیناً'' تناظر و تشخص'' ایک کامیاب کتاب ہے اور اس میں شامل تحریروں کو بہت واضح مترشح انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

مذکورہ کتاب کے دیباچے میں مختار شمیم صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

'' تناظر و تشخص'' میں شامل مضامین کے ذریعے میں نے ادب کے مختلف گوشوں اور جہتوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، ادب کے سنجیدہ مطالعہ کا ایک

تقاضہ یہ بھی ہے کہ کسی ازم، تحریک یا رجحان سے متاثر ہوئے بغیر تخلیقی احساس کو اولیت دی جانی چاہیے۔ چنانچہ میرے بعض مضامین کا غالب عنصر یہی تخلیقی احساس ہے، میں اس میں کس حد تک کامیاب ہوں یہ فیصلہ تو اہلِ نظر ہی کر سکتے ہیں۔"

مندرجہ بالا اقتباس کو پڑھنے سے جناب مختار شمیم کے ذہن وفکر کی سنجیدگی کا پتہ چلتا ہے، اکثر اوقات یہ بات دیکھی اور محسوس کی گئی ہے کہ ادب کی دنیا کے وہ لوگ جنھیں ناقدینِ ادب کی صف میں شامل ہونے کا فخر وافتخار حاصل ہے معاصر ادب کی چھان پھٹک اور پرکھ میں بربنائے مصلحت یا تو بے جا مخالفت یا غیر ضروری طرفداری کا رجحان پیدا کر لیتے ہیں۔ ہمارے خیال سے ایسے تعصب (Prejudice) سے شعر وادب کی افہام وتفہیم میں خلل پڑتا ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں پس وپیش نہیں ہو رہا ہے کہ مختار شمیم کی بیشتر تحریریں ان نقائص اور عیوب سے پاک وصاف ہیں۔ چونکہ مختار شمیم صاحب راست اندازِ بیان کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنی تحریروں میں نامناسب عناصر کو شامل نہیں ہونے دیتے اس لیے ان کی تحریریں بیش بہا اور گرانقدر (Sumptuous) قدروں کی حامل ہیں، چنانچہ ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اپنے دیباچے میں انھوں نے اپنے تنقیدی رویوں کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ پورا کا پورا سچ ہے اور کسی طرح کا کوئی لغو نہیں۔

ایک نقاد کے لئے جہاں اس بات کی سخت ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنے قلم کو مذموم اور مجرمانہ (Blameful) طور طریق سے علاحدہ رکھے وہیں اس سے یہ بھی امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنے نوکِ قلم پر ایسے الفاظ، محاورے، ترکیبیں اور استعارے لائے جن سے تحریر میں پیچیدگی اور الجھاؤ (Complicacy) کے بجائے سادگی، دلکشی اور توانائی پیدا ہو، اس معاملے میں بھی مختار شمیم صاحب کامیاب وکامران نظر آتے ہیں۔ میں چاہوں گا کہ "تناظر وتشخص" سے دو مختلف اقتباسات ملاحظہ فرمالئے جائیں تاکہ میرے خیالات کی توثیق ہو سکے، تو لیجئے اقتباسات حاضر ہیں:

"تحقیق اور تنقید یوں بھی ایک دوسرے کی ضرورت ہیں، تنقید کو زندگی کی تہذیب اور فن کی آبرو کہا جائے تو غلط نہ ہوگا، تنقید کے جلو میں ہزارہا جلوہ سامانیاں موجود ہیں جو ادب اور فن کو نکھارنے اور سنوارنے کے لئے آئینے کا کام دیتی ہیں اور اس کا اعتبار بھی بنتی ہیں، تنقید سے آگہی نہ صرف زندگی کا مزاج داں بنا دیتی ہے بلکہ ادب کو بھی نئے شعور کی روشنی بخشتی ہے اور عرفان وادراک کے نئے گوشوں کو ذہن میں منور کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اچھا ناقد

ادب اور زندگی میں پائدار اور مستحکم قدروں کی بحالی کے لئے کوشاں رہتا ہے، کائنات میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے تناظر میں زندگی اور ادب پر ان کے اثرات اور اس کے نتیجہ میں اس کے ردّ و قبول کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔''

(ڈاکٹر سیدہ جعفر کی تنقید نگاری)۔

اب دوسرا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اس میں شک نہیں کہ ہر زمانے کا ادب اپنے دور کے تقاضوں کے پیش نظر تخلیق پاتا ہے اور شاید اسی لئے زندگی سے ادب کا رشتہ وسیع تر مفہوم رکھتا ہے، چونکہ انیسویں صدی کا ادب اپنے طبقے اور اپنے دور کا نمائندہ ہے اس لئے اسے تفریح طبع کا ذریعہ کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ اس میں اپنی قدروں کی حفاظت کا احساس اور ادراک موجود ہے۔''

(ہمارا ادب اور قدروں کا مسئلہ)

مختار شمیم صاحب کی تنقیدی کتاب ''تناظر و تشخص'' اگر چہ ان کے تنقیدی شعور کی نمائندہ کتاب ہے لیکن اس ضمن میں ان کی دوسری دو کتابوں کے نام بھی لئے جا سکتے ہیں اور وہ کتابیں ہیں، ''ظہیر دہلوی - حیات اور فن'' اور ریاست ٹونک اور اردو شاعری۔'' یہ دونوں کتابیں بنیادی طور پر تحقیقی رموز و نکات کی حامل ہیں۔ ان کتابوں میں تحقیق کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔ لیکن تحقیقی نتائج کے حصول میں تنقیدی نظریات کا طمطراق (Grandiuse) بھی آئینہ دکھاتا نظر آتا ہے۔ مختار شمیم صاحب نے اب تک تحقیق و تنقید کی جتنی کتابیں تصنیف کی ہیں ان کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن ابھی انھیں بہت کچھ لکھنا ہے۔ اگر انھوں نے لکھنے پڑھنے کا کام مستقل مزاجی سے کیا تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے نتائج خوشگوار ہوں گے۔ کیونکہ ان کے فکر و خیال کی بنیاد مضبوط ہے، زبان و بیان پر انھیں دسترس حاصل ہے اور پھر یہ کہ تنقید و تحقیق کے لئے جس طرح کا شعور چاہیے وہ شعور اپنی تمامتر خوبیوں کے ساتھ ان کے یہاں موجود ہے۔

☆☆☆☆

آئینہ

ڈاکٹر کشور سلطان (مرحومہ) کی ادھوری تحریر

''شمیم صاحب کے بارے میں کچھ کہوں تو ایسا لگتا ہے کہ یا تو ان کی بے جا تعریف کرنے لگوں گی یا پھر بے جا شکایتیں لے بیٹھوں گی .....ان کی شخصیت میرے لئے کئی حیثیتوں سے محبوب ہے۔

جب ان سے میری پہلی پہلی ملاقات ہوئی تھی تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک اچھے شاعر، ایک سنجیدہ مصنف اور ایک سچے اور ایماندار انسان بھی ہوں گے۔ جس طرح عام طور پر شریف خاندانوں میں شادیاں طے ہوا کرتی ہیں، ہماری بھی شادی ہوئی۔ تو بعد میں ان کی خوبیوں کا اندازہ ہوتا گیا۔ ان کے مزاج کی سادگی اور شگفتگی نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا۔ اس کا اندازہ تو سبھی کو ہوگا کہ شمی صاحب کو غرور چھو کر بھی نہیں گیا۔ ان کی شاعری کے مجموعہ بھی شائع ہوئے، ان کی ڈزرٹیشن ''ریاست ٹونک اور اردو شاعری'' شائع ہوئی، پھر افسانوں کا مجموعہ ''پس غبار'' چھپا اور اب یہ کتاب ''ظہیر دہلوی'' شائع ہوئی ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ اپنی جگہ رہے۔ غرور پیدا نہیں ہوا ورنہ لوگ کتابوں کی سیڑھیوں سے چڑھ کر بلند ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو چھوٹا سمجھنے لگتے ہیں۔

(اندور کے ہوٹل شری مایا کے ادبی جلسہ کے موقع پر کچھ حروف)

☆☆☆☆

خطبہ صدارت

جناب اختر سعید خاں

"مختار شمیم - ایک تاثر" کی تقریب رونمائی کے موقع پر

محترم خواتین و حضرات

ہماری ادبی دنیا میں یہ تو کثرت سے نظر آتا ہے کہ طلباء نے اپنے اساتذہ پر مضامین اور کتابیں لکھی ہوں۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے کہ اساتذہ نے اپنے شاگردوں کی شخصیت و فن پر مضامین در کتابیں لکھی ہوں۔ یہ شفقت محترم جناب محمد توفیق خانصاحب کا حصہ ہے اور یہ سعادت برادر عزیز مختار شمیم کو حاصل ہوئی ہیں جس کے لئے میں پہلے محمد توفیق خانصاحب کا شکر یہ ادا کرتا ہوں اور پھر مختار شمیم کو گلے لگا کر مبارکباد دیتا ہوں مجھے اس اظہار میں تامل نہیں کہ اگر یہ روش عام ہو جائے تو کتنے ہی نام جو گمنامی کے اندھیرے میں پڑے ہوئے ہیں اردو ادب میں ستاروں کی طرح جگمگانے لگیں گے۔

مختار شمیم اردو ادب میں جانی پہچانی شخصیت ہیں لیکن ہر جانی پہچانی شخصیت کی ادبی خدمات سے پوری طرح واقفیت اس وقت ہوتی ہے جب اس کی تخلیقات کا مکمل جائزہ ہمارے سامنے ہو۔ میرے نزدیک اور مجھے یقین ہے کہ آپ کے نزدیک بھی ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ وہ غزل، نظم، افسانہ، تحقیق اور تنقید سب کو اپنے ذہن و قلم کے دائرے میں لئے ہوئے ہیں اور ان کے تمام موضوعات کو محمد توفیق خانصاحب نے جو مختار شمیم کی ابتدائی تعلیم کے مدرس رہے ہیں ان کو اپنی مرتبہ کتاب مختار شمیم - ایک تاثر میں جس کا آج اجراء ہو رہا ہے بحیثیت شخص و شاعر، بحیثیت غزل گو، بحیثیت نظم نگار، بحیثیت افسانہ نگار، بحیثیت محقق اور ناقد تلاش کیا ہے جس سے مختار شمیم کے ادبی مقام کا تعین کیا جا سکتا ہے یہ تلاش محض حسنِ سلوک نہیں، حقیقت پسندی ہے جس کے بغیر کسی صاحب قلم کو پرکھا نہیں جا سکتا۔ شمیم کے افسانے اور تحقیق و تنقید پر گفتگو کا نہ یہ موقع ہے نہ اتنا وقت ہے کہ کچھ کہا جا سکے۔ اس لئے میں صرف ان کی شاعری کے بارے میں اختصار لیکن وثوق کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ عہد حاضر کے نمائندہ شاعر ہیں۔ انہوں نے کم کہا ہے لیکن جو کچھ کہا ہے وہ وزن اور وقار کے ساتھ کہا ہے۔ ان کا پیرایہ اظہار قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہے شمیم کے بیشتر اشعار ایک دردمند دل سے اٹھتے ہیں اور چوٹ کھاتے ہوئے دلوں کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ ہر چند کہ جدید شاعری کے علم بردار کہتے ہیں کہ حسن و عشق، ہجر و وصال، شوق و انتظار کی شاعری سے نئی نسل کنارہ کر چکی

ہے۔ اگر اس دعوے کو تسلیم کرلیا جائے تو غزل کا دامن خالی نظر آئے گا۔ شمیم کی غزل دامن خالی کی پاسبان نہیں ہے۔ وہ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ غزل کا محور دل ہے جو اسے عظمت سے آشنا کرتا ہے وہ اس سچائی کو بھی ذہن نشین کئے ہوئے ہیں کہ اردو زبان کی مقبولیت کا راز بھی غزل ہے۔ شمیم اگر جدیدیت کے ہم نوا ہوتے تو یہ شعر کہہ سکتے تھے!

شب ہجراں چراغ جاں کی لو مدھم نہیں کرتے
بہت ہم ٹوٹ کر روتے ہیں آنکھیں نم نہیں کرتے

☆

جدا ہوا ہوں میں خود سے کہ خود کو پا نہ سکا
ترے وصال کو اب تک مگر بھلا نہ سکا

شمیم اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں کہ شاعر کا معاملہ محض واقعات اور حقائق سے نہیں ہوتا بلکہ ان سے پیدا ہونے والی کیفیات سے ہوتا ہے۔ شمیم کی غزل روزمرہ کے واقعات کی ترجمان نہیں ہے حالات سے پیدا ہونے والی کیفیت ہے۔

اس موقع پر ہماری شعری زندگی کے بارے میں چند باتیں کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ ایک زمانہ تھا جب میں غزل کی حمایت میں اسے اردو زبان کی آبرو کہا کرتا تھا اب اسے اردو زبان کی ضرورت سمجھتا ہوں۔

جو حضرات یہاں تشریف فرما ہیں وہ مجھ سے زیادہ اس بات کو جانتے ہیں کہ پچھلے چند سالوں میں غزل کے سوا دیگر اصناف سخن کا دور دور نشان نہیں ملتا۔ مثنوی کا نام مٹ گیا۔ قصیدہ حکمرانوں کے ساتھ گیا، مرثیہ کا مدار سال میں دس دن کے لئے ان بزرگوں کے کلام پر ہے جو ایک صدی پہلے رخصت ہو چکے ہیں رباعی جوش و فراق کے ساتھ گئی۔ پابند نظم کے بجائے نثری نظم رواج پا رہی ہے، لے دے کے ایک غزل رہ گئی ہے جسے اردو شاعری کا سرمایہ کہا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے غزل کو بھی اس کی آراستگی اور حسن سے محروم کر کے ایسے موضوعات کے حوالے کر دیا گیا ہے جو بنیادی طور پر نظم کا حصہ ہیں۔ کیا ہماری سماجی زندگی میں کوئی ایسی تبدیلی آگئی ہے کہ زندگی کی سب سے خوبصورت حقیقت جسے محبت کہتے ہیں دنیا سے اٹھ گئی ہو۔

جہاں تک مجھے علم ہے ہماری زندگی کا وہ سرچشمہ جسے عشق کہتے ہیں غزل کی آبیاری کر رہا ہے اور آرزو و جستجو کے تمام مسائل اپنی لہروں میں لئے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی میر، غالب، حسرت، فانی، اصغر، جگر، فیض، مجروح اور ان گنت شعراء کے اشعار ہر موقع و محل پر ہماری

زبان پر آجاتے ہیں۔ وہ لوگ جو اردو نہیں جانتے وہ بھی اردو کے شعر پڑھتے ہیں، گھر ہو یا پارلیمنٹ، تقریر ہو کہ تحریر، ہر جگہ غزل کا شعر دہرایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس کلاسیکی غزل سے کنارہ کش جدت طراز دوستوں کے شعر نہ دل میں جگہ بناتے ہیں نہ ہماری خوش دلی اور درماندگی کے مواقع پر ہمارا ساتھ دیتے ہیں۔ ناقدین ادب کے مدرسے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ بیشتر مدرسے یورپ کے کارخانوں میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ ناقدین ادب کا مطالعہ ہے کہ شعر ان کے مکتب فکر کے مطابق ہو۔ فطرت کی کارفرمائی یہ ہے کہ جذبہ یا خیال دل میں پیدا ہو اور ذہن کے دائرے میں تشکیل پا کر شعر زبان پر آئے۔ اب اگر شعر موجودہ ناقدین ادب کے احکام کے مطابق نہ ہو تو کیا اس کے لئے ادب کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہمیں فیصلہ کرنا چاہئے کہ شعر کو ہماری زندگی کا ترجمان ہونا چاہئے نہ کہ جدیدیت یا مابعد جدیدیت کے افکار کا۔ اگر یہ فیصلہ نہیں لیا گیا تو اردو شاعری کی آخری صنف یعنی غزل بھی ختم ہو جائے گی اور آنے والی نسل میں کوئی میر، کوئی غالب، کوئی حسرت، کوئی فراق، کوئی جگر، کوئی فیض غزل میں پیدا نہ ہوگا۔ پڑھنے اور سننے والوں کی دلچسپی آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی اور اردو شاعری کا آخری ورق بھی الٹ جائے گا۔

غنیمت ہے کہ ابھی ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں۔

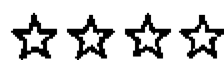
۱۰/اکتوبر 2004

شکریہ



....بقیہ صفحہ ۳۰

حاصل ہے۔ مدھیہ پردیش پاٹھیہ پستک نگم نے دسویں جماعت کے لئے ''مہاتما گاندھی'' کے عنوان سے ایک نصابی کتاب تیار کرائی تھی جسے ونے دوبے نے انگریزی میں لکھا ہے۔ مختار شمیم نے اس کتاب کا انگریزی سے اردو میں اتنا اچھا رواں دواں اور سہل ترجمہ کیا ہے کہ اصل تخلیق معلوم ہوتا ہے۔ یہ کام انہوں نے 1976 میں کیا تھا جب سے آج تک اس کی افادیت برقرار ہے اور یہ نصاب میں جاری ہے۔ مختار شمیم نے اس کے بعد اور کوئی ترجمہ نہیں کیا لیکن انہیں چاہئے کہ اپنی صلاحیت بروئے کار لاتے ہوئے انگریزی ادب کے ایسے شہپارے جو اردو ادب کے لئے اضافہ اور اہمیت کے حامل ہوں، ان کے ترجمے کی طرف دھیان دیں۔ یہ سعادت بھی سب کے حصے میں نہیں آتی۔



'مختار شمیم ایک تاثر' از محمد توفیق خاں

مضامین، رائیں اور تبصرے

(الف)

شمس الرحمن فاروقی

برادرم جناب توفیق خاں صاحب

سلام علیکم۔ نوازش نامہ 25 ستمبر ملا شکریہ۔ آپ نے تو اپنا تعارف یوں لکھا ہے گویا میں آپ سے واقف نہیں ہوں۔ لیجئے آپ کی فرمائش پوری کرتا ہوں کہ اپنے ہاتھ سے خط لکھ رہا ہوں۔ اب آپ اسے پڑھ نہ سکیں تو مجھے الزام نہ دیجئے گا۔ مختار شمیم صاحب کے بارے میں کتاب ملی شکریہ۔ ان سے میں واقف تھا آپ کی کتاب نے میری اطلاع میں اضافہ کیا۔

☆

گوپی چند نارنگ

مکرمی محمد توفیق خاں صاحب،

سلام و دعا

آپ کی کتاب 'مختار شمیم - ایک تاثر' موصول ہوئی۔ کتاب نہایت عمدہ ہے۔ یہ آپ نے ایک اور اچھا کام کر دیا۔ میں مختار شمیم صاحب کی ادبی لگن کا قائل ہوں۔ وہ مختلف میدانوں میں کام کر رہے ہیں، کیا ہی اچھا ہو کہ وہ اپنے کام میں ارتکاز پیدا کریں۔ میری دعا کہیے۔

☆

عبدالقوی دسنوی

محترمی محمد توفیق خانصاحب

السلام علیکم

آپ کی مفید تصنیف ''مختار شمیم - ایک تاثر'' ملی، پہلی ہی نظر میں کتاب اس قدر پرکشش نظر آئی کہ مطالعہ کی اسی وقت خواہش پیدا ہوگئی، ورق گردانی کی تو محسوس ہوا کہ جس قدر ظاہری خوبیوں سے آپ کی یہ کتاب آراستہ ہے اس سے زیادہ آپ کی سادہ لیکن رواں تحریر، دعوت مطالعہ دیتی ہے۔

بلاشبہ آپ نے نہایت سلیقہ کے ساتھ مختار شمیم کی شخصیت اور علمی ادبی خدمات کا تعارف کرایا ہے۔ آپ اپنے نیک مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں۔

مختار شمیم صاحب نہایت خاموشی کے ساتھ فرائض منصبی کے ساتھ علم و ادب کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ اس طرح انہوں نے جہاں اردو زبان کی خدمت کی ہے اپنے وطن سرونج کی بھی خدمت کی ہے اور اس کا نام بلند کیا ہے۔ اور آپ نے بھی اس کتاب کو پیش کر کے اپنے ادب نواز وطن سرونج کی حدمت کی ہے اور اردو زبان و ادب کے فروغ میں حصہ لیا ہے۔

آج اس بات کی بے حد ضرورت ہے کہ اپنے اپنے علاقہ کے خدمت گزاروں کو روشنی میں لایا جائے تاکہ دوسرے بھی اس اہم کام کی طرف متوجہ ہوں۔

میری طرف سے اس مفید کام کے لئے دلی مبارکباد قبول فرمائیں دلی دعا ہے کہ آپ صحتمند رہیں اور اردو زبان کی ترقی میں مسلسل حصہ لیتے رہیں۔ سیفی سرونجی سے متعلق آپ کی کتاب کا انتظار ہے۔



ڈاکٹر مظفر حنفی

محترم توفیق صاحب،

سلام مسنون

کتاب کی شکل میں آپ کا ارسال کردہ تحفہ ملا۔ اس عنایت کے لئے بہت بہت شکریہ۔ آپ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ مختار شمیم اور اپنے وطن کے دیگر لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لئے وقت نکالتے ہیں اور اس عمر میں لکھنے کا آغاز کیا ہے جب لوگ قلم رکھ دیتے ہیں بیشک مختار شمیم ایسی قدر شناسی کے مستحق تھے۔ آپ سے بھوپال میں پہلی بار ذرا سی دیر کی ملاقات سے طبیعت سیر نہیں ہوئی، انشاء اللہ جلد پھر ملیں گے۔ خدا کرے آپ مع احباب و متعلقین بعافیت ہوں۔



اقبال مجید

عاشق زبان و ادب محمد توفیق خاں صاحب کی تحریر کردہ کتاب مختار شمیم ایک تاثر پیش نظر ہے، جو برادرم مختار شمیم کی حیات اور فنی کارناموں پر مشتمل ہے جس کی ایک ایک سطر سے موصوف سے اُن کی محبت اور عقیدت نمایاں ہے، اس تحریر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ سرونج کی مختصر مگر جامع ادبی تاریخ کو بھی مجتمع کرنے کی کامیاب کوشش گئی ہے۔ مختار شمیم صاحب کی ادبی خدمات کم سے کم مدھیہ

پردیش میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں، میری نظر میں اس جائزے کی اہمیت اس بات میں ہے کہ ایک بزرگ نے سرزمین سرونج کے ایک ہونہار محقق، ادیب اور شاعر کی خدمات کا اعتراف کرنے اور اس کی حوصلہ افزائی کرنے میں پہل کی اور یہی ایک بڑی بات ہے، میں انہیں ادب کے ایک حقیر طالب علم کی حیثیت سے اس تحریک کے لئے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔



ڈاکٹر حامدی کاشمیری

عزیزی محمد توفیق خاں!

آپ نے بہت خلوص سے مجھے یاد کیا ہے، اس کے لئے شکر گزار ہوں، آپ کا گرانقدر تحفہ ''مختار شیم - ایک تاثر'' نظر نواز ہوا۔ آپ نے مخلصانہ اور محققانہ انداز سے مختار شیم کی ادبی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے، مبارکباد!

مبارکباد کے حقدار ڈاکٹر سیفی سرونجی بھی ہیں جنہوں نے وسیع القلبی سے کام لے کر اور مختار شیم کے تئیں جذبہ احترام کا اظہار کر کے آپ کو یہ کتاب لکھنے کی تحریک دی ہے ان کو اور مختار شیم صاحب دونوں کو میرا آداب کہئے۔ شکریہ



عبدالهادی

مکرمی محمد توفیق خاں صاحب سلام مسنون

''مختار شیم - ایک تاثر'' کے دونوں نسخے مل گئے۔ شکریہ۔ سلیم انصاری تین چار دن میں ادھر کا پھیرا لگاتے ہیں، شاید آج شام آئیں ان کی کتاب انہیں دیدی جائیگی۔

کتاب آپ نے جی لگا کر لکھی ہے اس پیرانہ سالی میں یہ فعالیت اور جوش و خروش قابل رشک ہے۔ حیران ہوں کہ اتنے کم وقت میں موصوف کے خاندانی حالات اور ادبی فتوحات کا اتنا اچھا جائزہ آپ نے پیش کر دیا۔ اور پھر اتنی نفاست اور عمدگی کے ساتھ۔ شیم صاحب اس کے مستحق بھی تھے۔ سیفی نے اچھا کیا کہ ان سے اجازت و جازت کے تکلف میں نہ پڑے وہ یقیناً منع کر دیتے۔ خود نمائی اور خود اشتہاری کی اس بھیڑ یا دھسان سے وہ کوسوں دور ہیں اور اپنے استاد مرحوم ابو محمد سحر کے سچے جانشیں ہیں۔ یہ قلندرانہ بے نیازی انہیں کچھ اور بھی محبوب بنا دیتی ہے۔ آپ نے ان کے تخلیقی رویے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کے یہاں احتیاط پسندی کا سراغ لگایا ہے، جو درست ہے۔ شعر و ادب کے علاوہ زندگی کے اور معاملات میں بھی ان کی احتیاط پسندی نمایاں ہے۔ لیکن میں ان

کی اس خوبی کا نہیں، ان کی محبتوں کا قتیل ہوں، یہی محبت ان کے تئیں آپ حضرات کے سینوں میں بھی موجزن دیکھتا ہوں، جس کا ثبوت یہ خوبصورت کتاب ہے۔



ارشد عبدالحمید

گرامی قدر جناب توفیق صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

آپ کی گراں قدر تصنیف ''مختار شمیم-ایک تاثر'' مجھے اکتوبر کے اواخر میں موصول ہو گئی تھی لیکن ان دنوں میں بیٹے کی پتھری کے باعث پریشان تھا، بالآخر ۴/نومبر کو جے پور جا کر آپریشن کرانا پڑا۔ وہاں پندرہ دن قیام رہا۔ اللہ کے فضل سے اب طبیعت کافی بہتر ہے لیکن اس اثنا میں میں یہ بھول گیا کہ میں نے آپ کو کتاب کی رسید بھی بھیجی ہے یا نہیں۔ اگر بھیج دی ہے تو اس خط کو شکر مکرر سمجھیں اور نہیں بھیجی ہے تو میں تاخیر کے لئے بہت بہت معذرت خواہ ہوں۔ امید ہے آپ خیال نہیں فرمائیں گے اور معاف کر دیں گے۔

مختار شمیم صاحب اور ان کی تحریروں سے میری واقفیت بہت پرانی ہے۔ ان دنوں سے جب انہوں نے ''ریاست ٹونک اور اردو شاعری'' تصنیف کی تھی۔ آپ نے یہ کتاب لکھ کر حقدار کا حق ادا کیا ہے۔ آپ کی یہ تصنیف پڑھنے اور اس سے استفادہ کرنے کا مجھے اب موقع ملا ہے۔ میں اسے پورا پڑھ لینے کے بعد انشاء اللہ حسب توفیق تبصرہ لکھوں گا۔ سرِ دست آپ کتاب کی صوری اور معنوی خوبصورتی کی مبارکباد قبول فرمائیے۔ محنت سے کتاب لکھنا، اسے کثیر رقم لگا کر شائع کرنا اور پھر ہم ایسے طلبہ تک وہ کتاب پہنچانا.... یہ سب آپ کی اردو دوستی اور ادب نوازی کی دلیل ہے اللہ جزا دے۔

ایک بار پھر شکریہ



محمود شیخ

محترم محمد توفیق خانصاحب

السلام علیکم۔

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہو گا

مختار شمیم کے فن اور شخصیت ۔ ۔پ ۔۔ تاثراتی مضامین پسند آئے۔ اسلوب و بیان نہایت

جامع اور دل پذیر ہے اس دور ناشناس میں آپ ایسے مشفق و مہربان دوستوں کا خلوص غنیمت ہے۔
مختار شمیم کی نظم اور نثر پر آپ نے عمدہ محاکمہ قائم کیا ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ برمحل تذکرہ ہی سہی سیفی سرونجی کی شخصیت کے بعض خفتہ پہلو بھی سامنے آ گئے ہیں شمیم صاحب سے صرف ایک بار میری ملاقات انجمن ترقی اردو لائبریری جبلپور کے اجلاس میں ہوئی تھی جس کے نقوش آج بھی ذہن و دل پر تازہ ہیں۔ اس کے بعد خط و کتابت ہی رہی۔ ذاتی طور پر میں ان کے حسن اخلاق اور علمی قابلیت کا معترف ہوں۔ نظم ہو یا غزل، افسانہ ہو یا تنقیدی اور تحقیقی مضامین شمیم صاحب جس موضوع کو ہاتھ لگاتے ہیں اس میں ایک انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے۔

سرونج کی ادبی فضا کو ہموار کرنے میں جن حضرات نے تعاون فرمایا ان میں آج آپ کا نام بھی نہایت عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ خالد محمود، مختار شمیم اور سیفی سرونجی کی تخلیقات نے سرونج کے ادبی وقار میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ سہ ماہی جریدہ 'انتساب' کے ذریعہ ثابت کر دیا کہ سنگ لاخ زمینوں میں بھی پھول کھلائے جا سکتے ہیں۔ مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ "مختار شمیم-ایک تاثر" کے بعد آپ "سیفی سرونجی" کے فن اور شخصیت پر بھی کتاب ترتیب دے رہے ہیں۔ امید ہے آپ کی یہ کاوش بھی حسب سابق ادبی حلقوں میں شرف قبولیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگی۔ اپنے احباب اور رفقاء کو میرا سلام کہئے۔ استاد محترم پروفیسر عبدالباقی صاحب اور ڈاکٹر اشفاق عارف سے سرونج کی بہت تعریف سنی ہے۔ اگر کبھی موقع ملا تو ضرور حاضر ہوں گا۔



محمود زکی

بشرف نظر محترم محمد توفیق خاں صاحب محلہ تلیا، سرونج

جناب عالی   السلام علیکم

جناب والا کی تازہ ترین تصنیف "مختار شمیم-ایک تاثر" کے مطالعہ کی سعادت نصیب ہوئی جی خوش ہو گیا۔ تذکرہ ایک ساتھی کا اور پھر بیان آپ جیسے معلم، مفکر، دانشور، ادیب کا لطف دے گیا دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

کتاب کی تزئین و ترتیب بھی متاثر کن ہے۔ سرورق پر مختار شمیم صاحب کی تصویر ان کے دل کی اداسی کے عکس کے ساتھ دمکتی ہوئی نورانی ذہانت کی بھی واضح ترجمان ہے۔ اور اسی طرح آخری صفحے، متانت و سنجیدگی سے معمور مفکرانہ انداز والے تیور کا بھرپور اظہار کرتی چشمے سے جھانکتی نظریں بھی کچھ کم اثر انداز نہیں ہیں یقیناً قاری ان دونوں تصویروں سے بھی خوشگواری کا احساس

کریگا۔ آپ نے سب کچھ تو نہیں بہت کچھ مختار شمیم اوران کے فن پر روشنی ڈال دی ہے۔
مجھے یاد نہیں آتا ہے کہ میں آپ سے سرونج میں ہوئے اردو اکیڈمی کے دو روزہ اجلاس کے موقع پر نیاز حاصل کرسکا تھا یا نہیں سیفی سرونجی صاحب سے کانفرنس کے علاوہ بھی پرلطف ملاقات رہی تھی فضل تابش مرحوم، عزیز اندوری صاحب اور مختار شمیم صاحب اکیڈمی کے سکریٹری محترم آفاق احمد صاحب کے ہمراہ اس پروگرام میں آیا تھا۔ میں اس وقت اکیڈمی کا ممبر بھی تھا۔ بہر حال تحریر اور انداز تحریر آپ کا لائق تحسین ہے ایک بار اور مبارکباد قبول فرمائیں۔
ادب دوست احباب کو سلام عرض ہے۔ والسلام

☆

صغیر شاد

مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ جناب کی تصنیف کردہ کتاب ''مختار شمیم ایک تاثر'' موصول ہوئی مختار شمیم کے متعلق میرے استاد محترم جناب شاداں سرونجی سے بہت پہلے سے سنتا رہا ہوں اور برادرم سیفی سرونجی کے عالمی ادب کے سہ ماہی انتساب میں بہت پڑھا ہے۔
اب ''مختار شمیم۔ایک تاثر'' میرے ہاتھوں میں ہے جو کہ مختار شمیم کی حقیقی زندگی کی عکاسی ہے آپ نے کتابوں کو ابواب میں ترتیب دیکر قاری کے لئے آسانی پیدا کردی ہے آپ کا ادبی دنیا میں یہ لازوال شاہکار ہے اور آپ اس تصنیف ''مختار شمیم ایک تاثر'' کی تصنیف کے لئے مبارکباد قبول فرمائیں۔
انتساب پبلی کیشنز سرونج مدھیہ پردیش تعارف کا محتاج نہیں ہے اس کا پابندی سے ڈاکٹر سیفی سرونجی کی ادارت میں شائع ہونے والا سہ ماہی انتساب عالمی ادب میں اگر سرونج کی پہچان ہے تو برادرم ڈاکٹر سیفی سرونجی اور سہ ماہی انتساب سے ہے آپ کی تصنیف کردہ کتابیں بھجوانے کی مہربانی فرمائیں تاکہ ہم استفادہ حاصل کرسکیں یوں تو غائبانہ برادرم سیفی صاحب نے آپ کا تذکرہ بارہا کیا ہے اب ملاقات کا اشتیاق ہے جلد ہی انشاء اللہ ملاقات ہوگی۔ باقی خیریت ہے۔
دعائے خیر کا طالب ☆

مضطر نشاطی

جناب محترم حضرت محمد توفیق صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

جناب کی ترتیب کردہ کتاب مختار شمیم۔ایک تاثر پڑھنے کا شرف حاصل ہوا پڑھ کر مزید

معلومات میں اضافہ ہوا۔ کتابت میں دو ایک جگہ ضرور گڑبڑ ہوئی ورنہ کتاب کی صحت ہر طرح سے قوی ہے۔ مثلاً قابل کی جگہ کابل۔ پہلو کی جگہ پہلے فقط یہی کتابت کی گڑبڑ رہی مگر پڑھنے والے اسے مضمون کے انداز سے صحیح استعمال کریں گے تمام کتاب کے مطالعہ کے بعد یہ محسوس ہوا یقین اس کے ساتھ کہ جناب مختار شمیم صاحب پر آپ سے اچھے تاثرات کسی اور اہل قلم حضرات سے ادا نہیں ہوتے گو آپ کے پاس مختار شمیم کے تعلق سے لٹریچر زیادہ نہ ہو تو کیا ہوا آپ کے پاس مختار شمیم صاحب سے متعلق مشاہدہ تو ہے۔

آپ نے مختار شمیم صاحب کو بچپن سے دیکھا پڑھا سنا اور سوچا ہے یہ کچھ کم نہیں شمیم صاحب پر لکھنے کیلئے میں جناب محترم سیفی صاحب کے فہم کی داد پیش کرتا ہوں کہ جنہوں نے اس کتاب کے لئے آپ جیسی عظیم ہستی کا انتخاب کیا۔ غزل ہو کہانی ہو یا نظم و نثر تمام تخلیقات میں جگہ بیتی سے زیادہ آپ بیتی دکھائی دیتی ہے۔

کہاں شام اودھ صبح بنارس مالوے کی شب
تمہارے بعد جاناں زندگی کی چاہتیں گم ہیں

☆

اور تو کیا تھا ہمیں بھی اختیار
چپکے چپکے رات دن رویا کئے

☆

شب ہجراں کی عطا مانگتا ہوں
تیری یادوں کی ردا مانگتا ہوں

☆

ہم اپنے آپ سے یارو بچھڑ گئے کب کے
جو کھو گیا ہے ہمیں میں اسی کی چاہت ہے

☆

اس طرح کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اپنے کرب کا اظہار کس قدر معصوم انداز سے ادا کرتے ہیں۔ شمیم صاحب کے بارے میں بالکل سچ کہا گیا ہے کہ بہت ہی سوچ سمجھ کر الفاظ کا استعمال فرماتے ہیں۔ جناب شاداں سرونجی صغیر شاد آصف صدیقی واحد صدیقی علی حسن بھائی رئیس قمر صاحب اور تمام اہل ذوق حضرات کی جانب سے سلام و مبارکباد قبول فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی

ذہنی وجسمانی تمام قوتوں کو محفوظ فرمائیں۔



سہیل نسیم

محترمی سیفی صاحب

السلام علیکم

امید ہے بخیریت ہوں گے

ملری محمد توفیق صاحب کے "چسکۂ تصنیف و تالیف" کے سلسلے کی ایک کڑی "مختار شیم۔ ایک تاثر" کی شکل میں سامنے آئی ہے۔ جس میں شیم صاحب کی شاعری اور شخصیت کے ساتھ ان کے تحقیقی، تخلیقی و تعمیری کاموں کا مفصل جائزہ لیتے ہوئے ان کو بھرپور طریقے سے متعارف کرانے کی جناب توفیق صاحب کی یہ کوشش و محنت واقعی قابل تحسین ہے۔

کاش توفیق صاحب کی طرح کچھ اور بوڑھے ریٹائر لوگوں کو بھی یہ چسکہ لگ جائے تو کتنا کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ بہر حال بلاشبہ یہ کتاب انتساب پبلی کیشنز کی جانب سے ایک پروقار اور یادگار پیشکش ہونے کے ساتھ دنیائے ادب میں گراں قدر اضافہ بھی ہے۔ آپ نے بھی اپنا حق ادا کرنے میں کسر نہیں چھوڑی ہے۔ مبارکباد قبول فرمایئے۔ آپ کی ترقی اور صحتیابی کی دعا کے ساتھ۔



سلیم انصاری

محترم توفیق صاحب

سلام مسنون

آپ کی کتاب مختار شیم ایک تاثر مجھے ہادی صاحب کے ذریعہ مل گئی تھی۔ وصولیابی کی رسید میں تاخیر کے لئے معذرت۔ انشاء اللہ آپ کی کتاب پر تفصیلی تبصرہ جلد بھجوانے کی کوشش کروں گا۔ آپ کی کتاب میں نے دلچسپی سے پڑھی ہے۔ مختار شیم کے بارے میں آپ نے خاص تفصیلی گفتگو کی ہے اور ان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے کئی گوشے اجاگر کئے ہیں۔ میری بھی یہی خواہش تھی کہ مختار بھائی حوالے سے اس طرح کی کتاب آنی چاہئے۔ میں آپ کو اس کامیاب کوشش کے لئے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ بھائی سیفی سرونجی کو سلام عرض کر دیں عرصہ سے انہوں نے مجھے یاد نہیں کیا ہے۔ بقیہ سارے حالات قابل شکر ہیں۔



انجم بارہ بنکوی

لائق صد احترام و اکرام

توفیق صاحب

تقدیس و تکریم

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا؟

کتاب مختار شمیم ایک تاثر آپ کے دستخط کے بغیر موصول ہوئی، شکر گزار ہوں اس خلوص بے پایاں کا۔ کتاب یقیناً بہت اچھی ہے ہر چند ڈاکٹر مختار شمیم جیسے اہم اور صاحب طرز فنکار کی شخصیت اور فن کے لئے شاید نا کافی؟ پھر بھی مجھ پر تحسین واجب ہے کہ آپ کو مبارکباد پیش کروں۔

میں ایک زمانے سے شمیم صاحب کی نثر و نظم کا مداح رہا ہوں یہ کتاب چونکہ آپ جیسے سچے زمانہ شناس کا کارنامہ اس لئے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ڈاکٹر مختار شمیم کے تئیں میری عقیدت اور مداحی میں اضافہ ہوگا۔ انشاء اللہ۔ اور بحضور رب کریم دست بدعا ہوں کہ وہ آپ سے ایسے ہی کچھ اور نمایاں کارنامے؟

☆☆☆☆

بقیہ صفحہ ۸.....

موسموں نے تو درختوں کو دیئے پیراہن
اور ہواؤں نے اڑانوں کے لئے پر بدلے
اس نے چٹان پہ اک پھول کھلایا تو کیا
پتھروں کو نہ بدلنا تھا نہ پتھر بدلے

☆

برگ آوارہ خزاں دیدہ ہوں میں
سبزہ و گل کی قبا مانگتا ہوں

مختار شمیم صاحب کی شاعری پر ابھی یہ گفتگو ادھوری ہے ان کے دیگر ادبی کارناموں کا تفصیلی جائزہ انشاء اللہ بعد میں کیا جائے گا۔ تاہم "انتساب" کا یہ شمارہ مختار شمیم کے نام ہے۔

☆☆☆☆

(ب)

عشرت قادری

عکس بنتا چہرہ

تخلیقی عمل کا سلسلہ ٹوٹ جائے تو ازسرنو اُسے شروع کر کے کڑی سے کڑی سے ملانا اور زنجیر بنانا کتنا مشکل کام ہے اِسے خود تخلیق کار ہی جانتا ہے، عالم سرمستی جس کا لقب شباب ہوتا ہے، نوخیز امنگوں اور لطیف جذبوں کی سرشاری اور وجدان کی سرکشی کے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے، دل میں احساسات کی شدت، روح کی بانبی کے آس پاس پھنکارتی رہتی ہے، گنگناتے ہوئے خوابیدہ لمحے بین کی سریلی آواز نغمے لگنے لگتے ہیں، ماحول میں ایک ارتعاش سا محسوس ہونے لگتا ہے، اندر چھپا ہوا ناگ اپنا پھن کاڑھے ہوئے دائیں بائیں جھکولے کھانے لگتا ہے تب شعور کی آنکھ کھلتی ہے، لہراتی، جھومتی بدمستی کی کیفیات اظہار کا وسیلہ تلاش کرتی ہیں جو آرٹ کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ شاعری مصوری، سنگ تراشی، افسانہ نگاری ایسے ہی کسی اور اظہار کے حوالے سے خود کو دریافت کرنے اور اپنی ذات میں سفر کرنے کا عمل شروع ہوجاتا ہے، اور روم روم سے تخلیق کی پھواریں پھوٹنے لگتی ہیں۔ مشاہدات، تجربات اور خود پر گزرنے والے طربناک وغمناک حادثات و واقعات شعور کی شرط پر داخل سے خارج کی جانب رجوع ہوتے ہیں لیکن تخلیقی عمل کے محرکات سے متعلق ان سطور سے محمد توفیق خاں کی وہ تصویر نہیں بنتی جو میری کم ہوتی بصارت نے دُھند کو کاٹ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے، اُن کا ظاہر و باطن شفاف آئینے کی طرح ہے، مزاج کی نفاست، خوش لباسی، خلوص، محبت اور ملنساری اُن کی پہچان ہے، دیرینہ وضعداری کی روش، تعلق خاطر میں گرویدگی اُن کی فطرت ہے، تقریر اور تحریر میں بے باکی اور بے لاگی اُن کی پٹھانی کی غماز ہیں، وہ باصلاحیت نوجوانوں کی حوصلہ افزائی اور ذہنی تربیت کا فریضہ کچھ اس انداز سے انجام دیتے ہیں کہ واقف کاروں کو رشک آتا ہے اور اب اپنی عمر کی تقریباً آٹھ دہائیوں کو چھوتے ہوئے اپنے مصوری کے شوق کو بھول کر نثر نگاری کو اپنا مشغلہ بنایا تو کتابوں پر تبصرے، مختلف موضوعات پر مقاالات اور مضامین لکھنے کا ایسا سلسلہ شروع کیا کہ مشاہیر اہل قلم کو اپنی جانب متوجہ کرلیا اور ایک ہی جست میں سرونج سے نکل کر ادب کے نصف چوتھائی ہفت آسماں طے کر ڈالے۔

حالیہ چند برسوں کی قلم کاری کے نتیجے میں، محمد توفیق خاں ایک نثر نگار کی حیثیت سے جو شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکے ہیں اُسے ان کی خوش بختی ہی کہی جاسکتی۔ ۲۰۰۱ء میں بیک وقت

ان کی دو تصانیف منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی ہیں جن کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر مختار شمیم کے ادبیات کو پڑھا یا سنا ہے۔ اول الذکر جگناتھ آزاد ماہرین اقبالیات میں ایک معتبر اور اہم نام ہے، "جگن ناتھ ازاد۔ ادب کی آبرو" کا دیباچہ صاحب زادہ شوکت علی خاں کے قلم کا مرہونِ منت ہے، اِن چار صفحات میں دیباچہ نگار نے جہاں آزاد کی شخصی اور ادبی زندگی پر اظہار خیال کیا ہے وہیں محمد توفیق خاں کی نثر نگاری کی بھی بھر پور تعریف کی ہے، سیفی سرونجی نے کتاب کے مصنف کا تعارف اتنی تفصیل سے تحریر کیا ہے کہ تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ یوں بھی محمد توفیق خاں اور سیفی سرونجی کی ادبی رفاقت سرونج کے لیے نیک فال ہے۔

اصل کتاب یعنی جگن ناتھ آزاد کی مجموعی ادبی خدمات اور ان کی شخصیت کا سرسری جائزہ صفحہ نمبر ۲۱ سے شروع ہوتی ہے، اِن اوراق پر محمد توفیق خاں نے جگن ناتھ آزاد کی ادبی زندگی اور شخصی پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے، اس کتاب کی تصنیف میں جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، پوری دیانتداری کے ساتھ فٹ نوٹ میں اس کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ محمد توفیق خاں کے اس اعتراف کے باوجود کہ یہ ایک سرسری جائزہ ہے، آزاد فہمی کے سلسلے کی ایک اہم کتاب ہے جو بہر حال حوالوں میں کام آتی رہے گی۔ اُن کی دوسری خوبصورت تصنیف مختار شمیم - ایک تاثر ڈاکٹر مختار شمیم کے ادبی سفر اور کوائف کی تفصیلی داستان ہے، جس کے ورق ورق پر، مختار شمیم سے والہانہ محبت، خلوص اور بے پایاں پذیرائی کے جذبات اُمڈتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، محمد توفیق خاں کا یہ دلپذیر انداز جہاں مختار شمیم سے محبت کرنے والوں کے لئے تحسین و ستائش کے زیرلب کلمات سے چھلکتا ہے وہیں کچھ لوگوں کے چہروں پر تناؤ اور ماتھے پر شکنیں اُبھرنے لگتی ہیں، انسانی فطرت آسانی سے تبدیل نہیں ہوتی۔ اپنائیت، خلوص اور محبت کے عناصر قدرت کا عطیہ ہیں، محبت کا جواب محبت سے ہی دیا جائے تو یہ رشتے مستحکم بھی ہوتے ہیں اور پائدار بھی۔ مختار شمیم کی ذات میں جو خوبیاں اور صفات ہیں اُنہیں کا نتیجہ ہے کہ "مختار شمیم - ایک تاثر" معرض وجود میں آئی جسے میں محمد توفیق خاں کی سرونج اور اہل سرونج سے گہری محبت سے تعبیر کرتا ہوں۔

"مختار شمیم - ایک تاثر" توفیق صاحب کی دوسری تصنیف ہے جو مختار شمیم کے ادبی سفر اور شخصی پہلوؤں سے روشناس کراتی ہے، مصنف کی تحریر کے مطابق مختار شمیم، "آثار مالوہ" اور صولت شیر شاہی" جیسی تاریخی کتابوں کے مصنف، سید احمد مرتضٰی نظر کے پرنواسے ہیں، اس اعتبار سے مختار شمیم کو ادب ورثہ میں ملا ہے، لیکن عملی زندگی میں مختار شمیم نے جو جد و جہد، محنت اور کوشش کی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اُنہوں نے محض وراثت کو اپنی ادبی شناخت بنا کر اُس پر انحصار نہیں کیا، اُن کی

شاعرانہ ریاضت، اردو زبان سے گرویدگی اور اپنے فن سے خلوص کے رویئے نے اُنہیں ترقی کی منزلوں تک پہنچایا۔خوش قسمتی سے کالج میں بھی اُن کی رہنمائی ایک ایسے عظیم دانشور نے کی جو خود اپنی ذات میں انجمن تھے اور یہ ہستی تھی ڈاکٹر ابو محمد سحر کی۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر ایک بلند مرتبت شاعر، محقق، ناقد اور اعلیٰ پائے کے نثر نگار ہونے کے علاوہ لسانیات کے ماہر تھے۔ جن کی شفقت اور حقیقی معنوں میں تدریس کے طریقے نے مختار شمیم کو کندن بنانے میں ایک آنچ کی بھی کسر نہیں رہنے دی۔ اس طرح یہ ہونہار بروا آج متعدد نثری اور شعری کتابوں کا مصنف ہے،توفیق صاحب نے مختار شمیم کی شہرت اور مقبولیت کو مزید استحکام عطا کرنے کے لیے جو کام کیا ہے وہ اُن کی محبتوں کا آئینہ دار ہے، اُن کے پُر خلوص جذبات قدردانی کے مستحق ہیں اور امید کی جاسکتی ہے کہ توفیق صاحب سرونج کی قدیم علمی، ادبی، تاریخی اور تہذیبی روایات نہ صرف برقرار رکھیں گے بلکہ نئی نسل کی ذہنی تربیت اور اور باصلاحیت قلم کاروں کی ترقی اور شہرت کے لئے راہیں ہموار کرتے رہیں گے۔ ویسے بھی ان سے یہ توقع کرنا اس لئے مناسب ہے کہ وہ بہت پہلے سے سرونج کے تقریباً سبھی نامور، گمنام اور نوآموز شعراء پر مستقل طور پر مضامین لکھ رہے ہیں جو ایک تذکرے کی شکل میں اشاعت کے منتظر بھی ہیں۔ ☆

قارئین و تخلیق کار حضرات کے لئے قابل توجہ

رسالہ کی پروف ریڈنگ دو بار کی جاتی ہے، ایک مرتبہ کمپیوٹر پر، دوسری مرتبہ کاغذ پر، لیکن بعض تخلیقات کی تحریر نہایت درجہ ناقابل قرأت (Illegible) ہوتی ہے، جس کی بنا پر کچھ شکایات مراسلات میں آجاتی ہیں، مسودات (نثر و نظم) دونوں میں املا کی اور زبان کی غلطیاں ہوتی ہیں، اگر تصحیح کر کے شائع کیا جائے تو صاحبِ تخلیق کو اعتراض ہو جاتا ہے، اگر جوں کا توں شائع کیا جائے تو پروف ریڈنگ کی شکایت آتی ہے، اس لئے نہایت ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ اپنی تخلیقات صاف، قابل قرأت تحریر میں روانہ فرمایا کریں، کاغذ کے ایک جانب، مناسب حاشیہ چھوڑ کر لکھیں، باریک کاغذ (Rice paper) استعمال نہ فرمائیں۔ (ادارہ)

ڈاکٹر غلام حسین اوجین

مختار شمیم - ایک تاثر

اردو زبان وادب میں گرامی قدر محمد توفیق خاں صاحب کی شخصیت محترم و مستحسن ہے انہوں نے سرونج میں اردو کا جو چراغ روشن کیا ہے اب اس کی روشنی بیرون ملک تک پھیل گئی ہے۔ اردو زبان وادب کے سیاق میں سرونج کو جو مرکزیت حاصل ہوتی جارہی ہے اس میں ان کا فیضان نظر اور سیفی سرونجی کا خون جگر شامل ہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد خاں صاحب تو حیرت انگیز اور مثالی کارنامہ انجام دے رہے ہیں وہ فطرت اور روایت سے گریز کرتے ہوئے اپنے وقیع کام میں مصروف عمل ہوکر خضر راہ کا کردار ادا کررہے ہیں جب لوگ پیرانہ سالی میں محنت سے احتراز کرتے ہیں اور اپنی زندگی کو بےلطف بنادیتے ہیں تو علی الرغم وہ محنت پیہم کا خوگر ہوکر اپنی زندگی کو مزین کئے ہوئے ہیں اور ضعیفی ان سے مخوف ہے۔ اسی (80) سال کی عمر میں ان کی تحاریر کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے جو جوانوں کے لئے باعث رشک ہے۔ عموماً یہ روایت رہی ہے کہ شاگرد اپنے استاد کی ادبی خدمات کو منظر عام پر لاکر ان کا نام روشن کرتے ہیں۔ مگر خاں صاحب اس روایت سے قطع نظر اپنے شاگرد کے ادبی کارناموں کو منظر عام پر لاکر انہیں ادبی دنیا میں سربلند کرنے کے خواہاں ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے نزدیک ادب میں عمر نہیں دیکھی جاتی بلکہ کلام دیکھا جاتا ہے۔ اس کا عملی نمونہ ''مختار شمیم - ایک تاثر'' ہے۔

یقیناً خاں صاحب کے ہم وطن اور اسکول کے زمانے کے شاگرد پروفیسر مختار شمیم مدھیہ پردیش کی اعلیٰ تعلیم گاہوں کی آبرو ہیں۔ ہر اعتبار سے ان کی شخصیت پروقار ہے۔ ایک ہردلعزیز معلم کے ساتھ ساتھ وہ تحقیق وتنقید کے مرد میدان ہیں، تخلیقی صلاحیت ان کی شخصیت کو بلند و بالا بناتی ہے۔ بنیادی طور پر وہ شاعر ہیں جو میر کے لہجے میں ہر دل کا راز چپکے سے سنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ دراصل شمیم صاحب کی شخصیت اور شمیم صاحب کی شاعری ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔ شمیم صاحب سے ملنا یا ان کے اشعار پڑھنا تقریباً یکساں ہیں۔ اگر کسی نے شمیم صاحب سے ملاقات نہیں کی ہے تو وہ ان کے اشعار پڑھ کر ان سے ملاقات کا شرف حاصل کرسکتے ہیں اور اگر کسی کو شمیم صاحب کے اشعار پڑھنے کی توفیق نہیں ہوئی ہے تو وہ ان سے ملاقات ہی کرلے تو ان کی نستعلیق شخصیت میں اسے ان کی شاعری جھلکتی نظر آئے گی ان کا یہ دعویٰ بےجا نہیں ہے۔

حرف حرف آئینہ لفظ لفظ چہرہ ہے
روبرو سخن میرا دیکھو میرے جیسا ہے

شمیم صاحب کی شاعری میں لکھنوی نفاست اور دہلوی سوز و گداز کی آمیزش ہے جس پر بھوپال کی لطافت اور طلاقت کی ملمع کاری ہے۔ان کی شاعری میں جلال نہیں جمال ہے، جذباتیت نہیں جاذبیت ہے اور گلکاری نہیں عطر سازی ہے جو قاری اور سامع کو بے اختیار متاثر کرتی ہے۔

یوں شمیم صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نویسی سے کی ہے بعد میں وہ شاعری کے میدان میں آئے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کے افسانوں میں بھی شعری لوازمات کی جلوہ گری نمایاں ہے۔بطور مثال یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"سورج اپنا آخری سفر طے کررہا تھا۔لہو رنگ شفق میں نہائے ہوئے پرندے قطار اندر قطار اپنی اپنی سمت اڑے چلے جارہے تھے۔قریب ہی گلنار کے درخت مجرموں کی طرح گردن جھکائے ہوئے لمبے لمبے سایوں کی بیڑیاں پہنے شام کی صلیب کاندھوں پر رکھے ہوئے اپنی بے زبانی پر مرثیہ خواں تھے۔"

شمیم صاحب کی تنقیدی بصیرت، عالمانہ اور متوازن رائے کو ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔وہ خورد و کلاں کی تفاوت و تقابل عمر سے نہیں کرتے بلکہ وہ لیاقت و صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہیں۔جہاں وہ خورد کی لیاقت و صلاحیت کے معترف ہیں وہیں کلاں کی لغزش پر معترض بھی۔یہ ان کی ادبی دیانت داری اور تبحر علمی کا بین ثبوت ہے۔

مختار شمیم-ایک تاثر انتساب پبلیکیشنز کا ایک انمول اور خوبصورت ادبی تحفہ ہے جسے ایک بزرگ ادیب محمد توفیق خاں صاحب نے محبان اردو کو بڑی خندہ پیشانی سے عنایت کی ہے اس میں شمیم صاحب کی حیات اور ادبی خدمات کے ہر گوشے کو بڑی جانفشانی سے انہوں نے منور کیا ہے۔یقیناً یہ کتاب شاگرد کے لئے استاد کا تبرک ہے۔اس کتاب کی ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہورہی ہے۔ خیر ابھی شمیم صاحب کی ادبی سرگرمیاں خوب سے خوب تر انداز میں ترقی کی راہ پر گامزن ہیں ابھی اہل اردو کو شمیم صاحب سے بڑی توقعات ہیں۔

اس کتاب میں اول سے آخر تک جس ہنر مندی، چابکدستی اور خوبصورتی سے فنکار کی حیات وادبی خدمات کو قلم بند کیا گیا ہے اس سے کما حقہ ان کی ادبی حیثیت مجلا ہوجاتی ہے۔یہ امر بھی مسلم ہے کہ پروفیسر مختار شمیم صاحب اب ادب کی اس بلندی پر پہنچ گئے ہیں کہ کسی بھی یونیورسٹی میں ان کی ادبی خدمات کو تحقیق کا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر فہمیدہ منصوری

استاذیٔ محترم

مشفق و مکرم جناب محمد توفیق خاں صاحب

ڈاکٹر مختار شمیم کا نام ادب میں محتاج تعارف نہیں۔ ان کی ادبی کاوشیں اردو دنیا میں اپنا مقام رکھتی ہیں۔ سنجیدہ طبیعت، گہری سوچ، ژرف نگاہی، مستقل مزاجی، تحریر و تقریر میں معیار و توازن کا ہر لمحہ احساس، ان کی شخصیت کے اہم ترین اوصاف ہیں۔

میں ڈاکٹر مختار شمیم صاحب کے حلقۂ شاگردی میں 1979 میں شامل ہوئی آج بھی یہ رشتہ قائم ہے۔ دورانِ حصول علم استادی شاگردی کی دیوار حائل رہی ان کی مدبرانہ تقاریر آج بھی ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ ہیں جو وقتاً فوقتاً مشعل راہ بنتی ہیں۔ اسی سال ماہ جولائی یا اگست کا کوئی دن تھا۔ میں اپنی ہم جولیوں کے ساتھ اردو ادب کی کلاس کی منتظر تھی وقت مقررہ پر شمیم صاحب تشریف فرما ہوئے، اس وقت ہم مسلسل قہقہے لگا رہے تھے مجھے ان کے جملے حرف بہ حرف یاد ہیں۔

"آپ کے قہقہوں کی آواز زینہ تک پہنچ رہی ہے۔"

مختصر سا جملہ لیکن پراثر جس میں کسی قسم کی سخت گیری کی بو تک نہ تھی، دل پر اثر کر گیا۔ کالج کی زندگی میں ہمیشہ محتاط رہی کہ کوئی قہقہہ سرزد نہ ہو جائے۔

آج جب مختار شمیم - ایک تاثر دستیاب ہوئی تو فرطِ مسرت سے دل جھوم اٹھا۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں یہ اولین کاوش ہے جو اس سلسلہ کو جاری رکھنے میں سالارِ کارواں ہوگی۔

مختار شمیم "شخص اور شاعر" کے عنوان سے جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ یقیناً تحقیق کا درجہ رکھتی ہیں۔ خصوصاً سرونج سے متعلق بیانات تاریخی دستاویز ہیں علاوہ ازیں خاندانی حالات، ابتدائی ادبی کاوشیں، شمیم سرونجی سے مختار شمیم تک کا ادبی سفر ایسے گوشے ہیں جنہیں احاطۂ تحریر میں لا کر مجھ سے قارئین کی معلومات میں اضافہ کیا ہے ویسے ریاست ٹونک اور اردو شاعری طالب علمی کے زمانہ میں سرسری مطالعہ سے گزری لیکن یہ بات اب واضح ہوئی کہ ریاست ٹونک ہی کو شمیم صاحب کے قلم نے اولیت کیوں دی سرونج سے ریاست کا تعلق اور ان کی ذات کا سرونج سے تعلق ایسی کڑیاں ہیں جو ریاست کو ضبطِ تحریر میں لانے کا سبب بنی۔ اس کتاب میں ریاست ٹونک کی ہر زاویہ سے قدر و قیمت اور اہمیت کا احاطہ کیا گیا ہے۔ تاریخی، تہذیبی، علمی، صحافتی معلومات فراہم کرنے میں تحقیقی

شعور واضح طور پر نمایاں ہے۔ خصوصاً مومن اور غالب کا دربار ٹونک سے تعلق، شاعری سے متعلق جدید رجحانات کی عکاسی، ریاست ٹونک کے ادبی پس منظر میں معاون ہیں۔

کہانی 'ماں' ماں کی عظمت کا اعتراف تو ہے ہی محرومی مادر کے سبب زندگی میں جو خلاء پیدا ہوتا ہے اس کا احساس بھی ہے نفسیاتی کشمکش، تخیل کی پرواز اس کہانی کو پرکشش بناتی ہے۔ اوائل عمری میں احساس عمل کی چنگاری شعلہ جوالہ کی شکل اختیار کرگئی، ماحول مطابق ہو یا نہ ہو عمل پیہم ان کی زندگی کا اہم ترین جزو ہے نامساعد حالات میں بھی ذہنی استقلال ان کی قوتِ برداشت کا بین ثبوت ہے۔

میڈم کشور سلطان صاحبہ کی علالت کے دوران اسپتال میں میں نے اس مستقل مزاجی کا وہ عالم دیکھا انہوں نے (مختار شمیم صاحب) بغیر کسی ذہنی انتشار کے نہ صرف گفتگو کی بلکہ پی ایس سی امتحانات سے متعلق جو عنقریب ہونے والے تھے معلومات بہم پہونچائیں نیز قابل قدر مشوروں سے بھی نوازا (دلی کیفیات خدائے برتر ہی جانتا ہوگا)

ڈاکٹر مختار شمیم ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں ان میں ایک حساس شاعر، ژرف نگاہ محقق، عدل پرور نقاد موجود ہے۔ معاشرہ کی ناباضی اور نفسیاتی کشمکش ان کے افسانوں میں نظر آتی ہے لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ ایک کامیاب استاد ہیں۔ استادانہ مہارت، ذاتی تجربات اور مشاہدہ کے علاوہ عمیق نظری، مطالعہ کی وسعت، برسوں کی فکری ریاضت ادبی کارناموں کی شکل میں ڈھلی ہے۔ تحقیقی کارناموں میں محتاط روی کے قائل ہیں۔ ''ظہیر دہلوی حیات وفن'' ان کا وہ کارنامہ ہے جس پر خود انہیں بھی ناز ہے یہ کتاب جب منظر عام پر آئی اس وقت میں بی اے کی طالبہ تھی۔ انہیں کی زبانی اس کتاب سے متعارف ہوئی اس وقت تنقیدی اور تحقیقی شعور سے پوری طرح واقفیت نہ تھی لیکن خوشی ملی کہ ہم صاحب کتاب استاد کے شاگرد ہیں۔ ان کی شخصیت سے مرعوب ہونے کے سبب کسی قسم کے استفسار کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ دل میں کئی سوال ابھرتے اور دب جاتے۔ جب کبھی شمیم صاحب کا مزاج برہم ہوتا ہم لرزاں براندام ہوجاتے۔ ان کے لہجہ میں کبھی تلخی نہیں دیکھی لیکن چہرہ کے تغیر ہی سے ان کے موڈ کا علم ہوجاتا۔ ایسے نازک وقت میں میڈم (کشور سلطان صاحبہ) ہمارے حق میں چھتنار درخت بن کر سایہ فگن ہوجاتیں۔ کلاس کے بعد ہم جماعت تبادلہ خیال کرتیں ان کی ذات میں ہمیں ماں کی ممتا نظر آتی دل کے کسی گوشے میں میڈم زیادہ اچھی لگتیں آج وہ ہمارے درمیان نہیں (آسمان ان کی لحد پر بارائی نور کرے) اور میرا شعور بھی بالیدہ ہو چکا ہے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ شمیم صاحب کی سختی کے پس پردہ ایک عزم مصمم تھا کہ ان طالبات میں سے کوئی ان کا مقام لے سکے۔

کافی وقفہ کے بعد سال گزشتہ دو ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوا ماضی بعید کے شمیم صاحب اور حال کے ڈاکٹر مختار شمیم میں بہت تبدیلیاں محسوس ہوئیں جیسے شاخِ ثمر دار خود بخود جھکتی جائے۔

وقت کی ستم ظریفی کہئے یا کاتب تقدیر کا فیصلہ مصیبت ہی میں بشر کے جوہر سے آشنائی ہوتی ہے ان مصائب کی آنچ نے انہیں سونا سے کندن بنادیا ہے۔ ان کی شاعری میں درد کی آمیزش اس امر کی نشاندہی کرتی ہے۔ آپ نے بحیثیت غزل گو، بحیثیت نظم نگار، کے عنوان سے ان کی غزلوں اور نظموں کے حوالے سے اس بات کی تصدیق کی ہے۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے ان کا مجموعہ غزلیات ''حرف حرف آئینہ'' شائع کرکے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف ہی کیا ہے۔

ان کی شاعری پر آپ نے تفصیلی بحث میں جامع آراء کی شمولیت کر کے قدر و قیمت کا ناقدانہ انداز سے تعین کیا ہے۔ خصوصاً کمال احمد صدیقی، فضل امام، سلیمان اطہر جاوید، قمر رئیس جیسی معتبر شخصیات جن رائیں عہد موجود میں ''سکہ رائج الوقت'' گردانی جاتی ہیں۔

''تناظر و تشخص'' اجین سیمنار سے لوٹتے وقت شمیم صاحب کے ہاتھوں ملی تھی، اس میں شامل مضامین کئی بار پڑھے لیکن اظہار خیال کی ہمت نہ کرسکی تھی اس میں موجود مضامین تنقیدی بصیرت کے حامل تو ہیں ہی ان میں جغرافیائی عوامل کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔

شمیم صاحب کے ادبی کارناموں کا آپ نے اس کتاب میں ناقدانہ بصیرت سے جائزہ لیا ہے۔ تحقیق و تنقید کا باہم رشتہ ہے اس کا ثبوت اول تا آخر آپ کی تحریر میں ملتا ہے۔ چونکہ مختار شمیم صاحب محتاط روی کے ساتھ قلم اٹھاتے ہیں اس لئے ادبی دنیا میں (ان مصنفین کے مقابلے جو زود گو ہیں) ان کا مقام متعین ہونے میں تاخیر ہوئی علاوہ ازیں تنقید میں بے لاگ اور دوٹوک رائے ان کی پہچان ہے۔ جستجوئے پیہم کے ساتھ آپ گوہر آب دار کے بھی متلاشی رہتے ہیں۔ ادب میں مصلحت پسندی کا رویہ جو عام ہو چکا ہے۔ ان سے کنارہ کشی کرتے ہوئے بغیر کسی امتیاز کے حقیقت پسندانہ اظہار خیال کرتے ہیں۔ ان سب باتوں کو آپ نے تفصیل سے پیش کر کے ان کے مزاج اور ادبی نظریہ کو منصفانہ انداز سے منظر عام پر لانے کی سعی کی ہے۔

کتاب کے آخر میں ''انتخاب'' کی شمولیت آپ کی تخلیق کی ضامن ہے جن حضرات کو کسی قسم کا شائبہ ہو ان جواہر پاروں سے تشفی کر سکتے ہیں۔ نیز شائقین ادب بھی ان سے اپنی تشنگی مٹا سکیں۔



رشید انجم

''مختار شمیم - ایک تاثر''

پر تبصرہ

فاس کمپیوٹرانکس، بھوپال کے توسط سے شائع ہوئی ایک اور بہتر اور دیدہ زیب کتاب میرے سامنے ہے۔ اچھا کاغذ، بہتر طباعت اور آسمان پر ڈوبتی شام سے زرد رنگ کے پس منظر میں مختار شمیم کا انتہائی سنجیدہ اور خود کو باوقار ثابت کرتا چہرہ۔ جیسے وہ اس ڈوبتی شام کا ساتھ دے رہے ہوں۔ کیا ہی ہوتا اگر وہ اپنے لبوں کو ہلکا سا دا کر کے مسکراہٹ کا تاثر چہرے پر سجا لیتے۔ کم از کم تصویر میں تو ان کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر محظوظ ہو لیتے۔ کتاب کی کمپوزنگ اچھی ہو، ٹائٹل دیدہ زیب ہو اور کاغذ پر الفاظ اور روشنائی کا ملاپ صحیح ہو تو بے ساختہ دل ایسی کتاب کی ورق گردانی پر مجبور ہو جاتا ہے۔

محمد توفیق خاں صاحب بڑی محترم شخصیت ہیں۔ وہ نہ صرف اچھے قلم کار ہیں بلکہ ان کی نگاہیں شخصیت کو پرکھنے کا فن بھی جانتی ہیں۔ ان سے مل کر پہلا تاثر ابھرتا ہے کہ توفیق خاں صاحب سرونج جیسی پٹھان بستی کے صرف ایک کاشت کار ہونگے۔ مگر جب ان کی تحریریں پڑھیں انہیں اور قریب سے دیکھا تو پہلا تاثر اور دوسری پر تاثیر فضا سے فنا ہو جاتا ہے۔ سرونج وہ خطہ گلاب ہے جس نے تشہیری صداقت کی زمینوں پر خوشبوؤں کے نگر آباد کئے ہیں۔ ڈاکٹر خالد محمود، شاہد میر، شان فخری اور سیفی سرونجی اس نگر کے باسی ہیں جو ماضی کے شعر وادب کا امین رہا ہے۔ اور آج ان کے جلو میں شخصی توانائی سے قلم کی شریعت کی پاسبانی کر رہا ہے۔ انہیں میں ڈاکٹر مختار شمیم ہیں۔

مختار شمیم شاعر ہیں، نقاد ہیں، محقق ہیں، افسانہ نگار ہیں، ڈرامہ نویس ہیں اور مدرس بھی ہیں۔ ایک شخص میں اتنی خوبیاں ہونا کوئی اہم اور قابل حیرت بات نہیں ہے۔ اہم تو یہ ہے کہ وہ ان تمام اصناف کو اپنے اندر کس طرح اور کیسے زندہ رکھتا ہے اور ان اصناف کی ترتیب و تربیت کس ماحول میں کرتا ہے؟ مختار شمیم کی شخصیت ان کی بردباری میں پوشیدہ ہے۔ وہ ہر صنف کو بہت سلیقے سے ذہن کی الماری سے نکالتے ہیں اس پر جمی گرد کو صاف کرتے ہیں، اس کے نقوش میں خود کو دیکھتے ہیں اور جب ان نقوش میں وہ خود کو دیکھ لیتے ہیں تو قلم کی جنبش ہوتی ہے۔ اور اس صنف کے خدوخال کاغذ پر ابھرتے چلے جاتے ہیں اور ایک اچھی اور یاد رکھی جانے والی تحریر سامنے آجاتی ہے۔ وہ صنف شاعری

ہو، کہانی ہو، ناٹک ہو، کسی شخص کا ادبی تجزیہ ہو یا کوئی تحقیق ہو۔ مختار شمیم ایسے ہی قلم کار ہیں جو حیات وکائنات کو ادبی توقیر کی سوغاتیں دیتے آرہے ہیں۔ محمد توفیق خاں کا مضمون ''مختار شمیم۔ شخص اور شاعر'' ایک اچھا تاثر قائم کرتا ہے۔ انہوں نے مختار شمیم کی زیادہ تر اصناف پر قلم اٹھایا ہے اور اپنے تاثر کے ساتھ تجزیہ پیش کیا ہے۔

ہندوستان کے شعروادب کی یہ روایت رہی ہے کہ شاعر یا ادیب وفات پا چکتا ہے تب اس کے فن اور شخصیت کا جائزہ لیا جاتا رہا ہے لیکن ادھر کچھ سالوں سے اس روایت سے انحراف کیا جانے لگا ہے۔ سیفی سرونجی ایک اچھے انسان بھی ہیں اور اردو ادب کے ان خدمت گاروں میں سے ہیں جو اس بات کے خواہش مند رہتے ہیں کہ ادب کو ہم نے کیا دیا نہ کہ ادب سے ہم نے کیا لیا۔ 'انتساب' اس کی زندہ مثال ہے۔ اور ان کے زیرنگرانی شائع ہونے والے وہ خاص نمبر ہیں جو ادیب وشاعر کی زندگی میں ہی شائع ہوئے ہیں۔ ان کی فہرست اس کتاب کے آخری ورق پر آپ کو مل جائے گی۔

''مختار شمیم۔ ایک تاثر'' محمد توفیق خاں صاحب کی ایک کامیاب کوشش ہے اور یہ کوشش اس وقت زیادہ کامیاب مانی جائے گی جب یہ زیادہ سے زیادہ ادب کے دیوانوں کے نزدیک پہنچے۔ سیفی سرونجی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس دور گراں مایہ میں ایک ایسی کتاب شائع کرنے کی جسارت کی جس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہ اقدام نہ صرف قابل تحسین ہے بلکہ اردو زبان وادب پر ان کی کارکردگی اور وابستگی پر بھی دلالت کرتا ہے۔

(''صدائے اردو''، بھوپال)



ڈاکٹر منور حسن کمال

''مختار شمیم۔ ایک تاثر''
پر تبصرہ

سرونج ایک قدیم تاریخی وعلمی گہوارہ رہا ہے۔ دہلی سے دکن آنے جانے والی شاہراہ پر واقع سرونج فوج اور مسافروں کی گزرگاہ رہا ہے۔

مختار شمیم کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ مختار شمیم بحیثیت ادیب اور ناقد مشہور ہیں لیکن ان کے

تخلیقی سرمایے میں شاعری ایک مقام رکھتی ہے۔ان کی نظموں میں ایک گہری فکر اور ایسے نقوش پائے جاتے ہیں جہاں تجربوں کی نئی دنیا آباد ہے،ان کی غزلیں بھی خوب ہیں۔زیر نظر کتاب ''مختار شمیم : ایک تاثر'' ان کی شخصیت پر محمدؐ توفیق خاں کے لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں آخر میں ان کی تخلیقات کا انتخاب (غزلیں،نظمیں،افسانہ،تحقیق وتنقید) بھی پیش کیا گیا ہے۔

کمال احمد صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے: مختار شمیم کے یہاں دل کے بجائے دماغ سے زیادہ کام لیا گیا ہے،اس لیے ان کے یہاں فنی خامیاں نظر نہیں آتیں۔

اے وضعِ احتیاط سنبھل ، اپنی خیر لے
ہر مرحلے پہ وہم کے سائے بھی آئیں گے

محمدؐ توفیق خاں نے مختار شمیم کی شخصیت اور شاعری کا بھرپور احاطہ کیا ہے،بحیثیت غزل گو، بحیثیت نظم نگار،بحیثیت محقق ونقاد اور ان کی کہانیوں پر خصوصیت کے ساتھ روشنی ڈلی ہے۔

مختار شمیم ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔محمد توفیق خاں نے ممکنہ طور پر اُن کے کارناموں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے،جس میں انہیں ایک حد تک کامیاب کہا جانا چاہیے۔یقیناً ''مختار شمیم :ایک تاثر'' کا اس کے شایانِ شان استقبال کیا جائے گا۔

(عالمی سہارا،ہفت روزہ اشاعت،۱۷؍دسمبر ۲۰۰۵ء ص ۱۹)

ماہنامہ ''شاعر'' کے گوشۂ مختار شمیم پر تاثرات

☆ شہناز صبیح الہ آباد

''شاعر فروری 2005 ''مختار شمیم'' پر گوشہ بہت پسند آیا۔ عموماً ایسے ہمہ جہتی شخصیت۔ کے لوگ کیاب ہیں میرا مطلب ان خوبیوں اور شہرت سے دور ادبی پختگی کی فکروں میں جی اور جان کو گھلانے سے ہے۔ شاعر موصوف کی اہلیہ کی قربانیاں لائق صد ستائش ہیں جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کو بھی شوہر کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں کھپا دیا۔ لیکن اتنی جلد رحلت اور خصوصاً دو دن بعد بیٹی کا نکاح اور رخصتی مرحوم کس ادا کے تماشائیوں میں تھی، پھرتی ہے دل کی تاش تماشا بنی ہوئی''

محمد توفیق خاں نے جس انداز سے ان کی زندگی کے اوراق پیش کئے ہیں اس کے لفظ لفظ سے رسانیت اور دلی تعلق عیاں ہوتا ہے۔ بہر کیف ان کی شاعری کے دو آتشہ نہیں بلکہ سہ آتشہ ہونے کی توقع ہے۔ بچپن میں ماں کا غم اور اب شریک حیات کا صدمہ، ان کی شاعری نے آتشِ شوق کو ایسی تو لو دی ہے کہ اب مجموعے خریدنا ناگزیر ہوگیا ہے۔''

☆ پروفیسر باغی رتنا گری

''جناب مختار شمیم پر گوشہ شائع کر کے ہمیں ایک اچھے شاعر سے متعارف ہونے کا موقع دیا۔ شمارے میں شامل تمام شعری و نثری فن پارے خوب ہیں''

☆ ہاجرہ رحمان

''مختار شمیم پر گوشہ اچھا ہے مجھے خاص طور پر مٹھی بھر نظموں میں ان کی نظم حرف سادہ نے متاثر کیا''

☆ خان حفیظ - چمن گنج کانپور

''مختار شمیم پر گوشہ شائع کر کے آپ نے ایک اہم فریضہ انجام دیا ہے حقیقتاً وہ ایک اچھے شاعر ہیں۔ ان پر رقم کیا ہوا مضمون مختار شمیم اور شاعر - محمد توفیق خاں معیاری اور متوازن ہونے کے ساتھ معلوماتی بھی ہے۔ انہوں نے ان سے متعلق کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔''

☆ رضوانہ پروین ارم - جمشید پور

''جناب مختار شمیم کی شاعری کافی پسند آئی۔''

☆ افضل عباس - ناروے،

''مختار شمیم پر گوشہ اور مشاہیر کی رائے جامع ہے۔ شمیم کی مٹھی بھر غزلیں اور نظمیں فکری خصوصیت اور شعری جمالیات کے ہر ذائقے سے مزین ہیں۔ کربلا آشنا ایسی ہی شاعری کرتے ہیں۔ '' دل ویراں میں بھی اک کربلا آباد رکھتے ہیں۔ شمیم)

گفتگو۔ مختار شمیم سے

ڈاکٹر سیفی سرونجی

س س: مختار شمیم صاحب! جہاں تک آپ کے ادبی ذوق کا تعلق ہے تو صاف ظاہر ہے کہ ورثہ میں ادبی ذوق آپ کو ملا ہے۔ آپ کے ددھیال میں نذیر احمد صاحب نذیر (مرحوم) ایک نعت گو شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ آپ کے رشتہ کے ایک اور چچا راہی قاسمی صاحب کی تو استادانہ حیثیت ہے۔ ان کے کئی نامور شاگرد ہیں۔ مرحوم وقار فاطمی کے علاوہ ڈاکٹر شان فخری، ڈاکٹر خالد محمود، ڈاکٹر جانکی پرشاد شرما اور خود آپ نے بھی ان سے اپنے کلام پر اصلاح لی ہے۔ اِدھر ننھیال میں سرونج ہی کی نہیں بلکہ ریاست ٹونک کے ممتاز مورخ و ادیب اور شاعر سید احمد مرتضیٰ صاحب نظرؔ کا نام نامی ہے۔ اب یہ سلسلہ آپ کے برادر خورد سہیل نسیم تک پہنچا ہے --- آپ یہ بتایئے کہ کیا بچپن ہی سے آپ کو ادب سے لگاؤ رہا ہے؟

م ش: بات یہ ہے کہ میری والدہ مرحومہ کو مذہبی کتب کے علاوہ ادبی رسائل کے مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ میں سات آٹھ برس کا تھا کہ اپنی نانی کے یہاں میر امّن کی "باغ و بہار" ہاتھ آ گئی۔ میں نے اس کا کئی بار ورد کیا، اسی درمیان ایک ناول غالباً شوکت آرا بیگم بھی پڑھا تو بہت دلچسپ لگا۔ ابا (نانا مرحوم) کے پاس الجمعیۃ، نئی دنیا دہلی، سیاست جیسے اخبارات کو دیکھنے اور پڑھنے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ جاسوسی دنیا اور رومانی دنیا بھی اسی دوران خوب مزے لے لے پڑھا کرتا تھا --- اور پھر گھنٹوں خیالی دنیا میں کھویا رہتا۔

س س: آپ کی ایک کہانی "ماں" اسکول کے میگزین میں شائع ہوئی تھی، اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟

م ش: "ماں" یقیناً میری پہلی کہانی ہے اور تخلیقیت کا پہلا قدم۔ اس وقت میری عمر پندرہ برس کی تھی۔ میں گیارہ برس کا تھا کہ والدہ محترمہ کے انتقال نے محرومی کا احساس پیدا کیا۔ اکثر میں کیتھن ندی کے کنارے کنارے پہاڑی سلسلہ کو ناپتا رہتا اور مولا علی صاحب کی ٹیکری پر جا کر دم لیتا۔ وہاں مجھے بہت اچھا لگتا۔ علاوہ ازیں نواب صاحب کی کوٹھی کے اطراف میں جو آموں کا باغ تھا، اس باغ میں درختوں کی ٹہنیوں اور ان کے سائے میں اپنی نصابی کتابوں کے مطالعہ میں وقت گزرتا رہتا۔ لیکن ذہن میں کہانیاں بھی بنتا رہتا۔

س س: افسانہ نگاری کے میدان میں پھر آپ نے قدم آگے کیوں نہ بڑھایا؟

م ش: اعلیٰ تعلیم کے لیے میں بھوپال آیا تو افسانہ نگاری کا سلسلہ جاری تھا۔ پھر--- ہوا یہ کہ ۱۹۶۱ء میں چھٹیوں میں ایک بار جب سرونج پہنچا تو شعری نشستوں کی بڑی دھوم تھی اور خاص بات یہ تھی کہ نوعمر طالب علموں میں یہ رجحان عاشقی کی حد تک تھا۔ اگر محمد اسحاق اور محمد علی تاباں، محی الدین انجم لہک لہک کر اپنے اس عشق کا اظہار کر رہے تھے تو خالد محمود اور شاہد میر کی شاعرانہ صلاحیتوں کے چار دانگ چرچے تھے۔ سرور علی خاں سرور کا مزاحیہ انداز بھی موضوع گفتگو بنا ہوا تھا۔ مجھے بھی اپنے ہم عمروں کی شعر و سخن سے دلچسپی دیکھ کر ایک Urge پیدا ہوئی اور فکر شعر میں غلطاں رہنے لگا۔ سیفی صاحب! میں آپ سے سچ کہوں کہ اس وقت بھی یعنی اپنے ابتدائی دور میں خالد محمود اور شاہد میر نہایت پختہ شعر کہہ رہے تھے۔ شاہد میر تو عمر میں ہم سب سے چھوٹے تھے۔ کبھی یہ گمان بھی گزرتا تھا کہ ان کے والد میر عرفانی صاحب یا نانا ناطق مالوی صاحب ان کی غزل بناتے ہیں، لیکن بہر حال یہ گمان بہت جلد اس یقین میں بدل گیا کہ شاہد میر اپنی صلاحیتوں کی بنا پر اپنے والد اور نانا سے بھی آگے ہیں۔ خالد محمود بچپن سے ہی بے حد ذہین تھے۔ Struggle بھی خوب کیا، بلکہ ہم سبھی نے Struggle کیا ہے۔ تاہم خالد محمود کی علمیت اور ان کی ذہانت اسی وقت سے نظر آنے لگی تھی۔

س س: آپ نے قلمی رسالہ بھی تو نکالا تھا---

م ش: جی ہاں! اسی دوران ایک دن نواب صاحب کی کوٹھی پر شام کے وقت ہم لوگ جمع ہوئے اور بالاتفاق رائے انجمن طلبا سرونج کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ہمارے ایک دوست شکیل احمد کے مکان کے باہری کمرے میں باقاعدہ انجمن طلبا کا دفتر قائم کیا گیا۔ ہم میں سے اکثر کو خوشنویسی کا شوق بھی تھا۔ اس شوق کی تکمیل کے لیے ایک قلمی رسالہ 'راہی' کے نام سے جاری کیا جو سرونج اور بھوپال کی ادبی شخصیتوں کے درمیان دست بدست گھومتا رہتا۔

س س: غالباً رسالہ کا نام 'راہی' آپ نے اپنے استاد راہی قاسمی کے تعلق سے رکھا تھا---

م ش: یوں ہی سمجھ لیجے۔ برسبیل تذکرہ میں عرض کروں کہ یہ میری شاعری کا ابتدائی دور تھا اور میں اس میدان کا نہ تب شہسوار تھا نہ اب ہوں، میں نے تین چار غزلوں پر ساحر بھوپالی سے بذریعے خط و کتابت اصلاح لی تھی کہ وہ بمبئی میں مقیم تھے۔ دو غزلیں میر عرفانی صاحب کو دکھائی تھیں اور پھر عم محترم راہی قاسمی صاحب سے استادی و شاگردی کا رشتہ قائم ہوا۔ عروض سے تو اب بھی بے بہرہ ہوں۔ میرا اپنا اصول ہے کہ میں اپنی غلطی جلد ہی تسلیم کر لیتا ہوں،

اس سلسلہ میں کوئی بھی ٹوک دے میں اس کی واجب رائے کا احترام کرتا ہوں۔

س س: محمد توفیق صاحب بھی تو آپ کے استاد رہے ہیں۔--- اور آپ کے لیے فخر کی بات یہ ہے کہ انہوں نے آپ جیسے شاگرد پر ایک پوری کتاب ہی لکھ ڈالی ---" مختار شمیم - ایک تاثر"۔

م ش: بیشک! میرا اس پر جتنا فخر کروں کم ہے۔ میں نویں درجہ کا طالب علم تھا، اگر چہ کہ سائنس اور سوشل سائنس کے مضامین نصاب میں ضروری تھے لیکن ایک گروپ اختیاری مضامین کا بھی تھا۔ مڈل پاس کرنے کے بعد میرے لیے یہ مشکل تھا کہ میں فائن آرٹس کو منتخب کروں یا فارسی کو۔ بہرحال میں نے دو تین دن فائن آرٹس یعنی ڈرائنگ کے شعبہ میں حاضری دی۔ محمد توفیق خاں صاحب ڈرائنگ ٹیچر تھے۔ انہوں نے حکم دیا کہ انگور کی بیل بناؤ، سو میں نے انگور کی بیل پنسل سے ڈرائنگ کاپی پر بنادی۔ پتوں کے کٹس اتنے صاف تھے کہ توفیق صاحب دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اگلے دن مولانا عبدالعزیز صاحب (تمرؔ) میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی کلاس میں لے گئے اور مجھے اپنے فارسی کے طالب علموں کی صف میں شامل کرلیا۔ مولانا عبدالعزیز صاحب اردو بھی پڑھاتے تھے۔ ان کی تدریس کا طریقہ اتنا خوبصورت تھا کہ شاید وہی میری ادبی زندگی کو بنانے میں معاون رہا۔ ان کے علاوہ اسکول کے پرنسپل رامیشور دیال کی قابلیت نے مجھے متاثر کیا۔ وہ جغرافیہ کے مہو کالج میں لکچرر رہ چکے تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی میں فراقؔ گورکھپوری کے انگریزی کے طالب علموں میں سے ایک رامیشور دیال بھی تھے۔ وہ سائنس کے مضامین کے ساتھ ساتھ سنسکرت، ہندی حساب اور اردو بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھاتے تھے۔ میرے ماموں سیّد اطہر حسین صاحب بھی اسی اسکول میں استاد تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں سینئر طلبہ کے لئے بھی مثالی بن سکوں اور اسکول میں ممتاز رہوں۔

س س: اور توفیق صاحب---؟

م ش: اس زمانے میں ایک توفیق محمد خاں بھی تھے جو ت.م. جواد کے نام سے لکھتے تھے۔ ایک خوبصورت قلمی رسالہ نکالتے تھے، افسانے اور تنقیدی مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ میرے Seniors میں ان کی تو کسی حد تک ادبی حیثیت تھی لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ جب میں خود بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ رہا ہوں تو محمد توفیق خاں صاحب، میری نویں جماعت کے اسکول کے استاد، اچانک اسی سال کی عمر میں ایک توانا ادیب کی حیثیت سے سامنے آئے اور اپنے ادبی کارناموں کی وجہ سے نامور ہوئے۔ یہ ہم سب کے لیے فخر و امتنان کی بات ہے۔

س س: کچھ کالج کے اپنے اساتذہ کے بارے میں بتائیے۔
م ش: میں جب حمیدیہ کالج بھوپال میں داخلہ لینے پہنچا تو میرے داخلہ فارم کی تکمیل پروفیسر عبید عرب صاحب نے اپنے قلم سے کی۔ ان کے جانشین پروفیسر زبیر صدیقی ہمیشہ مجھ پر مہربان رہے۔ میں بی۔اے۔ سال اوّل کا طالب علم تھا، میں نے معمولی فارسی میں ایک غزل کہی۔
س س: ضرور سنائیے۔ یہ تو نئی بات معلوم ہوئی۔
م ش: چند شعر ملاحظہ ہوں۔

دل حزیں پُر بہار دارم	کہ داغ دل بے شمار دارم
شب جدائی ز فرقت تو	بیا! کہ دل بے قرار دارم
چہ فکر عقبیٰ کہ خوش نصیبم	شفیع آں تاجدارؐ دارم

اس غزل کو لے کر میں خوش خوش شعبہ فارسی کے پروفیسر محبوب الرحمٰن بسمل کے پاس گیا۔ انھوں نے اشعار کا وزن اور بحر کے متعلق سوال کیا۔ میں تو عروض سے غافل تھا --- سو انھوں نے غزل دیکھے بغیر لوٹا دی۔ سلیم حامد رضوی، گیان چند جین صاحب، ابو محمد سحر صاحب، آفاق احمد صاحب اور انگریزی کے سید حامد حسین صاحب یہ سب شخصیتیں ادب کے روشن منار کی حیثیت رکھتی ہیں اور ظاہر ہے کہ اگر مجھے کالج میں ان کی شاگردی کا فیض حاصل نہ ہوا ہوتا تو آج میں یہاں نہ ہوتا۔

سیفی صاحب! میں نے ابھی آپ کو اپنی ابتدائی تخلیقات کے بارے میں بتایا تھا۔ سو یہ عرض کروں کہ پہلی غزل پر میں نے ڈرتے ڈرتے ابو محمد سحر صاحب سے اصلاح لی تھی۔ پھر ایک تنقیدی مضمون بھی انھیں اصلاح کی غرض سے پیش کیا تو میری جھجک دور ہو چکی تھی اور سحر صاحب کے مشفقانہ مشوروں، ان کے شائستہ رویوں اور ان کی شخصیت میں شامل عالمانہ قدروں کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ یہ صرف ابو محمد سحر صاحب کی توجہ تھی کہ میں کسی لائق بن سکا۔

پروفیسر آفاق احمد صاحب نے گویا میری زندگی میں اُجالے ہی اُجالے بھر دیے کہ ان کی بدولت ڈاکٹر کشور سلطان میری شریک حیات بنیں۔ ان ہی کے سبب زندگی کے کئی معرکوں میں فتح نصیب ہوئی۔ اب سحر صاحب اور آفاق صاحب جیسے استاد ڈھونڈے سے نہ ملیں گے جو اپنے شاگردوں کی زندگی کے دامن پر چاند ستارے ٹانک دیں اور ان کی شخصیت کو منور بنا دیں۔

س س: درست فرمایا آپ نے ہماری بھابی کشور سلطان تو بڑی خوبیوں کی مالک تھیں۔ ان کا مقالہ جاں نثار اختر - حیات و فن بہترین مقالہ ہے۔ اس کا سیکنڈ ایڈیشن آنا چاہیے۔

م ش: کشور سلطان کا ادبی مزاج اور اُن کا ذہن انتخابی تھا۔ اگر ان کی عمر وفا کرتی تو یقیناً کوئی نہ کوئی ادبی کارنامہ انجام دیتیں۔ ان کا مقالہ کتابی صورت میں مقبول ہوا۔

س س: آپ کی شاعری پر ان کی شخصیت کی گہری چھاپ ہے!

م ش: ہاں ان کے انتقال کے بعد ان کی رفاقتوں کا ہر پہلو مزید روشن ہوا ہے۔

س س: لیکن ادھر آپ کے تخلیقی رویے سست گام ہوئے ہیں، کیوں؟ آپ ان کے غم کو تخلیقی قوت کا روپ بھی تو دے سکتے ہیں۔

م ش: بجا فرمایا۔ بات یہ ہے کہ تخلیق کار کو اپنے نجی مسائل میں بہت دور تک نہیں الجھنا چاہیے۔ اس سے اس کی سوچ اور فکر میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اصل میں بیوی کے انتقال کے بعد، مَیں اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر میں سرگرداں رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس سے بچوں کا اور خود میرا متاثر ہونا لازمی ہے۔ یہی سب سوچ کر میں نے ابھی کچھ ماہ پہلے شاہین کو اپنا شریک سفر بنایا ہے۔ انہوں نے میرے بچوں کے تئیں بہت جلد اپنی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔

س س: اللہ اپنا فضل فرمائے۔ انشاء اللہ آپ ان الجھنوں سے نجات پائیں گے--- کچھ اپنے عہد کے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بھی اظہار خیال فرمایئے۔

م ش: دیکھیے تغیر ارتقا کی نشانی ہے۔ نئی سوچ اور نیا رویہ، اگر اس میں اعتدال بھی ہو تو تہذیبی قدروں کی بازیافت کر سکتا ہے۔ اس لیے میں اپنے ہم عصروں سے بڑی توقعات رکھتا ہوں۔ نعیم کوثر، افتخار امام صدیقی، شہپر رسول، شاہد میر، انجم عثمانی، خالد محمود، غضنفر، ارشد عبدالحمید، یعقوب یاور، احتشام اختر، عارف عزیز، حقانی القاسمی، غلام حسین، عبدالاحد ساز، ظفر صہبائی، نور محمد یاس، ظہور منصوری نگاہ، خلیل تنویر، شاہد عزیز اور کئی لوگ ہیں جن کی تخلیقی قوتیں اظہر من الشمس ہیں۔ سینئرس میں مخمور سعیدی، زبیر رضوی اور ندا فاضلی وغیرہ نے ادب میں صحت مند رجحان پیدا کیا ہے جس کی توانائی سے انکار ممکن نہیں۔ بڑے ناموں کو دوہرانے کی ضرورت نہیں۔ میرے کالج کے سینئرس میں سیّد حنیف نقوی، یونس حسنی اور شمیم احمد جیسے genious اسکالرز تھے۔ ظاہر ہے ان سے بھی کچھ نہ کچھ حاصل کیا ہے۔

س س: کچھ اپنی شاعری کے بارے میں---؟

م ش: سیفی صاحب، اکثر اشعار میری زندگی کی سچی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض پر مجھے خود

حیرت ہوتی ہے کہ میں نے کیسے اور کیوں یہ شعر کہا! کچھ شعر میری زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کی پیشن گوئی ثابت ہوئے ہیں۔ اب آپ ہی کہتے ہیں کہ کشور کے انتقال کے بعد فکر پر جذبہ حاوی ہو گیا لیکن اصل چیز تو تخلیقیت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ فکر و جذبہ کی بغیر شاعری کا تصور ممکن نہیں، پھر بھی شعر تو اپنی معنویت سے ہی کھلتا ہے۔ شعر کا سچ بولنا میرے نزدیک بڑی بات ہے۔ میں اپنی شاعری کے بارے کیا کہہ سکتا ہوں، دوسرے کچھ کہیں تو بات ہے!

سیفی --- آپ کی زندگی کے جھروکوں سے ہم نے آپ کی شاعری کو جلوہ نما ہوتے دیکھا ہے۔ لیکن ابھی ہماری یہ گفتگو ادھوری ہے۔



س س: ہاں صاحب! اجازت ہو تو گفتگو کو کچھ اور آگے بڑھائیں۔ پچھلی نشست میں آپ نے اپنے شعری رویے کی بابت فرمایا تھا کہ شعر زندگی کی صداقت ہے۔

م ش: جی! شاعری عرفانِ ذات اور علم جستجوئے کائنات سے کس طرح بری الذمہ ہو سکتا ہے۔ تخلیقیت ان دونوں سروں کو باندھے رکھتی ہے، لہٰذا سچائیاں فن میں ضرور نمو پذیر ہوتی ہیں۔

س س: نئی نسل کے بارے میں آپ کے خیالات جاننے کا متمنی ہوں۔

م ش: نئی نسل سے اگر آپ کی مراد ۸۰ء کے بعد کے شاعروں اور ادیبوں سے ہے تو ایک بڑی تعداد نہایت جوش و خروش سے اپنی آب و تاب کا ثبوت دے رہی ہے --- لیکن ذرا سوچیے! کسی زمانے میں حرف کا کاغذ پر اُتر آنا معیار کی ضمانت سمجھا جاتا تھا، موجودہ صورت حال یہ ہے کہ نشر و اشاعت کی کوئی پریشانی نئی نسل کے سامنے نہیں ہے۔ جو کچھ دھڑتے سے چھپ رہا ہے سب کا سب معیاری نہیں ہے۔ یہ جاننے اور سمجھنے کی کسی کو توفیق نہیں ہے۔ اب نہ عبدالحق ہیں، نہ نیاز فتح پوری اور نہ اعجاز صدیقی جیسے مدیر، اور نہ ہی ادبی رسائل کے وہ تقاضے کہ جو خوب سے خوب تر کی جستجو میں نہایت شاندار تحریریں وجود میں لے آتے تھے۔

بات یہ ہے کہ فی زمانہ ادبی رسائل کی زندگی اچھے قارئین کی بدولت نہیں، بلکہ So called ادیبوں اور شاعروں کی بدولت ہے۔ اور یہ ادیب اور شاعر بھی رسائل کے صفحات پر صرف اپنا نام پڑھتے ہیں۔ اس سے کوئی غرض نہیں کہ کوئی اچھی تحریر کسی اور کی بھی رسالے کی زینت بنی ہوئی ہے۔ یہی صورت نامور ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ہے۔ البتہ وہ نئی

نسل کی حمایت بھی محض اس لیے نہیں کرتے کہ اس میں چمک موجود ہے بلکہ اپنی سرداری کو قائم کرنے کے لیے ان کے کئی شعبدوں میں سے ایک شعبدہ یہ بھی ہے۔

نئی نسل میں تحقیق و تنقید سے بھی قدرے غیر ذمہ داری کی ایک صورت اس طرح سامنے آئی ہے کہ اکثر تنقیدی تحریریں، کسی دوسری تحریروں کا چربہ معلوم ہوتی ہیں۔ تحقیق کا معاملہ تو مایوسی کی حد تک نہایت غیر ذمہ دارانہ ہے۔ اور یہ صورت حال یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اکثر اساتذہ کی سہل پسندی کا نتیجہ ہے۔

زوال پذیر سماج کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اس سماج کے نمائندہ افراد اپنی کمزوریوں کو بھی خوبیوں کی طرح پیش کرتے ہیں اور لفظ لفظ کی تجارت میں گریز نہیں کرتے۔ اپنے گرد طلسمی آئینوں کا ایک ایسا جال بنتے ہیں کہ صداقت اور حقیقت کا وجود عدم میں کھو جاتا ہے۔

س س: مگر کچھ باتیں ابھی بھی وضاحت طلب ہیں--- کیا آپ---

م ش: (بات کاٹ کر) بس! اب یہیں تک رہنے دیجئے۔ پھر کبھی---

س س: اچھا بس ایک بات اور--- یہ کہ آپ اردو کے استاد رہے ہیں۔ شاعر و ادیب اور محقق، ناقد بھی ہیں، درس و تدریس کے پیشہ سے منسلک ہونے کے باوصف آپ کی موجودہ حیثیت ایک ایڈمنسٹریٹر کی بھی ہے۔ غالباً مدھیہ پردیش میں تو اردو کے اساتذہ میں سے آپ پہلے شخص ہیں جو---

م ش: (بات کاٹ کر) دیکھیے! میری جو بھی حیثیت ہے وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ عہدے وبدے معیشت کے بہانے ہیں اور طلسمی خواب ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہی ہے کہ مجھ جیسے نالائق کو اپنے بزرگوں اور استادوں کی جوتیوں کے طفیل جو کامیابیاں ملی ہیں وہ محض اللہ کی فضل کی بنا پر ہیں، کسی خوبی اور صلاحیت کی بنا پر نہیں۔

دوسری بات یہ کہ! شاعر و ادیب اور محقق و ناقد کے لاحقے دراصل میرے ساتھ زیادتی ہے کہ میں بساط بھر کچھ لکھنے پڑھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں لیکن آج تک کوئی حرف ایسا وجود میں نہیں آیا کہ مجھے اس پر اطمینان ہو یا تفاخر ہو۔ اگر میرا کوئی ادبی وجود آپ سمجھتے ہیں تو یہ محض آپ کا حسن ظن ہے۔ اور اللہ کا انعام! اور بس!!

☆☆☆☆

MIND BURNS

By Professor Mukhtar Shamim

At Desolate dusk , wrapped in dead silence,
Every moment giving an infernal feeling,
Mind on tenterhooks in all blaze,
The sensitive wounds get a glow,
The heart stews in its own blood,
The heart-beats, sinking down in the breast.
Every man is reduced to a cross;
City is a seen of slaughter, rather than habitation,
For strewn all over are the dead suppressed desires;
And the hopes and aspirations hanged here & there.
The soul, drooping like a wing-broken bird,
Flutter, helplessly into the prison of the body.
At desolate dusk, wrapped in dead silence,
Every moment giving an infernal feeling -
Thoughts thus burning in a smouldring fire.

(Transtalated from Urdu by A.M. Khan "Jameel")

غزلیں

ہجرتیں بے سائباں ہیں اور گھر ناآشنا
شہرِ ناپُرساں کے بھی دیوار و در ناآشنا

تھا تعلق کا گماں جس شخص پر ناآشنا
وہ ہمارا آشنا تو ہے مگر ناآشنا

ایک شامِ انتظار آنکھوں میں کٹ کر رہ گئی
آج تک جویائے غم ٹھہرے سحر ناآشنا

وسعتِ غم کے لئے تو دشت و صحرا اک قدم
حیف اِس دیوانگی پر ہے سفر ناآشنا

اِک صدائے دشت نے ہم کو پکارا ہے شمیمؔ
گویا اپنے واسطے ہے اپنا گھر ناآشنا

☆

قصۂ درد بھی ہے، شورشِ افکار بھی ہے
میرا اسلوبِ سخن حکمتِ گفتار بھی ہے

کوئی چہرہ تو ہے اب جو پسِ زنگار بھی ہے
آئینہ دیکھئے صاحب! مرا کردار بھی ہے

کیا ہنر مند ہے، کس طور تراشے ہیرا
نکتہ چیں ہے تو وہی میرا طرفدار بھی ہے

شام ہوتے ہی کھلا - دودِ چراغِ مفلس
یہ مرا درد بھی ہے، میرؔ کا آزار بھی ہے

ہائے تہذیبِ تمنا کا نیا دور شمیمؔ
برق رفتار بھی ہے، "آئینہ دیوار بھی ہے"

☆

غزلیں

اگر اک آبلہ پا جلتے صحرا سے گزر آئے
کوئی نقشِ قدم تو آبگینوں میں نظر آئے

وہ شامیں مہکی مہکی سی، وہ راتیں بہکی بہکی سی
کئی جگنو انھیں لمحوں کے پس منظر نظر آئے

نہ جانے کیسا قصہ تھا، کہانی کیا کہانی تھی؟
کہ اس کے بعد صحرا بھی سمندر ڈوب کر آئے

یہ ان کا حکم تھا، تقدیر تھی یا نارسائی تھی
ہم اپنے سارے ارمانوں کو آخر دفن کر آئے

تمہاری رہ گزر جاناں! بہر صورت بہر جانب
کہیں بھی لوٹ کر جائیں تمہاری رہ گزر آئے

کسی کے لمس نے دی اور بھی زخموں کو تابانی
کسی کی چاہتوں کے دل میں کیا نشتر اُتر آئے

تھکی ہاری امیدوں میں خیال جانفزا اُس کا
کہ جیسے اک مسافر شام ہوتے اپنے گھر آئے

کچھ ایسے ڈولتا ہے دل طبیعت کی روانی میں
کہ جیسے چھوڑ دیں کاغذ کی کشتی بہتے پانی میں

کبھی لشکر غموں کا ہے کبھی فتنے تمنا کے
عجب کہرام برپا ہے یہ دل کی راجدھانی میں

کھلا جب آخری در گنبدِ بے در میں نیند آئی
پھر اس کے بعد کیا تھا شاہزادے کی کہانی میں

ک
فِ افسوس ملتے ہیں تماشا دیکھنے والے
شناور کو گہر ملتے ہیں آخر گہرے پانی میں

شمیم اک چیز اپنے پاس تھی سو وہ بھی چھوڑ آئے
ہم اپنی زندگی دے آئے ہیں اس کو نشانی میں

☆

نغمۂ ہجر

(C.Kingsley) کی تخلیق اے فیر ویل (A Farewell) کے تناظر میں کہی گئی ہے، کچھ حصہ آزاد ترجمہ ہے اور کچھ حصہ اضافی ہے

مختار شمیم

اے مرے لختِ جگر، جانِ پدر، نورِ نظر!
کس طرح تیری جدائی ، میں گوارا کرلوں؟
تیرے مستقبل رنگیں کے لئے آج مگر -
صبر کے نام کا سینے پہ میں پتھر رکھ لوں!
اے مرے نورِ نظر، لختِ جگر!
دل یہ کہتا ہے کہ وقتِ رخصت
میں کوئی تحفہ تجھے نذر کروں
تیری خواہش ہے کہ نغمہ چھیڑوں
بربطِ دل پہ کوئی گیت کہوں
کس طرح آج کوئی گیت سنا پاؤں گا
کیسے احساس کی تلخی کو مٹا پاؤں گا
دور تک شام ہے، سائے بھی ہیں، تنہائی ہے
زندگی مجھ کو یہ کس موڑ پہ لے آئی ہے
تیری فرقت کے تصور سے مرے لختِ جگر
دل بھی بے چین ہے اور روح بھی گھبرائی ہے
ہاں! مگر جانِ پدر! لختِ جگر---
وقتِ رخصت میں تجھے تحفہ گراں نذر کروں
بربطِ دل پہ کوئی گیت کہوں
تیری خواہش ہے کہ دلکش کوئی نغمہ گاؤں

ہاں وہی نغمہ----کہ
جس کے لئے ہر صبح نسیم-
غنچہ وگل سے سجا دیتی ہے صحن گلشن
ہاں وہی نغمہ!
کہ اک شاعر رنگین بیاں
اپنی تخلیق کی تحسین میں ہر وقت مگن
یہ وہ نغمہ ہے کہ اس کی ہر لے
زندگی کے ہیں نشیب اور فراز
(آج تو جان لے یہ زیست کا راز)
غم کے مضراب سے تو چھیڑے اگر سازِ حیات
عشق کی لے پہ تمناؤں کے سُر جاگ اٹھیں
زندگی رقص کرے، کیف خودی میں ڈوبے
نغمہ عشق فضاؤں میں بکھر جانے دے!
زندگی غم سے سنورتی ہے سنور جانے دے!

اے مرے لختِ جگر، نورِ نظر!
میں تجھے تحفہ گراں نذر کروں
نغمہ ہجر کو مضراب بھی دوں
یعنی دردِ دلِ بیتاب کہوں!

☆☆

ایک مونولاگ

جب دن کی اُجلی چادر میں سجتے ہیں دھوپ کے پھول کہیں

جب رات کی بانہوں میں چندا سمٹا ہوا بیٹھا رہتا ہے

--اور تارے کھِل کھِل ہنستے ہیں!

جب چاندنی شرما جاتی ہے

جب شاخِ گل پر پھول امنگوں کے انگڑائیاں لے کر جاگتے ہیں

مدہوش پَوَن اِتراتی ہے!

جب سانجھ سویرے پنچھی میٹھے گیت سناتے ہیں

جب ریشمی نرم پھواروں میں کچھ تپتے جسم نہاتے ہیں

جب شوخ ادا، کچھ شوخ حسیں فطرت کے رنگ چراتے ہیں

جب صبح نویلی آتی ہے

جب دن کا جادو بولتا ہے

جب رات کی رانی مہکتی ہے

تب ذکر تمہارا ہوتا ہے

سب یاد تمہیں کو کرتے ہیں!!

☆☆

''آزادی کے بعد مدھیہ پردیش میں اردو شاعری

ایک سرسری جائزہ

مختار شمیم

آزادی کے حصول اور صوبہ مدھیہ پردیش کی تشکیل کے دوران تقریباً نو سال کا وقفہ ہے۔ اسی طرح صوبہ مدھیہ پردیش کی دوبارہ تقسیم اور نئے صوبے مدھیہ پردیش کے وجود میں آنے کا واقعہ نیا نیا ہے۔ اب اگر آزادی کے فوراً بعد وسط ہند کے علاقوں کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو بھی کوئی ہرج نہیں ہے۔ البتہ نئے صوبہ کی حدیں بہت کچھ سمٹ گئی ہیں تاہم اردو کے اہم مراکز اسی صوبہ کا حصہ ہیں۔

۱۹۴۷ء سے ۵۶-۱۹۵۵ء تک وسط ہند میں اردو مزاج حاوی رہا اور اردو تہذیب کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا۔ اس کا بیّن ثبوت رتلام، اندور، اجین، بھوپال، برہانپور، کھنڈوہ اور سرونج میں برپا ہونے والے کل ہند مشاعروں کی مقبولیت ہے۔ خصوصاً رتلام کے کل ہند مشاعرے اپنی مثال آپ تھے جن میں فراقؔ، جوشؔ اور جگرؔ جیسے اس دور کے تمام سربرآوردہ شعرا کی شرکت ان مشاعروں کا کامیابی کی ضامن کہی جاسکتی ہے۔ میں نے اپنی اوائل عمری میں دیگر شہروں اور قصبوں سے عام شائقین شعر و ادب کی ایک بڑی تعداد کو رتلام کے مشاعروں کی طرف اس طرح کوچ کرتے دیکھا ہے، جیسے کسی مذہبی اجتماع یا اُتسو میں شرکت کے لیے آج لوگ دوڑ لگاتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ودیشہ اور گنج باسودہ جیسے علاقے بھی جو اردو تہذیب سے قدرے مختلف رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، کسی زمانہ میں اردو مشاعروں کے انعقاد کے لیے جانے جاتے تھے۔ اندور کو تو آج بھی مشاعروں کا شہر کہا جاتا ہے۔

رتلام، اجین اور بھوپال سے شعری گلدستوں کی اشاعت نے بھی اردو شاعری کی روایتوں کو قائم رکھا اور ان میں شامل ہونے والی طرحی و غیر طرحی غزلوں نے اپنے قارئین کی ادبی و شعری تشنگی کو سیراب کرنے کا سامان بہم پہنچایا۔ ظاہر ہے کہ مدھیہ پردیش کی تشکیل کے وقت شعر و سخن کی آبیاری میں اور اس کی ترقی میں مشاعروں کا بڑا حصہ تھا۔ مختلف شہروں میں شعر و سخن کی محفلوں کا انعقاد، مختلف ادبی تنظیموں اور سوسائیٹیوں کا رہین منت تھا کہ ان کے ماتحت جو بزم سخن وجود میں آئی وہ اپنا کوئی نہ کوئی نصب العین بھی ساتھ لائی۔ لیکن اس دور میں بہرحال غزل کی ادائیں ہی اپنا جادو بکھیرتی رہیں۔ اردو شاعری کی دیگر اصناف کی طرف توجہ کم کم تھی۔ البتہ قطعہ نگاری اور رباعی غزل کے پہلو بہ

پہلو چلتی رہیں۔ رباعی چونکہ ذرا مشکل صنف تھی اس لیے آہستہ آہستہ قطعہ نگاری اس پر حاوی ہوتی رہی۔ مسدس و مخمس کی شکل میں بھی نظمیں وجود میں آتی رہیں۔ پابند نظموں کا عام طور پر رواج تھا۔ علامہ اقبال کی لے کا اثر تھا کہ گاہے گاہے فکری اور نیچری نظمیں بھی سامنے آتی رہیں۔ لیکن داغ، سیماب اور جگر کی غزل نے سماں باندھے رکھا۔ شاداں اندوری، شعری بھوپالی، نسیم بھوپالی، شفا گوالیاری، شہاب اشرف، ادا شنکر شاداں گوالیاری، حسرت قریشی، نور جبلپوری، اور ایسے کئی شعرا ہیں کہ جن کے یہاں داغ اور بالخصوص سیماب اور جگر کے واضح اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ البتہ فراق کا رنگ جس شاعر کے یہاں چمکا ہے اس کی غزل نے ضرور سنبھالا لیا ہے۔ ابو محمد سحر، وقار واثقی اور کسی حد تک شوق ماہری، ناطق مالوی اور صادق اندوری وغیرہ اس فہرست میں شامل ہیں۔ اختر سعید خاں اور کیف بھوپالی کی غزل بھی قدرے مختلف مزاج کی تھی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

ڈاکٹر محمد نعمان خاں نے بھوپال میں اُردو نظم گو شعراء کا ذکر کرتے ہوئے بعض ان معروف شعرا کی نظم نگاری کی طرف بھی اشارے کیے ہیں کہ جن کی پہچان صرف اور صرف غزل کے توسط سے کی جاتی ہے۔ تاہم انہوں نے گوپی کرشن شوق کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ یہ وہ شاعر ہے جس نے اپنی طویل نظم "جمیلہ" کے ذریعہ شہرت پائی تھی۔ شوق نے اپنی اس نظم میں بین الاقوامی سیاسی تہذیبی مسائل کو پیش کر کے اردو نظم کو موضوعاتی وسعت بخشی۔ اسی طرح کبیر کوثر اور کیف بھوپالی نے قرآن پاک کا منظوم ترجمہ پیش کر کے اردو کے دامن کو وسیع کیا ہے۔ قاضی وجدی الحسینی جو بھوپال کے ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے ایک تھے، انہوں نے سیرت پاک کو نظم کر کے نعتیہ شاعری کے سرمایہ میں اضافہ کیا ہے۔ ارشد صدیقی اور صادق اندوری نے انگریزی کی کئی شاہ کار نظموں کو اردو کا قالب پہنایا۔ ان کے یہ کارنامے قابل قدر ہیں۔

یہی وہ زمانہ ہے کہ ترقی پسندی اپنے عروج پر تھی۔ بھوپال اس تحریک کا ایک مرکز بن چکا تھا۔ جاں نثار اختر تو بمبئی چلے گئے تھے لیکن ان کے ہم نشین اختر سعید خاں، اظہر سعید خاں، کیف بھوپالی، عمیق حنفی، عزیز اندوری بھی اس رنگ میں رنگ چکے تھے۔ کچھ شعرا ترقی پسند تحریک سے اپنا رابطہ تو قائم کیے رہے لیکن وہ طریق راسخ پر چلنا بھی پسند کرتے تھے۔ تاہم ترقی پسند تحریک کے زیر اثر وجود میں آنے والی تخلیقات کھلی فضا میں سانس لینے کے مترادف تھیں، پھر یہ بھی ہوا کہ جمالیاتی احساس کی بنیاد پر اسی راہ سے ایک اور راہ نکلی اور نئے مزاج کی غزل سامنے آئی۔ آزاد اور معریٰ نظموں کا سلسلہ بھی چل نکلا، ہیئت و مواد کے تجربے نئے اذہان کو نئے زمانوں کی خبر دینے لگے۔ گو کہ یہ نیا مزاج بھی ترقی پسندی کا ہی رہین منت تھا ایک طرح کی Urge تھی جو ان کی خوش فکری کو نئی

معنویت سے آشنا کرنا چاہتی تھی۔

گزشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں، مَیں بی۔اے۔کا طالب علم تھا۔ مجھے یاد ہے استاد محترم گیان چند جین صاحب اکثر اپنے لکچر کی ابتدا میں محمد علی تاج کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

تمہاری بزم کے باہر بھی ایک دنیا ہے
مرے حضور! بڑا جرم ہے یہ بے خبری!

محمد علی تاج کا یہ شعر گویا اپنے عہد کے شعری رویوں کی طرف واضح اشارہ ہے۔ تخلیقیت کی نئی امنگ اور نئے آسمانوں کی تلاش میں اپنی طاقت پرواز کا احساس بھی دلاتا ہے۔ چنانچہ جہاں ایک طرف شعری بھوپالی، باسط بھوپالی، اسد بھوپالی، وکیل بھوپالی، شاداں اندوری، تاباں اندوری، کاشف اندوری، حسرت قریشی، شاداں گوالیاری، میر عرفانی، ندرت رتلامی وغیرہ غزل کے جلووں میں کھوئے ہوئے تھے وہیں عشرت قادری، صادق اندوری، ناطق مالوی، ارشد صدیقی، کیف بھوپالی، مقصود عرفان، مقصود عمران، راہی قاسمی، جے کرشن چودھری حبیب وقار واثقی وغیرہ ہم غزل اور نظم دونوں کا فکری مزاج بنانے مین مصروف تھے۔ یہ شعرا شعر وسخن کے حوالے سے زندگی کو سمجھنے کی سعی میں مصروف تھے۔ گو فکر وفن کے مروّجہ سانچوں پر ضرب کاری لگانا اتنا آسان نہیں تھا لیکن محمد علی تاج انہیں شعرا کی صف میں سے آگے بڑھے اور غزل کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کر گئے۔

پیچھے بندھے ہیں ہاتھ مگر شرط ہے سفر
کس سے کہیں کہ پاؤں کے کانٹے نکال دے

تاج کا شعری سفر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر شروع ہوا۔ ان کی شاعری میں وابستگی کے تمام علائم موجود ہیں لیکن ان کی آواز اور ان کا لہجہ خلاّقانہ بصیرت کے باعث اپنے معاصرین میں منفرد کہلائے جانے کا استحقاق رکھتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اختر سعید خاں، اظہر سعید خان، کیف بھوپالی، ساحر بھوپالی، راہی قاسمی، ابو محمد سحر عشرت قادری، اختر نظمی، مقصود عرفان اور ارشد صدیقی، نصیر پرواز، وحید پرواز وغیرہ نے اردو غزل کو نئی بصیرتوں اور نئے تلازموں سے آشنا کیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں ایک حد فاصل بھی قائم ہے۔ جبکہ مظفر حنفی، عمیق حنفی اور وقار واثقی، ندا فاضلی اور فضل تابش نے ان تمام حدوں کو پار کرلیا ہے اور اپنی تخلیقی قوتوں کا ثبوت دیا ہے۔

اسی طرح اردو نظم کو نئی جہت دینے والوں میں عمیق حنفی، عزیز اندوری، کبیر کوثر، نسیم انصاری، رہبر جونپوری، عتیق اللہ، فضل تابش کے نام شامل ہیں۔ انہوں نے فکر ومواد کے علاوہ ہیئتی

تجربوں کو بھی آزمایا ہے۔

یاور رائے پوری اور سیف الدین ملک نے اردو مرثیے کے احیا میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ بالخصوص سیف الدین ملک جدید مرثیے کے ہم نواؤں میں سے ایک ہیں۔ نئی نسل میں یہ فریضہ ابراہیم اشک نے انجام دیا ہے۔

یہ بات اہم ہے کہ صوبہ مدھیہ پردیش کی تشکیل اور بعد کے چند برسوں تک شعر و ادب میں ترقی پسندی کی گونج قائم رہی لیکن اسی منظر نامے سے تخلیقیت کی ایک نئی کرن پھوٹی، جس نے جدیدیت کے اُجالوں کو عام کیا۔ جدید ادب دراصل جدید حسیت اور عصر تقاضوں کی دین کہا جا سکتا ہے۔ شعریت نے تخلیقیت کے جواز کے لیے پیکریت، استعاریت اور اشاریت کا سہارا لیا۔ شعرا کا ایک گروہ تو وہ تھا جو زبان و بیان کے چٹخارہ اور زیادہ سے زیادہ رعایت لفظی کی حد تک اپنی استادی کا سکہ جمائے ہوئے تھا۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو زندگی کو وابستگی کی قیود سے آزادی کو تلاش کر رہا تھا۔ تیسرا گروہ لفظ لفظ کی مترنم فضا میں اور جمالیات کے آئینوں میں خوابوں اور خیالوں کی حسین دنیا سجائے ہوئے تھا۔ تاہم اسی نظریاتی فضا میں شعور اور لاشعور کی سطح پر جو آوازیں اُبھریں، انہوں نے اپنے خلاقانہ رویوں اور بصیرتوں کے جھماکوں سے وہ چکا چوندھ پیدا کی کہ ایک عرصہ تک رنگوں اور مزاجوں کو ممیز کیا جانا کارِ دشوار ٹھہرا۔ میں اس موقعہ پر جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی بحث سے قطع نظر محض تخلیقیت کی ہی بات کرنا چاہتا ہوں۔ یوں بھی میرا مطالعہ محدود ہے اور مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس ہے لیکن ۸۰ء سے پہلے جو نسل سامنے آئی اس کا ادراک اور شعور بالیدہ تھا اور یہ شعرا عالمی ادبی رجحانات سے بھی بخوبی واقف تھے۔ چناں چہ اس فہرست میں چند نام تو وہ ہیں جو بہت پہلے سے شہرت پا چکے تھے تاہم وہ نئے خیالات اور نئے رجحانات کو نہایت فراخدلی سے قبولیت کی سند عطا کر رہے تھے۔ وقار فاطمی، دلکش ساگری، مظفر حنفی، عمیق حنفی، وقار واثقی وغیرہ ان میں شامل ہیں لیکن اسی زمانے میں ندا فاضلی، صادق، عتیق اللہ، فضل تابش، اجلال مجید، نجیب رامش، ظفر صہبائی نے اپنی تخلیقی قوتوں اور بصیرتوں کا پُر اعتماد اظہار کیا اور ایک پوری نسل کو متاثر کر گئے۔ انہیں شعرا کے قدم بقدم آفتاب عارف، واجد قریشی، شاہد میر، خالد محمود، رشید امکان، نور محمد یاس، شکیل گوالیاری، سلیم انصاری، ابراہیم اشک یعقوب یاور، بسمل نقشبندی، سیفی سرونجی اور طہور منصوری نگاہ، انجم بارہ بنکوی کے نام مدھیہ پردیش کے ادبی منظر نامے کو خوشگوار رنگ عطا کرتے ہیں۔

اگر مجھے اپنی بات دوہرانے کی اجازت دیں تو عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عمیق حنفی، عتیق اللہ، مظفر حنفی، فضل تابش، ندا فاضلی، صادق موتی وغیرہ نے اردو شاعری میں نئے امکانات پیدا کیے،

انہوں نے شعری حسیت کو نئی معنویت سے آشنا کیا، ہیئت، مواد اور زبان کی حد تک ان کے تجربے ان کی آگہی اور بصیرت کا ثبوت ہیں۔ عزیز اندوری نے بھی ہیئتی نظمیں لکھی ہیں۔ شکیل گوالیاری، احمد کمال پروازی، یعقوب یاور، واجد قریشی، نور محمد یاس اور رشید امکان نے غزل کی حسیت اور دوروں بینی کے رمز سے آشنا کیا۔ اجلال مجید، نجیب رامش، ظفر صہبائی کی پُر اعتماد آوازیں نئی شاعری کو نئی قدریں عطا کرتی ہیں۔ ظفر صہبائی نے نثری غزل اور نور محمد یاس اور طہور منصوری نگاہ نے رباعی کے فن کو نئے افق دیئے ہیں۔ وقار واثقی، ندا فاضلی، کوثر صدیقی، شاہد میر، ابراہیم اشک اور اختر نظمی نے اردو میں دوہا نگاری کے ذریعہ سے بھی اپنی صلاحیتوں کا بامعنی اظہار کیا ہے۔ ندا فاضلی اور شاہد میر کے گیت اردو و ہندی دونوں ہی زبانوں کے مانوس رنگوں کا نچوڑ ہیں۔ مظفر حنفی کا لب ولہجہ آج بھی تازہ کار ہے اور اپنی کاٹ میں ہیرے تراشتا ہے۔ فضل تابش اور عتیق اللہ کی آگہی نظم وغزل کو نیا شعور بخشتی ہے، غیر مانوس الفاظ نئی معنویت کی چمک پا کر جاگ اٹھتے ہیں۔ صادق کی شاعری میں بھی ہم عصر زبانوں کے الفاظ ان کے اپنے تجربوں سے گزرتے ہیں۔ اجلال مجید کی غزل ایک نئے احساس سے آگاہ کرتی ہے۔ ناانصافی ہوگی اگر یہاں بشیر بدر کا ذکر نہ کیا جائے کہ وہ بہرحال اردو غزل کی ایک طاقتور آواز ہیں۔

نئی نسل میں آفتاب عارف اور احمد کمال پروازی نے استعارہ کے عمل سے شعر کو خوبصورت پیکر عطا کیا ہے۔ واجد قریشی، نور محمد یاس اور رشید امکان ایمائیت، پیکریت اور اشاریت سے کام لیتے ہیں۔ شاہد میر سلیم انصاری، خالد محمود، سیفی سرونجی راحت اندوری، ابراہیم اشک اپنے تخلیقی مظاہر سے کامیاب ہیں۔ لہٰذا یہ فیصلہ کرنا چنداں دشوار نہیں کہ آزادی کے بعد مدھیہ پردیش کا شعری منظر نامہ یقیناً نہایت روشن اور تابناک ہے۔



عنایت نامے بنام مختار شمیم

Gian Chand Jain
23 Nevada
IRVINE - CA 92606
USA

۲۲ر مئی ۲۰۰۱

عزیزی مختار شمیم سلمہٗ شاد باشید

تم نے بہت صرفہ کر کے مجھے اپنا بیش بہا مجموعہ تناظر اور تشخص بھیجا۔ اس کے لیے مشکور ہوں۔ انتساب سے یہ دل دہلانے والی خبر ملی کہ عزیزہ کشور سلطان کا اس کم سنی میں انتقال ہو گیا۔ استاد کے سامنے شاگرد کا مرنا ایسا ہے جیسے باپ کے سامنے بیٹے کا اٹھ جانا۔ تمہاری عمر بھی ابھی زیادہ نہ ہوگی، کشور اور بھی چھوٹی رہی ہوں گی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے انہیں بھی پڑھایا ہے کہ نہیں، بہر حال شاگرد کی اہلیہ خود بھی شاگردہ ہے۔ ان کا جاں نثار اختر کا مقالہ بہت اچھا تھا۔ ع 'نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں۔۔۔۔۔۔قرار ہوں' غزل ظفر کی نہیں مضطر خیر آبادی کی ہے۔ اس کی سند میں کشور کے مقالے کے ایک اندراج ہی سے دیا کرتا تھا۔

تمہارا مقالہ ظہیر دہلوی بڑے اچھے موضوع پر بڑا پختہ کام تھا۔ مجموعے میں اپنے مضمون قصہ ممتاز کے سلسلے میں میری جو تصحیح کی ہے اور نخجانہ جاوید سے یوسف علی خاں عزیز کا اعتراف درج کیا ہے اس سے میری معلومات میں اضافہ ہوا۔ تم تو اس موضوع کے ماہر ہو۔

تم نے مدھیہ پردیش کی درس گاہوں میں اردو تحقیق اور ذکر احتشام میں میرے لئے جو اچھے الفاظ استعمال کئے ہیں یہ تمہاری سعادت مندی ہے۔

دیباچہ میں تمہاری نثر اور طریقہ اظہار کی پختگی دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اب تم بہت اچھی اردو نثر لکھنے پر قادر ہو۔

میں نے مجموعے کے اکثر مضامین کو سرسری طور پر دیکھ لیا ہے۔

دعا ہے کہ تمہیں رفیقہ حیات کے بچھڑ جانے کے صدمہ عظیم کو برداشت کرنے کی طاقت اور سکت مل سکے۔

بشرط حیات میں آئندہ ستمبر اکتوبر میں ہندوستان اور بھوپال جانے کا رکھتا ہوں۔ یہ میرا ہندوستان کا آخری سفر ہوگا۔ اب (۱/۲) ۷۸ سال کا پیر فرتوت ہو گیا ہوں۔ امید ہے تم بخیر ہو گے۔

دعا گو

گیان چند

1/3/1989

محب مکرم تسلیم

ایک مدت سے آپکی طرف سے کوئی خبر نہیں آئی۔ پرماتما کے رحم وکرم سے آپ کی خیرو عافیت سے اطمینان قلبی رکھتا ہوں۔

گذشتہ ایام میں ایک نئی فہرست اپنی کتابوں کی جاری کی ہے۔ پہلے آپ ہی کو بھیجی ہے آپکا جواب آنے پر ہی دوسری جگہ بھیجوں گا۔

میں نے چار سال پہلے جب مَیں اپنی عمر کے ساٹھویں سال میں تھا، عمر اور صحت کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا تھا کہ آہستہ آہستہ اپنی لائبریری ٹھیک ٹھکانوں پر پہنچادوں گا۔ میں یہ نادر وعظیم الشان کتب خانہ جو اپنے عروج کے زمانے میں ۲۲ر ہزار سے زائد کتابوں اور لگ بھگ دس ہزار رسالوں پر مشتمل تھا، بڑی محنت، مشقت اور صرف زر سے اکٹھا کیا تھا۔ اس کی تخریب کاری میں اب جو صدمہ مجھے پہنچ رہا ہے اُسے مَیں ہی جانتا ہوں۔ مگر اس سرائے فانی میں تعمیر وتخریب کا عمل دوامی ہے۔ اب تک چار سالوں میں ۹-۱۰ ہزار کتابیں نکال چکا ہوں۔ یہ قدیم و جدید کتابیں، جن میں قدیم زیادہ ہیں اور جدید کم، دوبارہ ڈھونڈنے سے نہیں ملیں گی۔ مگر ان کا نہ ملنا ہی اچھا ہے۔ جب ان کا پڑھنے والا کوئی نہ رہے گا تو ان کا سنبھال کے رکھنا بھی کیا معنی۔ بہرحال آپ میرے اس بیان کو میرے کرب ذہنی سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

دو ایک کتابیں پریس میں ہیں۔ جلد بھیجوں گا۔ اگر آپ نے ان میں سے کچھ کالج لائبریری کے لیے انتخاب کیں تو ان کے ساتھ بھیج دوں گا۔

گھر میں آداب کہیے۔ میری صحت گذشتہ تین ماہ سے سخت مخدوش ہے۔

مخلص

کالی داس گپتارضا

☆

۱۸ر فروری ۲۰۰۳ء

برادرم مختار شمیم، سلام علیکم۔

آپ کا خط مورخہ ۱۲ دسمبر ملا تھا۔ میں بیماری کے باعث مدتوں پڑھنے لکھنے سے قاصر رہا۔ آپ نے سحر صاحب پر لکھنے کے لیے چار، پانچ ماہ کا وقت دے دیا، یہ بڑا کرم کیا۔ جیسے ہی صحت اجازت دے گی میں لکھ دوں گا۔ بلکہ میں کچھ نہ کچھ لکھنا شروع ہی کردیتا کیوں کہ ان کی بیگم صاحبہ

نے ان کا آخری مجموعہ کلام اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ مجھے بھجوادیا تھا۔ تنقیدی مضامین پر سرسری نظر ڈالی ہی تھی کہ معلوم ہوا کہ اس میں بہت اہم باتیں ہیں۔ اور بعض تو ایسی ہیں جنھیں اس وقت کوئی جانتا اور سوچتا بھی نہ تھا جب وہ مضامین لکھے گئے تھے۔ میری حماقت اور نالائقی کہ میں نے وہ کتاب کہیں رکھ دی کہ ذرا ٹھیک ہو جاؤں تو توجہ سے پڑھوں گا۔ اب یاد نہیں آرہا ہے کہ کہاں رکھ دی۔ ہزاروں کتابوں میں کسی غلط جگہ پر رکھ دی جائے بھلا کہاں سے ملے گی۔ لیکن میں تلاش میں ہوں۔ فی الحال آپ میری اتنی خدمت کیجیے کہ ان کی بیگم صاحبہ کو میرا اسلام اور شکریہ پہنچادیجیے، کتاب اگر ہاتھ نہ آئی تو میں خرید لوں گا کیوں کہ لکھنا مجھے اسی کتاب پر ہے۔ اور انشاء اللہ یہ میں نے وعدہ خود سے کیا ہے اور اسے ضرور پورا کروں گا۔

آپ کا

شمس الرحمٰن فاروقی

☆

عزیزم مختار شمیم تسلیم و تصدق

میں اپنے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ اس میں آپکا یہ لفافہ ملا آپ یاد آئے اور ظہیر دہلوی پر آپکی کتاب جو چھاپی جا چکی ہے اگر چہ اُسے مطبوعہ صورت میں دیکھنے کی تمنا میرے دل میں باقی ہے اس پر اظہار مسرت کر کے کہ میرے عزیز دوست ڈاکٹر قمر رئیس کی سعی و توجہ پر اسکی اشاعت عمل میں آئی ایسی اچھی کتاب کے شایع ہونے پر ایک بار پھر تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔

خدا کرے تم ہر طرح مع الخیر ہو، آمین۔

تنویر احمد علوی

20/11/91

دہلی

☆

24-11-200

محترمی،

آداب عرض ہے

آپ کی کتاب تناظر اور تشخص وصول ہوئی ممنون ہوں اس میں آپ نے میری تنقید نگاری پر بھی تبصرہ کیا ہے جس کے لئے شکریہ ادا کرتی ہوں۔

چند روز قبل آفاق صاحب سے دلّی کے سیمینار میں ملاقات ہوئی تھی آپ کی خیریت انھیں

سے دریافت کی۔ کتاب پر جو نیا پتہ لکھا ہے اسی پر یہ خط بھیج رہی ہوں۔ اخبار سیاست نے آپ کا مضمون اپنے ادبی ایڈیشن میں شائع کیا ہے اس کا تراشہ مرسل خدمت ہے، میں نے اُن لوگوں سے کہا ہے کہ وہ آپ کو مضامین لکھنے کے لئے خط لکھیں پتہ بھی دے دیا ہے۔ میں تو اکتوبر ۹۲ء سے ''ادب عالیہ'' کے زیر عنوان ہر دوشنبہ کے ادبی ایڈیشن میں کسی ادبی شخصیت پر برابر لکھ رہی ہوں۔ خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں احمد مہدی صاحب سلام عرض کرتے ہیں۔ فقط

سیدہ جعفر

عزیز محترم اسلام علیکم

نوازش نامہ مورخہ ۲۷ اکتوبر ۹۳ آج ملا، مسرت ہوئی۔

فخر الدین مرحوم ناظم سیفیہ کالج کی یاد میں ''فخر نامہ'' کی اشاعت کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ اس میں ایک حصہ بھوپال سے متعلق مضامین کا ہوگا۔

اسی کے لئے آپ سے بھوپال سے متعلق مضمون کی فرمائش کی ہے۔ جس موضوع پر قلم اٹھائیں اس میں بھوپال کی بھرپور نمائندگی ہو۔ بھوپال اور غالب ہو یا بھوپال اور اقبال یا بھوپال کی تعلیم گاہیں ہو یا بھوپال کی نثری خدمات یا جو آپ پسند فرمائیں۔

مضمون ۱۵، ۲۰ نومبر تک مجھے مل جائے تو کام آسان ہو جائیگا۔

ڈاکٹر کشور بھی بھوپال سے متعلق کوئی مضمون لکھتیں تو مجھے بے حد مسرت ہوتی۔ انھیں میری طرف سے بہت ساری دعائیں کہیں۔

آپ کا

عبدالقوی دسنوی

۳۰ اکتوبر ۹۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Professor
Nisar Ahmed Faruqi
(University of Delhi)
Post Box No. 9723
Jamia Nagar, New Delhi-110025
Tel: 6834067
EM: faruqi@vsnl.com

۱۷ مئی سنہ دو ہزار ایک

برادرم ڈاکٹر مختار شمیم، سلام و رحمۃ

آپ کی کتاب "تناظر اور تشخص" کا ایک نسخہ ڈاک سے ملا۔ نہایت ممنون و مسرور کیا اس ادبی سوغات نے تو خوشی ہوئی، اس پر مزید یہ کہ آپ کے والد صاحب کی محبت اور نوازش کی یاد تازہ ہوگئی۔

آپ کا کلام منظوم تو رسالوں میں دیکھتا رہا ہوں، اب یہ مضامین دیکھ کر آپ کے ادبی ذوق کا نثر میں بھی اندازہ ہوا۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

مضامین ابھی سرسری دیکھے ہیں، فرصت ملنے پر پڑھوں گا۔ نام اگر اتنا '' گاڑھا'' نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ اب اردو کو جہاں تک ہو سکے عربی فارسی کی اونچی مسند سے اتارنا ہی بہتر ہوگا۔

بعض اغلاط کمپوزنگ کی بھی نظر آئیں۔ مگر کتابت کی غلطی تو اردو کا ورثہ ہے۔

ایک بار پھر دعائیں، مبارکباد اور شکریہ۔

مخلص

نثار احمد فاروقی

ڈاکٹر مختار شمیم

بڑواہہ (مدھیہ پردیش)



10-12-2001

برادرم مختار شمیم صاحب مکرم

'تناظر اور تشخص' کا ایک نسخہ ملا۔ شکر گزار ہوں۔

اسکے لئے بھی آپ نے اس خاکسار کو یاد رکھا۔

چند مضامین اہم موضوعات پر ہیں اور میری دلچسپی کے ہیں، ضرور پڑھوں گا۔ انتساب دیکھ کر ڈاکٹر کشور سلطان کی یاد آ گئی۔ کیسی جوان عمری میں وہ آپ سے اور بچوں سے جدا ہوگئیں۔ امید ہے کہ آپکے بچے اب بڑے ہوگئے ہونگے اور سعادت مند ہونگے۔ دعا کیجیے۔

خیر اندیش

قمر رئیس

غالب انسٹی ٹیوٹ

Mata Sundari Marg,

New Delhi 110002

برادر عزیز، خوش رہیں۔

انسٹی ٹیوٹ نے پچھلے برس مجھے فیلوشپ دی۔ کچھ تحقیق کا کام کر رہا ہوں۔ عزیز اندوری کے خط سے

انتساب ۵۷- گوشۂ مختار شمیم

اطلاع ملی کہ بیگم مختار کچھ علیل ہیں۔ فکر مند ہوا۔ دعا کرتا ہوں کہ جلد صحت یاب ہوں۔ اُن سے اور بچوں سے دعائیں کہیں۔

کبھی آپ دلی نہیں آتے؟

غالب کی زندگی میں ان کا دیوان پانچ بار چھپا تھا۔ پہلے، دوسرے اور پانچویں ایڈیشن اگر آپ کی لائبریری میں، یا کسی اور ذخیرے میں ہوں، تو مہربانی کر کے اُن کے بارے میں اطلاع دیں۔ نسخہ بھوپال تو غائب ہو چکا ہے، لیکن نسخہ حمیدیہ میں وہ کلام شائع ہوا۔ مفتی محمد انوار الحق کے مرتب کیے ہوئے اس نسخے کے بارے میں بعض مقامات پر پوری کیفیت نہیں ہے۔ حمید احمد خاں نے پاکستان میں اپنی یادداشتوں کی بنیاد پر نسخہ بھوپال (حمیدیہ) کے نام سے ترتیب دیا ہے۔ حمید جالبی نے اس کی ایک کاپی بھجوائی ہے۔

اندور کی کسی لائبریری میں کوئی ایسا رسالہ تو نہیں جس میں اس نسخہ کے بارے میں، یعنی نسخہ بھوپال کے بارے میں کچھ ہو؟

حقیر فقیر کمال احمد صدیقی

۸/۳/۹۷

۸

۵ برادرم تسلیم

۹۱ کتاب نما کے تازہ شمارے میں آپ کا مضمون دیکھا۔ پڑھنا شروع کیا تو یاد آیا کہ کہیں پڑھ چکا ہوں۔ یہ آپ نے اچھا کیا کہ ضمیمہ کو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ کتاب نما میں شائع کرا دیا۔ اس سے لوگوں کو ظہیر سے دلچسپی پیدا ہوگی اور ان کے کلام سے بھی اور کتاب سے بھی۔

آپ نے کتابیں تبصرے کے لیے کہاں کہاں بھیجی ہیں؟ مطلع فرمائیے۔

جموں میں کالرا صاحب کے پاس آپ کے ایک خط پر نظر پڑی۔ اس لیٹر پیڈ پر آپ نے مجھے کوئی خط نہیں لکھا۔ مجھے پیڈ اچھا لگا۔

اور کیا حال چال ہیں۔ آج کل کس موضوع پر کام کر رہے ہیں؟

آپ نے شعری مجموعہ عنایت کیا تھا۔ میری بے توفیقی دیکھیے کہ رسید بھی نہ بھیج سکا۔ شاعری میں رائے زنی کرنے کی صلاحیت خود میں نہیں پاتا۔ بہر حال چند اشعار بہت اچھے لگے تھے۔

آپ کا

عابد سہیل

dr. syed
Naiyer Masud rizavi
Department of persian, university, lucknow 226007
"adabistan", din dayal road, lucknow 226003 (res. phone:82922)

۱۸/جون
۱۹۸۶ء

برادرم مختار شمیم صاحب آداب عرض

آپ کے خط مورخہ ۹/مئی کے جواب میں بہت دیر ہو گئی، معذرت خواہ ہوں۔

دیوان ظہیر کا قلمی نسخہ ندوۃ العلما کے کتب خانے میں موجود نہیں ہے۔ یہ اطلاع اُن صاحب سے ملی ہے جنھوں نے وہاں کے سب اردو مخطوطات کی فہرست تیار کی ہے۔

مرزا امیر علی صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ یوں بھی اس کی امید کم ہے کہ وہ اس سلسلے میں صحیح معلومات فراہم کر سکیں۔ یہ بات بھی یقینی نہیں ہے کہ ظہیر کا کوئی کلیات ایسا موجود ہے جس میں اتنی تعداد میں مرثیے شامل ہوں، تاوقتے کہ کوئی اور محقق اس کی تصدیق نہ کرے۔ میرا خیال ہے ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب آپ کو اس کے متعلق صحیح صورت حال بتا سکتے ہیں۔ اُن کا پتا حسب ذیل ہے:

338, Narsingharh, Srinagar 190010

اُن کو خط لکھتے وقت میرا حوالہ دے دیجیے گا۔

امید ہے مزاج بہ خیر ہوگا۔

آپ کا
نیر مسعود

ہمدانیہ کالونی،
سری نگر ۱۹۹۹۱۰
۶ نومبر ۲۰۰۰ء

جناب ڈاکٹر صاحب تسلیم

یاد آوری کے لئے ہمہ تن سپاس ہوں۔ آپ کی کتاب ''تناظر اور تشخص'' موصول ہوئی۔ اس کے لئے بے حد ممنون ہوں۔ ریاض خیر آبادی نے بھی ظہیر دہلوی کی زبان کو ہدف تنقید بنادیا۔ ریاض الاخبار میں کچھ تحریریں تھیں۔ قیام حیدر آباد کے زمانے پرانے اخباروں میں ظہیر دہلوی کا کلام چھپا تھا۔ ان دنوں میں ظہیر سے ناواقف تھا۔ اس لئے وہ باتیں نوٹ نہیں کیں۔ اوراق کربلا کی اشاعت کے بعد مجھے دلچسپی ہونے لگی تھی۔ اقبال کاظمی صاحب نے کراچی سے مجھے آپ کی کتاب کا عکس کچھ دن ہوئے بھیجا تھا۔ ہمارا مضمون (ظہیر دہلوی اور اوراق کربلا) ہماری زبان دو قسطوں میں آپ نے دیکھا ہوگا۔ میں نے ۱۵ تحقیقی مضامین خلیق انجم کو ہماری زبان کی اشاعت کے

لئے رجسٹرڈ بھیجے تھے۔ مجھے ابھی تک معلوم نہ ہوسکا کہ کتنے مضامین چھپ گئے ہیں۔ بے پور سے ایک صاحب نے مجھے اطلاع دی تھی کہ ظہیر دہلوی اور اوراق کربلا والا مضمون چھپ گیا تھا۔ میں نے ابھی تک اس کو نہیں دیکھا۔ خلیق انجم صاحب کو لکھا، انہوں نے ابھی تک جواب نہیں دیا۔ میں ایک ہفتہ کے بعد لکھنؤ جارہا ہوں۔ مزاج گرام بخیر ہوں گے۔ والسلام۔

مخلص اکبر حیدری



مکرمی تسلیم

ابھی ابھی جھوٹا سنسار نام کی دو کتب مزید ملیں اس کے لیے دلی شکریہ قبول فرمائیں۔ بڑی عنایت کی اور بے حد زحمت اٹھائی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

سوامی جی کی کتاب کا تذکرہ مجھ سے میرے ایک عزیز نے بہت اچھی کتاب کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس سے میں ایک ہی نتیجہ پر پہنچا کہ وہ غیر متعصب اور مسلمانوں سے متاثر آدمی ہیں۔ معلومات بھی ہیں مگر غلط سلط باتیں بھی اس میں شامل ہیں۔ آپ ملے ہیں اس لیے آپ کا تاثر شخصیت کے بارے میں بھی ہے جو مجھ سے مختلف نہیں ہے۔

جھوٹا سنسار II کا نسخہ آخر سے ناکمل ہے اگر اُن سے مکمل نسخہ مل سکے اور بھجوا سکیں تو کرم فرمائیں میں یہ کتب لائبریری کو دے دینا چاہتا ہوں، جھوٹا سنسار نمبر ۲ کے آخر کے صفحات ۱۷۴ کے بعد سب گڑبڑ ہیں یعنی کچھ موجود کچھ غائب اور وہ بھی بے ترتیب۔ اچھا ہے لائبریری میں کتاب مکمل رہے۔ مکمل کتاب مل جائے گی تو یہ ناکمل آپ کو بھجوادوں گا آپ سے سوامی جی کو واپس فرمادیں۔

مدرسوں اور مکتبوں کے سلسلے میں آپ کی خصوصی توجہ چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ میری خاطر اس جانب بھی بقدر فرصت توجہ فرمائیں گے۔ میرے لائق کوئی خدمت والسلام

مخلص

عرشی زادہ

محلّہ پھلوار

رام پور ۲۴۴۹۰۱

۲۷ رجنوری ۸۹ء



Tajdar Ihtisham,
The 'SHAIR' Monthly,
Post Box No.5426,
Bombay, 400 008

۲۲/مارچ ۸۰ء

برادرم مختار شمیم صاحب،

آداب،

برادرم افتخار امام کے نام آپکا محبت نامہ ملا۔ وہ فروری میں بھی زیادہ عرصہ بمبئی سے باہر رہے۔ مارچ کی ۱۶/ تاریخ سے بمبئی سے باہر ہیں۔ دہلی، لدھیانہ، انبالہ جائینگے۔ یہاں مشاعرے بھی ہیں اور "شاعر" کی خریداری کی مہم بھی جاری رہے گی۔ ۲۸/ مارچ کو مالیگاؤں میں وہاں سے شائع ہونے والے ماہنامے "ہم زبان" کی مدد کے مشاعرے میں شرکت کرنا ہے۔

۱۸/ اپریل کو برادرم ناظر نعمان کی شادی ہے۔ اس شادی میں آپکو اور بھابھی کو شرکت کرنا بیحد ضروری ہے۔ ابھی سے دعوت دے رہا ہوں۔ کوشش کر رہا ہوں کہ بھوپال سے بھی اور دہلی سے بھی سب دوستوں کو بمبئی بلالوں، کچھ ہنگامہ ہی سہی۔ سب کو خطوط لکھونگا۔ خدا کرے آجائیں۔ ان دنوں ظفر صہبائی آئے ہوئے ہیں۔ ملاقاتیں اور باتیں رہتی ہیں۔

برادرم افتخار امام شادی کے بعد پٹھانکوٹ چلے جائینگے وہاں مشاعرہ ہے اور "شاعر" کی خریداری کے سلسلہ میں بھی کام کرنا ہیں۔ اس طرح آپ کے خط کے جواب میں بہت زیادہ تاخیر ہو جاتی۔

بدقسمتی ہے کہ اندور اور بھوپال میں "شاعر" کے لیئے اب تک کچھ نہ کیا جاسکا۔ امتحانات کے بعد گرمیاں شروع ہو جائینگی اور ساتھ ہی الیکشن بھی۔ اُس کے بعد بارش کا موسم شروع ہو جائیگا۔ اس طرح میں سمجھتا ہوں کہ اب بھوپال، اندور، گوالیار کے پروگرام موسم بہار میں ہی ہوسکیں گے۔ وہ موسم سب کو راس آتا ہے، امید ہے کہ آپ اتفاق کرینگے۔ جیٹلی صاحب اور سرن صاحب کا کوئی خط نہیں آیا۔ اصل میں پروگرام کے سلسلہ میں وہیں رہ کر فضا بنانا ہوگی اور ...... کی ابتدا کرنا ہوگی تب پروگرام کامیاب ہوسکے گا۔

اندور کا ماحول آپ کے لیے سازگار نہیں -؟ وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کچھ تفصیل بتائیے۔
"شاعر" کا تازہ شمارہ مل چکا ہوگا۔

خط لکھتے رہیے۔ بھوپال جانا ہو تو دوستوں سے محبتیں اور آداب کہئے۔ بھابھی کو بھی آداب، بچوں کو پیار۔

امید کہ آپ اچھے ہونگے۔

آپکا

تاجدار احتشام



ظفر گورکھپوری

برادرم مختار شمیم صاحب

مورخہ ۱۶ر جون ۹۸

آداب وسلام

ایک ہفتہ قبل انتساب کا تازہ شمارہ موصول ہوا تھا۔ آج سیفی سرونجی خود بمبئی آ گئے۔ گھر پر گھنٹوں باتیں ہوتی رہیں۔ آپ کا تذکرہ خیر بھی رہا۔ یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ آپ مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی کے ممبر ہو گئے ہیں۔ ایک ایک اعزاز ہے جسکے آپ حقدار تھے۔ میری جانب سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ انتساب کے تازہ شمارے میں آپ کی نظم 'طلسم آئنہ' نے متاثر کیا ہے۔

امید ہے اچھے ہوں گے۔ فقط

آپکا

ظفر گورکھپوری



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم ڈاکٹر صاحب

آداب

امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ ''ندیم'' اور ''انتساب'' میں ''زاویہ نگاہ'' پر تبصرہ نظر نواز ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ نے میری کاوشوں کو مستحسن نظروں سے دیکھا، ہمت افزائی کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کی ناقدانہ بصیرت اور شستہ انداز متاثر کن ہے۔ پروفیسر جین صاحب نے بھی اس تبصرہ کو پسند کیا۔

۱۶-۱۷ مارچ ۱۹۹۶ء کو آل انڈیا یونیورسٹی اوردو ٹیچرس اسوسیئیشن کی یو.پی. شاخ کی جانب سے لکھنؤ میں ایک کانفرنس اور سیمینار کا انعقاد کیا تھا آپ کو دعوت نامہ ارسال کیا تھا، کوئی جواب نہیں ملا۔ خدا کا شکر ہے کہ جن لوگوں نے شرکت کی ان کا کہنا ہے کہ اتنے بڑے پیمانہ پر اس قدر

کامیاب کانفرنس اور سیمینار بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔اس کا "سوینئر" آپ کو بھیج رہی ہوں۔اس درمیان میری ڈی لٹ بھی مکمل ہوگئی اس کا تراشا بھی رہی ہوں ہو سکے تو آپ بھی اس خبر کر ضرور شائع کروادیں۔

ادھر یونیورسٹی میں میری مصروفیت کچھ زیادہ ہی ہیں! اسسٹنٹ پرا کٹر کی حیثیت سے سارا دن یونیورسٹی میں ہی گذر جاتا ہے۔معذرت خواہ ہوں کہ تاخیر سے جواب لکھ رہی ہوں۔خدا حافظ۔

فقط

ناچیز شمیمہ رضوی

B-330, Ashok Nagar,

Dilli-110093

۱۷ اپریل ۹۳ء

برادرم

گرامی نامہ ملا۔جب آپکا خط اندور اور دلی کے بیچ کہیں سفر میں ہوگا تب ندا فاضلی سے میں آپکے بارے میں بات کر رہا تھا۔عجیب اتفاق ہے۔ندا کی 'دیواروں کے بیچ' کتاب آچکی ہے۔اُسکے پیچھے آپکی تین چار سطریں بھی لکھی ہوئی ہیں۔میں اِس کتاب پر ہندی میں کافی لکھ چکا ہوا ہوں۔ندا ایک بڑے شاعر اور اچھے آدمی دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔خیر۔

ابھی انشاء اللہ یہ نوعیت پیدا نہیں ہوئی کہ 'مومن' کے کبھی ہم بھی تم بھی سے آشنا' مصرع کو پورا کیا جائے۔ کیا عرض کروں دلی کی زندگی کی اپنی "لے" ہے۔یہ شہر خود اپنے آپسے بھی نہیں ملنے دیتا۔سرونج کئی سال سے نہیں گیا۔کون جائے میر اب دلی کی گلیاں چھوڑ کر! آپ جیسے دوستوں کے ساتھ پٹیوں پر بیٹھ کر جو دو لفظ سیکھ لئے تھے وہ دلی میں کام آرہے ہیں۔وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے!

اچھا ہاں بتایئے پچھلے دنوں آپکی کون کون سی کتابیں شائع ہوئیں۔غزلیں میں آپکی یہاں وہاں پڑھتا رہا ہوں۔اس بار میں جون میں سرونج آؤں گا کیا آپ اُدھر ہونگے تب؟ یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہوگئیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔بچوں کو پیار۔

آپکا

جانکی پرشاد شرما

☆

ڈاکٹر سیفی سرونجی

ایک بھاشا دو لکھاوٹ، دو ادب

(گیان چند جین)

سب سے پہلے تو میں یہ عرض کردوں کہ نہ میں کوئی محقق ہوں نہ کوئی ماہر لسانیات، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ پروفیسر گیان چند جین ایک نامور نقاد اور محقق کی حیثیت سے اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ یہ بات بھی دنیا جانتی ہے کہ اردو اور ہندی کا جھگڑا پچھلے ڈیڑھ سو سال سے جاری ہے اور انگریزی حکومت سے لیکر آج تک جاری ہے۔ یہ بھی ایک تلخ سچائی ہے کہ اردو سے متعلق ہر لکھنے والے نے جب جب اردو زبان سے متعلق لکھا ہے وہ ماہر زبان کی حیثیت سے نہیں اردو زبان کی حمایت کے لئے بلکہ زیادہ تر تحریریں ایک مسلمان کی حیثیت سے لکھی گئی ہیں اسی طرح ہندی والوں نے جب جب ہندی کی حمایت کے لئے لکھا ہے وہ بھی ہندی کی بھلائی کے لئے نہیں بلکہ ہندو نقطہ نظر سے لکھا ہے لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اس ہندی اردو کے تنازعہ نے ملک کی تقسیم کرائی اور ہندو مسلمانوں کے درمیان غلط فہمیاں بڑھتی گئیں فاصلے بڑھتے گئے انہیں تمام باتوں پر سے پروفیسر گیان چند جین نے برسوں کے مطالعہ اور مشاہدے کی روشنی میں تاریخی اور مستند حوالوں کے ذریعے پردہ ہٹایا ہے اور ایک تلخ سچائی کو پیش کیا ہے اس کتاب کو انہوں نے ہندی اور اردو کے دو بڑے نقادوں کے نام منسوب کیا ہے امرت رائے اور پروفیسر گوپی چند نارنگ بلاشبہ میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے کاموں کو دیکھتے ہوئے میں ان کی نیت پر شک کرنا گناہ عظیم سمجھتا ہوں لیکن گیان چند جین کی اس کتاب کو پڑھ کر میں بہت سے شکوک میں مبتلا ہو گیا ہوں وہ اس لئے کہ انہوں نے جن مستند تاریخی حوالوں کو پیش کیا ہے انہیں تسلیم کرنے کے لئے ایک حوصلہ چاہئے اور مجھ میں وہ حوصلہ نہیں ہے اس لئے کہ اس سے پہلے کہ میں اس کتاب کے متعلق کچھ لکھوں یہاں کچھ باتیں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

ہندوستان میں لگ بھگ چھ سو سال تک مسلمان حکمراں رہے اور ان چھ سالوں میں

ہندوستان میں رہنے والی تمام ہندو قومیں اندر ہی اندر گھلتی رہیں پستی رہیں چاہے ان پر ظلم ہوا ہو یا نہ ہوا ہو انہیں برابری کا درجہ ملا ہو یا نہ ملا ہو لیکن ان کی تہذیب ان کا کلچر، ان کی زبان مسلمانوں کے رحم وکرم پر رہی نہ وہ کھل کر اظہار کرسکتے تھے نہ اپنی تہذیب اپنی زبان کو چھوڑ سکتے تھے کہ جس طرح اسلام کا زیادہ تر لٹریچر اردو میں ہے اسی طرح ہندوؤں کا سنسکرت یا ہندی میں ہے بھلا کوئی قوم اپنی تہذیب اپنا مذہب کیسے آسانی سے چھوڑ سکتا ہے حالانکہ مسلم حکمرانوں نے ان پر کوئی ظلم زیادتی نہیں کی لیکن ان کی تہذیب اور زبان بہر حال متاثر ہوئی اس لئے کہ جس قوم کی حکومت ہوتی ہے اس قوم کا ادنیٰ سا سنتری بھی منتری کا درجہ رکھتا ہے یہی وہ حالات تھے جو مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریزوں کی آمد کا سبب بنے بلکہ بعض ہندو راجاؤں نے تو انگریزوں کو باقاعدہ اقتدار کی دعوت دی اور انہیں کئی خطوط بھی لکھے یہاں راجہ رام موہن رائے کا ایک خط پیش کیا جاتا ہے جو شاہ برطانیہ کے نام ہے۔

"ہندوستان کا بڑا حصہ کئی صدیوں سے مسلمان حکمرانوں کے زیر نگیں چلا آرہا ہے اور اس کی حکومت میں ہندوستان کے اصل باشندوں کے شہری حقوق اور مذہبی حقوق کو پاؤں تلے روندھا جارہا ہے بالآخر مسلمان حکمرانوں کے ان مظالم سے تنگ آکر دکن اور پنجاب میں مرہٹوں نے اور سکھوں نے بغاوتیں کردیں اور اپنی حکومتیں قائم کرلیں لیکن بنگالی چونکہ جسمانی طور پر کمزور ہیں وہ اسلحہ اٹھانے سے گریز کرتے تھے اس لئے وہ اس پورے دور میں مسلمان حکومتوں کے وفادار رہے حالانکہ ان کی جائیدادیں تباہ و برباد کی جاتی رہیں ان کے مذہب کی توہین ہوتی رہی، بے گناہوں کا خون بہایا جاتا رہا، بالآخر قدرت نے رحم کیا اور انگریزوں کو مامور کیا کہ وہ بنگالیوں کو اس غلامی سے نجات دلائیں اور اپنی پناہ میں ان کو لے لیں۔"

(ہندی اردو تنازعہ صفحہ ۱۴)

یاد رہے کہ یہ اقتباس میں نے گیان چند جین کی کتاب سے ہی لیا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا ہے کہ اس طرح کے کئی خطوط لکھ لکھ کر انگریزوں کو اقتدار حاصل کرنے کے لئے بلایا گیا کہ اُنہیں مسلمانوں کے مظالم سے نجات مل سکے اور واقعی سارے ہندوستان کو انگریزوں کے آتے ہی ایسی نجات ملی کہ تاریخ بھری پڑی ہے۔ جب انہیں نجات مل ہی چکی تھی تو پھر دیش کی آزادی کے لئے ہزاروں لوگوں کا خون کس لئے بہایا گیا۔ سچ بات یہ ہے کہ آزادی کی اس جنگ میں بھی سب سے زیادہ مسلمان ہی لڑے گئے کہ ان کے ہاتھوں سے حکومت چھینی گئی تھی، وہ دوبارہ سے حاکم بننا چاہتے

تھے اور اس خواب کو عملی شکل دینے کے لئے زیادہ سے زیادہ اپنا خون بہا رہے تھے اور ہندوستان کے سارے ہندو مسلمانوں سے نجات پا کر ہندوستان کو اکھنڈ بھارت ہندو راشٹر بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ مسلمان جو اندر سے سیدھا ہوتا ہے اس بات کو سمجھ نہیں پا رہا تھا لیکن اس بات کو علامہ اقبال اور سرسید احمد نے سمجھ لیا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ سرسید احمد جو ہندو اور مسلمان کو ہندوستان کی دو آنکھیں کہا کرتے تھے اچانک حیران ہو گئے اور انہیں اپنے نظریات بدلنا پڑے، اقبال جو ہندوستان کی عظمت کے گیت گاتے تھے صرف مسلمانوں کے بارے میں سوچنے لگے، یہی وہ وجوہات تھیں، یہی وہ سنگین حالات تھے جو ملک کی تقسیم کا باعث بنے اور سارا عذاب سارے الزامات مسلمانوں اور اردو زبان پر آ گئے۔ تقسیم کے لئے کوئی بہانا ہندوؤں کو چاہئے تھا، اردو سے اچھا بھلا کیا ہو سکتا تھا کہ بقول گاندھی جی یہ زبان قرآنی حروف میں لکھی جاتی تھی جس دیش میں مذہب کے نام پر سب کچھ ہو سکتا ہے وہاں گاندھی جی جناح کی سیاست کامیاب نہ ہو سکی، میں جانتا ہوں کہ مسلمان ایک جذباتی قوم ہے جس میں علم اور سیاسی شعور کا فقدان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی معاملے کی تہہ تک پہنچنے سے پہلے ہی نعرہ تکبیر بلند کر دیا جاتا ہے لیکن آئے دن ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کرنے کی ذمہ داری کس کی ہے کبھی انہیں غدار کہا جاتا ہے کبھی ان کے مذہب پر حملہ کیا جاتا ہے کبھی قرآن کا غلط مطلب بیان کر کے بدنام کیا جاتا ہے، جس قوم نے دنیا کو تہذیب سکھائی، بولنا سکھایا، کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا سکھایا، وہی قوم یہاں معتوب ٹھہری۔ میں یہاں مذہب کی بات ہرگز نہ کرتا اگر گیان چند جین صاحب اپنی اس کتاب میں مذہب اور قرآن کی بات نہ کرتے لیکن انہوں نے اردو ہندی کے تاریخی حوالوں کے ساتھ مذہب اور قرآن کے حوالے بھی پیش کئے ہیں۔ مثلاً ایک اقتباس میں انہوں نے اس طرح لکھا ہے۔

> ''ہندوستان میں مسلمان اردو والے اپنی کمر پر دو قومی نظریے کا بھاری گھٹر اٹھائے پھرتے ہیں، ہندوستان نے یہ بہت اچھا کیا کہ اپنے آئین میں دینی Theocracy کا تصور رد کر دیا اور غیر مذہبی آئین اختیار کیا، اس کی وجہ سے مسلمان اردو والے بجا طور پر اپنے لئے ہر قسم کے حقوق اور سہولتیں طلب کر سکتے ہیں ایک عام ہندو کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ملک میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر کیوں رکھا جائے''۔

دوسرا اقتباس کچھ اس طرح ہے:

> ''تحریک اتحاد اسلامی کے اعتبار سے اس روئے زمین پر دو ہی

قومیں آباد ہیں ایک وہ جو اسلام کی پیرو ہیں اور دوسری وہ جو غیر مسلم ہیں۔
قرآن حکیم نے ان کے لئے حزب اللہ اور حزب الشیاطین کے الفاظ استعمال
کئے ہیں، تمام غیر مسلم حزب الشیاطین اس وجہ سے ہیں کہ شیطان ان پر
غالب رہتا ہے اور وہ خدا سے منحرف ہوتے ہیں۔"

(قرآن المجادلہ ۳ عقیل ص ۱۶۲)

ایک اور اقتباس دیکھئے جو ان کی نظر میں بہت مستند ہے امرت رائے کے حوالے سے لکھا
ہے۔

"امرت رائے نے کہاں کہاں سے دریافت کر کے بیسویں صدی
کے ربع اول و دوم کے لکھنے والوں کی ایسی تحریر کے اقتباس دیے ہیں کہ تاریخ
میں مسلمانوں کی یہ پالیسی رہی ہے کہ جن علاقوں کو فتح کیا جائے وہاں کی
زبان بالخصوص رسم الخط ختم کر کے اپنی زبان اور لپی رسم الخط کو ان پر مسلط کیا
جائے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال عربوں کی ایران کی ترکتاز ہے جہاں کی
زبان، رسم الخط پارسی، مذہب اور فنون وغیرہ ختم کر دیئے گئے۔ ہندوستان میں
بھی اس پالیسی پر عمل کرنے کی کوشش کی گئی کہ مقامی زبانوں اور ان لپیوں کو
قبول نہ کیا جائے، سندھی کشمیری پنجابی وغیرہ کی لکھاوٹ پوری طرح بدل دی
گئی، کھڑی بولی کو دیوناگری رسم الخط اور مقامی شبد بھنڈار کے ساتھ اختیار نہ
کیا گیا بلکہ عربی فارسی لفظیات اور اس کے رسم الخط میں خلعتِ قبول دیا گیا یہ
تو ہندوستانی بھاشاؤں اور لپیوں کا زور اور پھیلاؤ تھا کہ ملک کے بیشتر حصے
میں ان کو تبدیل نہ کیا جاسکا۔"

نمبر (۱) کے اقتباس کے لئے یہ عرض کرنا ہے کہ مسلمانوں کی دینی زبان اردو نہیں بلکہ عربی ہے۔ (۲) امرت رائے کے حوالے سے یہ کہنا کہ مسلمان جہاں جہاں گئے وہاں انہوں نے اپنا رسم الخط اپنی زبان زبردستی رائج کی غلط ہے۔ مسلمانوں نے دنیا کے بے شمار ممالک فتح کئے مثلاً روم، ایران، فلسطین، ترکی جہاں انہوں نے سینکڑوں برس حکومت کی لیکن عربی زبان ہر جگہ کبھی بھی زبردستی مسلط نہیں کی گئی جو وہاں کی مادری زبان تھی وہی زبان رہی۔ امرت رائے کا یہ کہنا کہ ہندوستان میں وہ کامیاب نہ ہو سکے بھی غلط ہے۔ ایک اقتباس گیان چند جین صاحب نے تحریک اتحاد اسلامی کے حوالے سے پیش کیا ہے کہ قرآن میں غیر مسلموں کے لئے حزب الشیاطین جیسے الفاظ استعمال کئے

گئے ہیں، یعنی مسلمانوں کے علاوہ تمام غیر مسلم قومیں حزب الشیاطین اس وجہ سے ہیں کہ شیطان ان پر غالب رہتا ہے اور وہ خدا سے منحرف ہوتے ہیں، اس میں کیا غلط ہے بالکل صحیح ہے۔ وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ جب مدینہ میں کفار کی حرکتوں سے مسلمان تنگ آچکے تھے تب یہ آیت نا ل ہوئی کہ انہیں ہمیشہ کے لئے نکال دیا جائے اور ان کا مکہ اور مدینہ میں آنا ممنوع قرار دیدیا گیا ورنہ جس طرح ہندوستان میں آج برسوں کے بعد بھی بابری مسجد کے شہید کرنے کے لئے رام مندر کے لئے رتھ یاترا یہ کہہ کر نکالی جاتی ہے کہ وہ بابر نے مندر گرا کر بنوائی تھی اگر یہ سچ بھی ہو تو عرب کے شہر مکہ میں خانہ کعبہ کے اندر تین سو ساٹھ بت کافروں کے رکھے ہوئے تھے جو ان کے آباء و اجداد کے زمانے کے تھے وہ پھر سے بلکہ آج تک انہیں دوبارہ وہاں رکھنے کے لئے حرکتیں کرتے اور خرافات سے باز نہ آتے۔ اگر مکہ مدینہ کو ان سے پاک نہ کیا جاتا تو اب تک ہزاروں فتنے کھڑے ہو جاتے، قرآن کی آیتوں کا بغیر سیاق و سباق کے غلط مطلب بیان کرنا اور دوسرے معنوں میں استعمال کرنا، غلط افواہیں پھیلانا ایک فیشن بن گیا ہے اور ہر کس و ناکس بغیر علم کے سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے اسلام اور قرآن پر آجاتا ہے جبکہ سچائی یہ ہے کہ دنیا میں قرآن کے علاوہ کوئی بھی کتاب مستند نہیں ہے۔ ہر کتاب میں جھوٹ شامل کرلیا گیا ہے۔ قرآن چونکہ ایک ایسی آسمانی کتاب ہے یعنی خدا کا کلام ہے جس کا ایک لفظ بھی تبدیل نہیں کیا گیا اور نہ کیا جا سکتا، گیان چند جین صاحب نے اس کے حوالے سے اور بھی نئے انوکھے واقعات بیان کئے ہیں اور بڑی کھوج کے بعد۔ انہیں اسلام اور مسلمانوں سے واقعی بہت دلچسپی رہی ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں کہ میں نے مالک رام کے انتقال کے بعد ان کے مذہب سے متعلق کھوج کی تھی، اس کھوج کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے، وہ لکھتے ہیں:

> "ملا صاحب کی طرح مالک رام بھی میرے محترم بزرگ تھے، ان کے یہاں مجھے ایک کشاکش دکھائی دیتی ہے ابھی تک ان کے مذہبی عقائد کی بات صاف نہیں، شعر یاد کیجئے:
>
> کچھ چاہ بتوں کی بھی ہے اللہ کا ڈر بھی
> یہ زاہد مکار ادھر بھی ہے ادھر بھی
>
> میں مالک رام جیسے محترم شخص کو مکار نہیں ڈرپوک کہوں گا، عام عقیدہ یہ ہے کہ وہ دل سے احمدی مسلمان تھے لیکن اپنے اہل خانہ اور برادری کے خوف کی وجہ سے کبھی کھل کر کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ ایک دفعہ کالی داس سے مالک رام نے کہا کہ میں جس انداز سے لکھتا ہوں یہ مسلمان اس طرح بس

میں آتے ہیں، عزیزم مصلحت بھی تو کوئی چیز ہے۔ کالی داس نے یہ بات مجھے
مالک رام صاحب کی وفات کے بعد لکھی تھی۔ میں نے جواب دیا کہ مالک
رام میرے محترم بزرگ تھے لیکن وہ مسلمانوں سے تقیہ نہ کرتے تھے، آپ
سے تقیہ کیا ہے، ان کا مجموعہ اسلامیات پڑھئے ان کا صدقِ دل نمایاں ہے۔"

اس طرح کے کئی اقتباس گیان چند جین نے اپنی اس کتاب "ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب" میں پیش کئے ہیں جن سے کتاب کے موضوع کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس طرح کے اقتباس دے کر جین صاحب نے کیا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اس سے ان کی نیت پر ایک سوالیہ نشان لگ جاتا ہے کہ کہیں وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے یہ کیا، مسلمانوں نے وہ کیا، اسلام کو زبردستی پھیلایا، اپنی تہذیب اپنی زبان کو زبردستی رائج کیا اور پھر ہندوؤں کی حمایت میں لکھتے ہیں۔ ہندو اردو ادیبوں کے بارے میں ایک جگہ اس طرح لکھا ہے۔

"ہندوستان میں اردو کے ہندو ادیبوں کے کئی زمرے بنائے جاسکتے ہیں۔ پہلا اُن کا جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ شخصی اور تہذیبی اعتبار سے مسلمان نہیں تو نیم مسلمان ہیں۔ انہیں دکھ ہے کہ وہ ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے۔ دوسرا زمرہ ایسے ادیبوں کا ہے جو ہندو مسلمان کے بیچ کے ہر معاملہ میں اپنی وسعتِ نظر دکھانے کے لئے سارا قصور ہندوؤں کا بتاتے ہیں۔ کچھ ہندو مصلحتاً Secular ہوگئے ہیں اور بعض ہندو ادیب مسلمانوں کی طرح نعت و منقبت وغیرہ لکھ کر مسلمانوں میں مقبول ہو جاتے ہیں بلکہ ان سے نفع اندوزی بھی کرتے ہیں۔ میں کسی ہندو مرثیہ گو کے خلوص کا قائل نہیں، اگر انہیں مسلمان دینی بزرگوں اور قائدوں سے اتنی ہی عقیدت ہے تو ان کے عقائد صحیفوں اور مسلک کو کیوں قبول نہ کریں، اس کی عدم موجودگی میں ان کی لفظی صناعی پاکی چادر سے سوا نہیں"۔

(گیان جین ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب، ص ۲۴)

گیان چند صاحب نے اس میں یہ نہیں بتایا کہ ان میں سے وہ کس زمرے میں ہیں۔
گیان چند جین صاحب نے اس کتاب کے لکھنے کا مقصد حرف اول کے تحت اس طرح بیان کیا ہے کہ اردو والوں کو ہندی اردو کے مسائل سے بہت دلچسپی ہے لیکن ان کی رہنمائی کے لئے تاریخی لسانیات کی کتابیں بہت کم ہی موجود ہیں، جو ہیں وہ ایک نقطہ نظر ہی سے لکھی گئی ہیں کہ سارا قصور ہندی والوں

انتساب — ۵۷

اور ہندوؤں کا ہی ہے۔ گیان چند جین صاحب نے کیا خوبصورت بات کہی ہے یعنی اردو والوں کو اپنی تہذیب اپنی زبان نیست و نابود کرنے کے مسائل سے کافی دلچسپی رہی ہے اس لئے انہوں نے اس خلا کو بھرنے کے لئے یہ کتاب لکھی ہے اور اس کا حل بھی بتایا ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنی تہذیب اپنی زبان کی دھجیاں اڑتے خاموش تماشائی بن کر دیکھتے رہیں یا اپنا رویہ بدل لیں۔ جس موضوع پر ڈیڑھ سو سال تک برابر لکھا جاتا رہا ہے اور جس کا فیصلہ تقسیم ملک کے ساتھ ہی ہو چکا ہو کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندی ہندوؤں کی زبان ہے اور اس بحث کے دروازے ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی بند ہو چکے ہوں کہ راشٹر بھاشا ہندی بن چکی، اب تو جو کچھ لکھنا باقی ہے وہ اردو کے خلاف لکھنا باقی ہے، جو لکھا جارہا ہے اور لکھا جاتا رہے گا لیکن اتنی کوشش کے بعد یعنی آزادی کے پچاس سال گزرنے کے بعد بھی اردو ختم نہیں ہوئی تو اب گیان چند جین صاحب نے محسوس کیا کہ کچھ ہُوا نہیں تو برسوں کے بعد اپنے بھرپور دلائل سے اس موضوع کو ازسرنو زندہ کیا ہے تاکہ جو کچھ اردو کے لئے ماحول سازگار ہوا ہے اس پر بھی پانی پھر جائے، اس لئے کہ ہر ایکشن کا ری ایکشن ہوتا ہے لیکن اس کتاب کو انہوں نے یہ کہہ کر پیش کیا ہے کہ اب تک جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ اردو والوں کی صحیح رہنمائی نہیں کر پائیں اس لئے یہ کتاب ان کی صحیح رہنمائی کرے گی۔ تعریف کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کو انہوں نے اردو اور ہندی کی دو معتبر ہستیوں کے نام منسوب کیا ہے ایک پروفیسر گوپی چند نارنگ دوسرے امرت رائے۔ امرت رائے نے ہمیشہ اردو کے خلاف لکھا ہے امرت رائے کی اردو دشمنی سے کون اردو والا واقف نہیں ہے لیکن گیان چند جین صاحب امرت رائے کی کتاب A House divided کو سب سے مستند کتاب تسلیم کرتے ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ پوری کتاب امرت رائے کے نظریات اور خیالات سے بھری پڑی ہے اور اس پوری کتاب کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اردو ہندی کے معاملے میں جتنے بھی پروپیگنڈے کئے گئے ہیں وہ اردو والوں نے کئے ہیں اس میں ہندی والوں کا کوئی قصور نہیں ہے اور جگہ جگہ اردو کی ابتدائی ان تحریروں کے اقتباس پیش کئے ہیں جن میں فارسی عربی کے زیادہ سے زیادہ ادق الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان اردو میں زیادہ سے زیادہ عربی فارسی کے الفاظ سے اردو کے ساتھ زیادتی کررہے تھے دوسری طرف زبردستی ہندو ہندی کو راشٹر بھاشا بنانے پر زور دے رہے تھے۔ اردو والے عربی فارسی کے ثقیل الفاظ سے اردو کا حلیہ بگاڑ رہے تھے اور ہندی والے زیادہ سنسکرت کے الفاظ سے ہندی کا ستیاناس کر رہے تھے۔ ان تمام باتوں کو بڑی تفصیل سے گیان چند جین نے پیش کیا ہے لیکن اب اس کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ سب کچھ کیا جاچکا تھا۔ اس لئے کہ مسلمانوں نے اردو کو اپنی زبان تسلیم کرہی لیا ہے اور

ہندوؤں نے ہندی کو۔ دونوں اپنے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور پچاس سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود بھی اردو کے ساتھ دل کھول کر دشمنی نکالنے کے باوجود بھی اردو زندہ رہی تو اب گیان چند جین صاحب کو کیا تکلیف ہوئی ان گڑے مردوں کو اکھاڑنے کی۔ ظاہر ہے جب جب اردو کے لئے راہیں ہموار ہوئی ہیں ایسے ہی لوگ کھڑے کر دیئے جاتے ہیں اور جو ماحول اردو کے لئے سازگار ہوتا ہے وہ پھر سے خراب ہو جاتا ہے ویسے بھی ان پچاس سالوں میں اردو کے ساتھ کیا نہیں ہوا اور مسلمانوں کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے تھوڑے بہت مواقع آتے ہیں تو ان کا ذہن فوراً اس طرح موڑ دیا جاتا ہے یا کوئی دوسری صورت نکال لی جاتی ہے۔ اب برسوں کے بعد گیان چند جین صاحب کیا اردو اور ہندی والوں کی غلط فہمیاں دور کر کے اردو کو اس کا مقام دلانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں جس کام کو گاندھی جی، نہرو جی، سرسید احمد نہیں کر پائے اب گیان چند جین صاحب کرنا چاہتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کی کتاب لکھ کر، امرت رائے کو سب سے مستند محقق تسلیم کر کے۔ حیرت ہے گیان چند صاحب نے نہ تو ڈاکٹر ابو محمد سحر کی کتابوں کو سمجھا نہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی کتابوں کو اور اس کتاب میں امرت رائے کی طرح کہاں کہاں سے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف اقتباسات دریافت کر کے پیش کر دیئے۔ ایک دانشور نقاد و محقق کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ایسے نازک موضوع کو یک طرفہ نظریات سے بھر دے جبکہ گیان چند جین اردو کے سچے پرستار ہیں، وہ ہی نہیں ان کے والد بھی اچھے شاعر تھے اسی طرح ایک کتاب بہت پہلے رشدی نے لکھی تھی جس میں دوسروں کے اسلام کے خلاف لکھے ہوئے تاثرات کو جمع کر دیا گیا تھا۔ کالی داس گپتا کے حوالے سے بھی انہوں نے بہت سی باتیں لکھی ہیں۔ گپتا صاحب سے میرے بھی بہت اچھے تعلقات تھے، اکثر ممبئی میں ان سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، مجھ سے بہت محبت بھی کرتے تھے اور ہمیشہ اپنے مفید مشوروں سے نوازتے تھے اور کھل کر اظہار بھی کر دیا کرتے تھے، ایک بار باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ سیفی صاحب مجھے زندگی ہو گئی اردو میں لکھتے ہوئے، اردو کا کام کرتے ہوئے لیکن مجھے ہندو سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا ہے، تو مجھے بہت حیرت ہوئی کہ وہ کس طرح؟ اب آپ کیا چاہتے ہیں دنیا بھر میں آپ کی شہرت ہے، عزت ہے مقام ہے۔ اگر آپ کا مقصد کسی ایوارڈ سے ہے، اسے آپ صلہ سمجھتے ہیں تو کئی ایسے مبتدی شاعروں ادیبوں کو ایسے ایوارڈ مل چکے ہیں کہ بجائے عزت کے اور مقام گھٹ گیا، نہ کوئی ایوارڈ مقام و مرتبہ کا کوئی پیمانہ ہوتا ہے۔ اچھا ہوا کہ انہیں موت سے پہلے پدم شری مل گیا۔ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ اندر سے اچھے ہیں اور صلے کی پرواہ کئے بغیر اپنے کاموں پر نظر رکھتے ہیں تو ایک دن مقام و مرتبہ ضرور نصیب ہو جاتا ہے۔ گیان چند جین صاحب کے بارے میں سب سے پہلے تو یہ عرض

کردوں کہ ان سے بڑا قریبی رشتہ رہا ہے، اس وجہ سے کہ وہ میرے استاد پروفیسر عبدالشیم کے بھی استادر ہے ہیں، ابو محمد سحر صاحب سے بھی میرا قریبی رشتہ رہا ہے اس لئے کہ جین صاحب کا بھوپال اور سرونج سے رشتہ رہا ہے کہ سرونج کے کئی طالب علم ان کے شاگرد رہے ہیں۔ میرے پاس بھی جین صاحب کے کچھ خطوط ہیں جنہیں میں ہمیشہ دل سے لگائے رکھتا ہوں، اس لئے جین صاحب سے مجھے کوئی ذاتی شکایت نہیں ہے لیکن یہ کتاب پڑھ کر جگہ جگہ اردو والوں کے خلاف ڈھیر سارے اقتباسات دیکھ کر یہ احساس ہوا کہ یہ سب یک طرفہ ہیں۔ اتفاق سے جتنے بھی اقتباسات اس کتاب میں دیئے گئے ہیں ان کے بارے میں جین صاحب نے لکھا ہے، سارے میں یہی لکھا ہے کہ امرت رائے کی عالمانہ کتاب، شرما جی کی عالمانہ کتاب۔ گویا انھوں نے تمام عالمانہ کتابوں کے حوالے پیش کئے ہیں۔ یہ سب اگر عالمانہ کتابیں ہیں تو پھر گیان چند جین صاحب کی اس کتاب کو کیا کہیں عالمانہ فاضلانہ۔ یہ سچ ہے کہ دنیا میں زیادہ جھگڑے مذہب کے نام پر ہی کئے گئے ہیں اس لئے کہ ہر مذہب کا ماننے والا صرف اپنے مذہب کو اعلیٰ اور دوسرے کے مذہب کو کمتر سمجھتا ہے حالانکہ اسلام کسی دوسرے مذہب کی برائی کو ممنوع قرار دیتا ہے لیکن پھر بھی مسلمانوں کا رویہ الٹا ہوتا ہے شاید اسی لئے برنارڈ شا نے کہا تھا کہ سب سے اچھا مذہب اسلام اور سب سے بری قوم مسلمان ہے۔ گیان چند صاحب کی یہ بات مجھے پسند آئی کہ "ہم آہنگی یا وجودِ باہمی کا راستہ اس طرح نکل سکتا ہے کہ ہر مذہب کو اسی طرح پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے کہ وہ دوسرے دھرموں کو بھی ایسا ہی موقع دے۔ اگر مذہب کو افغانستان کے طالبان کی نظر سے دیکھا جائے تو امن کے بجائے بدامنی ہی پھیلے گی اگر اسلامی دینی مدرسہ ہو تو اس میں بھلے ہی صرف اسلام اور اس کے پیغمبروں کو دوسروں سے اعلیٰ کہا جائے گا لیکن مخلوط مذہب کے بچوں کو تو مساویانہ درس دینا پڑے گا ورنہ دوسرے بھی اسی طرح کا جارحانہ رویہ اختیار کر سکتے ہیں۔ اس میں بھی گیان چند جین صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کون سے مدرسے ہیں، کون سے اسکول ہیں جہاں غیر مسلموں کو اسلامی تعلیم دی جاتی ہے۔ بہر حال یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ جس کی تفصیل ایک کتاب میں بھی نہیں دی جاسکتی یہ تو پھر ایک مختصر مقالہ ہے۔ اب مشکل یہ ہے کہ مذہب کے خلاف کوئی بھی کچھ سننے کو تیار نہیں ہے۔ گیان چند جین صاحب بھلے ہی اس کتاب کے ذریعہ دونوں قوموں کو یہ احساس دلائیں کہ وہ مذہب سے زیادہ دیش کو دیکھیں، خود کو دیکھیں، برطانیہ میں اور دیگر ممالک میں مذہبی رسومات زیادہ تر گھروں میں ہوتی ہیں لیکن ہندوستان میں مذہب کے نام پر لوگ فوراً سڑکوں پر آجاتے ہیں۔ دراصل یہ سب کچھ ہوتا ہے مذہب اسلام کی مقبولیت کی وجہ سے۔ ساری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسلام کا پہلا بنیادی مقصد بت پرستی ختم کر کے

ایک خدا کی وحدانیت کو عام کرنا، باطل کو مٹانا حق کو قائم کرنا۔ عرب کے خانہ کعبہ کے تین سو ساٹھ بتوں کو نیست و نابود کرنے کے بعد دنیا کے کونے کونے میں حق کا پیغام پہنچایا گیا۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ دنیا میں سب سے زیادہ بت پرستی ہندوستان میں ہوتی ہے، اب مسلمان کسی مندر یا بت کو مسمار کریں نہ کریں الزام انہیں کے سر جاتا ہے، اس لئے کہ اسلام اور بت پرستی کا میل ممکن ہی نہیں۔ جبکہ ہندوستان میں اسلام صرف اس وجہ سے پھیلا کہ یہاں ہندو ہی نہیں بلکہ دنیا کے دیگر مذاہب میں بھی بت پرستی کے علاوہ جو مذہب میں تھا نہیں وہ بھی داخل کرلیا گیا تھا اور چھوت چھات، بھید بھاؤ، اونچ نیچ سب کچھ تھا جسے صرف اسلام نے مٹایا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی انہیں خوبیوں اور سچائیوں کو دیکھتے ہوئے لوگ جوق در جوق اس میں داخل ہوتے رہے۔ گیان چند جین صاحب نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں جب پہلی بار محمد بن قاسم نے حملہ کیا تو وہاں بغاوت ہوگئی اور محمد بن قاسم وہاں سے واپس چلا گیا۔ یہ جین صاحب نے صرف امرت رائے کی کتاب کو مستند مان کر ہی لکھا ہے جبکہ سچائی یہ ہے کہ محمد بن قاسم کو اہل سندھ نے دیوتا سمجھ لیا تھا اور اس کے اخلاق و کردار کو دیکھ کر اس کی مورتیاں بنالی تھیں جنھیں خود محمد بن قاسم نے توڑا تھا اور ہزاروں لوگ مسلمان ہوگئے تھے۔ محمد بن قاسم بغاوت سے نہیں بھاگا تھا بلکہ وطن میں حجاج بن یوسف کے انتقال کے بعد اسے خلیفہ نے طلب کیا تھا جو اس کا پہلے سے دشمن تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مسلمانوں میں انتشار پھیلے ورنہ اسے وہی لوگ روک رہے تھے جو نومسلم تھے۔ ہندوستان میں اس وقت بت پرستی اپنے عروج پر تھی اور ہریجن اور دیگر چھوٹی قوموں پر پنڈتوں کے ظلم وستم سے انہیں مندروں میں جانے کی نہ اجازت تھی نہ ان کے ساتھ شادی بیاہ میل ملاپ نہ کھانے پینے کی ہمت ہوتی تھی، مسلمانوں کے آتے ہی یہ سب رسمیں ختم ہوتی گئیں اور لوگ اسلام کی سچائی اور خوبیاں دیکھ کر مسلمان ہوتے گئے۔ اب جین صاحب کا یہ کہنا کہ صرف چھوٹی ذات کے لوگ مسلمان ہوتے تھے تو یہ بھی غلط ہے درجنوں راجے مہاراجے اور سینکڑوں راجپوت مسلمان ہوئے جبکہ دنیا جانتی ہے کہ راجپوت قوم سے زیادہ بہادر قوم نہیں ہے، وہ راجپوت بہادر اور خوددار قوم ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہوئے۔ گیان چند جین صاحب نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تو بہت سے اقتباسات تلاش کر کے پیش کردیئے اس کے دوسرے پہلو پر نظر نہیں ڈالی یہ سب کچھ بھی لکھتے کہ محمد بن قاسم یہاں کیوں آیا، محمود غزنوی نے کیوں حملہ کیا، انگریز کیوں آئے؟ یہ سب باتیں لکھنا تھیں۔ وہ یہ بھی لکھتے کہ یہاں کے مسلمانوں کو آزادی تک آتے آتے ایک ملیچھ قوم سمجھا جاتا تھا، اگر کوئی ہندو مسلمان سے ہاتھ ملالیتا تو اسے پاک کیا جاتا تھا۔ یہاں ایک واقعہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں جس کا تعلق مدھیہ پردیش سے ہے، جہاں کبھی گیان چند جین صاحب رہے ہیں۔ انہیں بھی شاید معلوم

ہو کہ راج گڑھ کے راجہ موتی سنگھ کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک سوا پہر تک کسی مسلمان کی صورت نہیں دیکھتا تھا اسے مسلمانوں کے نام سے سخت نفرت تھی، اس سلسلے میں حسن الدین خاموش اپنی کتاب مہاراجہ موتی سنگھ میں لکھتے ہیں:

"1873 میں نوجوان راجہ موتی سنگھ جی اس ریاست کی گدی پر تھے مگر بڑے کٹر قسم کے ہندو تھے، مسلمانوں سے ان کو بڑی نفرت تھی، راجہ صاحب کا حکم تھا کہ سوا پہر دن چڑھے تک کسی مسلمان کی صورت ان کو دیکھنے کا موقع نہ دیا جائے، جب کبھی غلطی سے کوئی مسلمان ان کو سوا پہر دن چڑھے سے پہلے نظر پڑ جاتا تھا تو وہ اس کے کفارہ یا پراشچت میں دن بھر کا مون برت یعنی روزۂ خاموشی رکھتے تھے اور کئی قسم کے اشنان اور پوجائیں ان کو کرنی پڑتی تھیں۔ ایک دن راجہ صاحب بڑے سویرے چند سوار باڈی گارڈ کے ساتھ شکار کی نیت سے نکلے خدا کا کرنا کہ ایک مسلمان بنجارہ نداف کہیں بہت تڑکے پاخانہ پیشاب کی غرض سے جنگل گیا ہوا تھا، وہاں سے لوٹ کر وہ ندی سے وضو کر کے نماز کے واسطے کسی پاس کی مسجد کی طرف جارہا تھا، راجہ موتی سنگھ جی کی نگاہ اس پر پڑ گئی، پوچھنے سے معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہے، بس پھر کیا تھا آگ بگولہ ہوگئے، راجہ بااختیار ریاست کے مالک تھے، ان کا غصہ دیکھ کر نوکروں نے غریب اور بے قصور بنجارہ کو مارنا شروع کیا اور یہاں تک پیٹا کہ وہ بے دم ہو کر زمین پر بیہوش ہوگیا اور گر گیا بعد میں جب بنجارہ کی بیوی بچوں کو خبر ملی تو کھاٹ پر ڈال کر اسے گھر لے گئے اور سب گھر والے مل کر رونے لگے اور راجہ کو بددعائیں دینے لگے۔ تھوڑے دن کے بعد اس بنجارے نے ریاست راج گڑھ سے ہجرت کر لی اور بھوپال کی ریاست کے کسی گاؤں میں آباد ہوگیا۔ (کتاب کا نام "مہاراجہ موتی سنگھ" مصنف حسن رتلامی خاموش ص ۸۰۰)

بنجارے کو مارنے کے بعد راجہ صاحب جیسے ہی گھر پہنچے تو ان کے جسم میں آگ لگنے لگی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بچھو ڈنک مار رہے ہوں، پورے شہر میں ہلچل ہوگئی، بڑے بڑے حکیم وید بلائے گئے لیکن راجہ کو ذرا افاقہ نہ ہوا۔ دہلی سے ایک ہزار روپے روز پر مشہور حکیم کو بلایا گیا مگر کوئی اس مرض کو اچھا نہ کرسکا۔ راجہ کے ایک نوکر نے کہا حضور برا نہ مانیں تو عرض کروں ندی کنارے ایک فقیر آیا ہوا ہے اس کی بڑی شہرت ہے اگر آپ اس سے دعا کے لئے کہیں تو یقیناً فائدہ ہوسکتا ہے لیکن راجہ نے مسلمان کو نہ دیکھنے کی قسم کھائی تھی آخر مجبور ہو کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ فقیر کی جھونپڑی پر پہنچا تو فقیر نے کہلوا دیا کہ میں شام تک کسی کافر کا منہ نہیں دیکھتا، راجہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگا کہ میں اپنے پاپوں کا پراشچت کرنا چاہتا ہوں مجھے معاف کردیں، فقیر پیارے شاہ نے دعا فرمائی راجہ کا مرض جاتا رہا۔ راجہ یہ دیکھ کر ان کے قدموں میں گر پڑا اور روز فقیر کی جھونپڑی میں حاضری دینے لگا۔ ایک

نا وزیر ت یا تو فقیر نے پوچھا کہ دیر کیسے ہوئی؟ کہا کہ میں پوجا کر رہا تھا۔ فقیر نے پوچھا تم کس کی پوجا کرتے ہو؟ اس نے کہا کہ شری کرشنا کی۔ پوچھا کیا تم نے کبھی ان کے دیدار کئے ہیں؟ جواب دیا حضور میں اس قابل کہاں کہ وہ مجھے درشن دیں۔ فقیر نے کہا آنکھیں بند کر۔ جب تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھولیں تو راجہ فقیر کے قدموں میں تھا اور لا الہ الا اللہ پڑھ رہا تھا کہ مجھے کرشن جی نے کلمہ پڑھایا ہے، ان کی بانسری سے یہی آواز آرہی تھی اور مجھے عبدالواسع کہہ کر پکارا ہے، انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ محمد کا وزیر ہے جو آخری اوتار ہیں، اُن کے بعد کوئی نہ آئے گا۔ آخر راجہ مسلمان ہوا اور ساری مخالفت کے باوجود اس نے ایمان نہیں چھوڑا، یہی نہیں بعد کی بہت طویل زندگی اسلام کی خدمت میں گزاری۔ راج گڑھ جامع مسجد بنوائی جس پر اس کا نام وسن درج ہے۔ وہ مدھیہ پردیش کے مشہور ولیوں میں شمار ہوا، یہی نہیں اس کے دور میں ایک ہزار راجپوت مسلمان ہوئے جواب بھی راج گڑھ اور آس پاس کے علاقوں میں موجود ہیں۔ میں گیان چند جین صاحب سے یہ عرض کردوں کہ یہ کوئی کہانی یا کسی مثنوی یا امیر حمزہ کی داستان نہیں ہے جس میں کوئی لڑکی مشرف بہ اسلام ہوئی ہو۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور گیان چند جین صاحب کی شاید قاضی وجدی الحسینی صاحب سے ملاقات بھی ہوئی ہو، وجدی الحسینی صاحب نے اپنی کتاب ''ہندوستان اسلام کے سائے میں'' اس کا ذکر کیا ہے۔ راجہ کا انتقال شاید 1880 میں ہوا، راج گڈھ میں ان کا مزار موجود ہے، یہی نہیں ان جیسے کئی راجاؤں کے مسلمان ہونے کی مستند فہرست پیش کی جاسکتی ہے۔ گیان چند جین صاحب کو تو قصے کہانیوں کو پڑھ کر ہی بُرا لگا، حقیقت اور تاریخ پر بھی تو نظر ڈالیں۔ بہر حال میں اپنے موضوع پر آتا ہوں۔ گیان چند جین صاحب کی اس کتاب میں مسلمانوں کے ظلم وستم مندروں کے مسمار کرنے اور زبردستی ہندوؤں کی راجکماریوں سے شادی کرنے کے واقعات جگہ جگہ پیش کئے گئے ہیں جبکہ کتاب کا نام ہے 'ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب' یعنی اس بہانے انہوں نے یہ سب کچھ پس منظر کے روپ میں پیش کیا ہے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ سب مسلمانوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ ایک نامور اردو کے نقاد محقق کی یہ ایک ایسی تحقیقی کتاب ہے جس کا استقبال یقیناً امرت رائے کے حلقے میں بہت کیا جائے گا، کاش یہ سب کچھ لکھنے سے پہلے وہ تاریخ پر بھی گہری نظر ڈال لیتے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''ماضی بعید میں ہند آریائی زبانوں کے میل ملاپ کی تفصیلات امرت رائے ہی نے نہیں دی بلکہ ہندی سنسکرت کے متعدد جدید علماء بھی ان کی تائید کرتے ہیں مثلاً سنیتی کمار چٹرجی، راہل سانکرتاین، رام ولاس شرما،

کشوری داس واجپئی، ہری پرشاد شاستری، کاشی پرشاد جیسوال، چنامبر دت برتھوال، وشوناتھ پرشاد، نامور سنگھ چندردھر شرما وغیرہ ان میں بارنلے گرین اور نے سی نوری جیسے مستشرقین اور اطہر عباس رضوی جیسے علی گڈھ کے تاریخ، فارسی اور ہندی کے عالم بھی ہیں۔ ہندی کے علما کی تحریریں دیکھئے کس قدر عبور اور قدرت کے ساتھ سنسکرت، پالی پراکرت اور اپ بھرنش کے الفاظ اور قواعد کو پانی کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ان کے مقابل ناواقفانِ اردو کو دیکھئے جو اپنی لسانی عصبیت کو عدم واقفیت اور جہالت کا جواز سمجھتے ہیں۔ میں بھی ہندی کے قدیم اور وسطی دور کے ادب کے بارے میں جاہل مطلق ہوں لیکن میں ہندی کی کتابوں کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھ سکتا ہوں اور ان کا مفہوم سمجھ لیتا ہوں۔ میں نے ہندی میں تاریخِ لسانیات کی کئی ضخیم اور خاصے حجم کی کئی کتابیں پڑھیں ہیں'' (گیان چند جین ایک بھاشا دو لکھاوٹ ص ۱۲۵)

گیان چند جین کے اس اقتباس کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ہندی ہندی کی عالمانہ کتابوں کا کتنا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اب کہیں جا کے ان پہ آنکھیں کھلی ہیں کہ اردو میں تو سب کچھ کچرا تھا، کسی نے بھی سچ نہیں لکھا۔ اب انہیں ہندی کی مستند کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا تو یہ راز کھلا کہ اردو والوں نے اپنی لسانی عصبیت کے لحاظ سے اتنا کچھ غلط لکھا ہے کہ ساری تاریخ کی مٹی پلید کر کے رکھ دی۔ مجھے حیرت ہے کہ جین صاحب نے نہ ابو محمد سحر کی نہ شمس الرحمٰن فاروقی کی غیر عالمانہ کتابوں کا ذکر برائے نام ان نامور مستند اور عالمانہ کتابوں کی فہرست میں کیسے رکھ لیا۔ اگر امرت رائے تمام عمر اردو کے خلاف لکھتے رہے تو عالمانہ کتابوں کے مصنف ہیں اور اردو والے سچ بھی کہیں تو لسانی عصبیت کے شکار کہلائیں۔ جین صاحب آپ نے بہت بڑی غلطی کی کہ آپ اردو میں آئے آپ کو تو ان تمام باتوں کا پتہ تھا پھر کیسے شری مان سے یہ گھٹنا ہوگئی، ان کی بڑی کرپا ہوگی کہ وہ اردو کو اپنے حال پہ چھوڑ کر عالمانہ مصنفین کے ساتھ مل کر کوئی ایسا ٹھوس قدم اٹھائیں کہ آپ کو محترم جناب کہلانے والے نہ رہیں اور شری مان مہودے کے نام سے آپ کی جے جے کار ہونے لگے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ گیان چند جین صاحب کی یہ کتاب بقول ان کے امرت رائے کی عالمانہ کتاب کے حوالوں سے بھری پڑی ہے اس کتاب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

'' میں ایسا ہی جاہل مطلق تھا، ہندی لسانیات کی کچھ کتابیں پڑھنے

کے بعد جاہل مطلق نہیں محض جاہل رہ گیا۔ زیر نظر کتاب کے لئے میں نے ہندی والوں کی چند عالمانہ کتابیں دیکھی ہیں جن میں سب سے اہم ڈاکٹر رام ولاس شرما کی بھاشا اور سماج راشٹر بھاشا کی سمسیائیں، ڈاکٹر نامور سنگھ کی ہندی کے وکاس میں اَپ بھرنش کا یوگ دان اور آخر میں لیکن سب سے اہم عالمانہ کتاب انگریزی کی امرت رائے کی A House Diveded ہے.

تاریخ لسانیات میں یہ جیسی عالمانہ کتاب ہے اردو میں کوئی کتاب اس کے چوتھائی کے برابر بھی نہیں ٹھہرتی۔ اردو والوں نے اس کے آخری دو چار صفحے پڑھ لئے اور بانگ لگادی کہ امرت رائے متعصب ہے اور اس کے بعد مطمئن ہوگئے۔ اس کتاب کے محاسن ایک بار پڑھنے سے گرفت میں نہیں آتے۔ اسے کم از کم تین چار مرتبہ کھنگالا جائے تبھی آشکار ہوتے ہیں۔ اہل اردو تو مطالعہ کے بجائے اپنے لسانی تعصب کو کافی شافی سمجھتے ہیں۔ یہ منطق سمجھ میں نہیں آئی کہ کوئی ہندی کی وکالت کرے تو وہ متعصب ہے اور جو تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں ہندی سے مخاصمت رکھے اور فقط اردو کی وکالت کرے تو وہ بہت بڑا محب وطن ہے۔''

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ گیان چند جین صاحب نے امرت رائے کی عالمانہ کتاب کے بارے میں کس قدر روشن خیالی سے کام لیا ہے اور اگر ایسی ہی عالمانہ کتابوں کو وہ سب سے مستند سمجھتے ہیں تو بلا وجہ انہوں نے اردو جیسی بے کار اور قرآنی الفاظ والی زبان میں جھک مارا، ایسی دو چار کتابیں لکھ کر عالی مرتب کہلاتے۔ آگے اور لکھتے ہیں:

''میں اس کتاب کی تسوید میں ہندی کی قدیم تاریخ کی وضاحت کے لئے ہندی کی اصطلاحیں اور نمونے استعمال کروں گا جنہیں یہ شبد بھنڈار پڑھنا گوارا نہ ہو وہ ان اوراق کو پلٹ کر آگے بڑھ جائیں، میں اپنے سرسری مطالعے کے مختصر نتائج امرت رائے کے الفاظ میں پیش کرنے پر مجبور ہوں۔ اردو والوں کا یہی مزاج ہے کہ وہ اپنے ملک کی زبانوں ہندی، سنسکرت سے پرے پرے رہتے ہیں اور دور دراز کی طرف دوڑتے ہیں لیکن اردو ہندی کے آغاز کی بات محض اصطلاحوں کا معاملہ نہیں وہ تو ہندی اور اس کے اجداد اُپ بھرنش، پراکرت، سنسکرت اور ویدک بھاشا سے اچھی جانکاری کی بات ہے۔

اردو والوں کو ان زبانوں اور ان کے الفاظ سے ایک بھڑک ایک چڑ ہے"

گیان چند جین صاحب نے بہت سی نئی معلومات فراہم کی ہیں۔ اس سے پہلے کسی بھی اردو والے کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اردو ہندی کا آغاز کب ہوا، نہ کسی مسلمان نے ہندی میں کچھ لکھا یہ لکھ کر تو جین صاحب نے رحیم، خسرو جیسے تمام لکھنے والوں کو زیر زمیں کر دیا۔ اگر انہیں ان زبانوں سے چڑ ہوتی تو ان کا نام کسی بھی ادب میں نہ ہوتا، ہاں یہ سب زبانیں اتنی اچھی تھیں تو دنیا میں پھیلی کیوں نہیں؟ جین صاحب اب بھی اگر کوشش کریں اور ایسی عالمانہ کتابیں لکھ دیں تو یقیناً ساری دنیا میں یہ زبانیں پھیل جائیں۔ مسلم دور میں تو مسلمانوں نے تلوار ہاتھ میں لیکر ان زبانوں کا خاتمہ کر دیا تھا مگر ان پچاس سالوں میں تو بہت کچھ ہو سکتا تھا، خیر اب بھی وقت ہے لیکن اتنی سی بات تو سب جانتے ہیں کہ کوئی بھی زبان نہ تو کسی کے مٹانے سے مٹتی ہے نہ کسی کے بنانے سے بنتی ہے زبانیں تو خود وجود میں آتی ہیں اور جس میں تمام قوموں کا یوگ دان ہوتا ہے، سب کے میل جول سے صدیوں میں زبانیں بنتی ہیں، کسی ایک ادیب یا شاعر کی حیثیت نہیں ہوتی کہ وہ زبان مٹا دے یا بنا دے، اردو بھی ایک ایسی ہی زبان ہے جو سب قوموں کے میل جول اور قربانیوں کا نتیجہ ہے، ہاں یہ الگ بات ہے کہ اس میں مسلمانوں کا زیادہ یوگ دان رہا ہے کہ ہندوستان میں ان کے آنے کے بعد یہ زبان وجود میں آئی جبکہ مسلمانوں کی زبان عربی تھی لیکن زیادہ تر مسلمان ایران افغانستان سے آئے تھے جو فارسی جانتے تھے اس لئے فارسی سرکاری زبان بنادی گئی اور فارسی کے بطن سے اردو نے جنم لیا جو کہ بقول گاندھی جی کے قرآنی الفاظ میں لکھی جاتی تھی، یہی بات ہندی والوں کو ناگوار گزری، جیسے جیسے آزادی کا خواب پورا ہوتا نظر آنے لگا ہندی کو سرکاری بھاشا بنانے کی آوازیں اٹھنے لگیں، اگر یہ پہلے سے اٹھتیں تو مسلمانوں کو یا اردو والوں کو کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن ایک رائج زبان کے ہوتے ہوئے جو کہ مانوس زبان بن چکی تھی اس کی زیادہ سے زیادہ مخالفت ہونے لگی اور اس حد تک بڑھی کہ بٹوارے کا سبب بن گئی۔ (باقی آئندہ)

☆☆☆☆

منصور آفاق

مصطفیٰ شہاب کا "ہاتھوں والا"

جبلتوں کے موضوع پر ممکن ہے کہ اردو زبان میں اور بھی شاعری موجود ہو مگر میری نظر سے ابھی تک ایک نظم کے سوا اور کچھ نہیں گزرا سو وہی ایک اکیلی نظم میرا موضوع ہے۔ سب سے پہلے تو اس بات پر غور کرتے ہیں کہ جبلت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ماہرین نے کچھ اس انداز میں دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ انسانی عمل جو صرف کسی فوری اور شعوری وجہ کے نتیجے میں نہ ہو بلکہ اس کی جڑیں باطنی گہرائیوں، موروثی اور غیر موروثی خواہشوں اور عادتوں سے لیکر ایسی ذہنی حالتوں تک جاتی ہوں جہاں فوری طور پر کسی منطقی ردعمل کا اظہار نہیں ہوتا۔ اور غیر محسوس جذباتی دھارے کے تحت انسان قدم بڑھاتا ہے جذبہ کی آگ یعنی مقصد کے حصول کی آرزو اسے حرکت پر مجبور کرتی ہے۔ اسی عمل کو جبلت کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر بچے کی طرف لپکتے ہوئے ہاتھ کے پس منظر میں پہلی چیز تو پسندیدگی کا جذبہ ہے جو انسانی ذہن کی شعوری سطح ہے۔ بے ساختہ بچے کی طرف ہاتھ کا بڑھنا بھی کوئی لاشعوری عمل نہیں لیکن صدیوں کے تسلسل میں یہ عمل انسانی جبلت کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ سو ہم اسے کسی حد تک لاشعوری عمل بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر اس وقت بحث کا موضوع یہ بات ہے کہ وہ جبلت جس کا اظہار ہاتھوں سے ہوتا ہے ہاتھ کٹ جانے کے بعد اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔

پہلے مصطفیٰ شہاب کی نظم پڑھ لیجئے پھر بات آگے بڑھاتے ہیں۔

'ہاتھوں والا'

کل میں نے اک شخص کو دیکھا
جس کے دونوں ہاتھ کٹے تھے
لیکن اس کو یوں لگتا تھا
جیسے اس کے ہاتھ ابھی تک
اس کی روح میں زندہ ہیں

وہ کہتا تھا

ہاتھ ملانے، رخصت کرنے

پانی پینے، سر کھجلانے

لوگوں کو رستہ سمجھانے

شام ہوئی تو لیمپ جلانے

بچوں کو بانہوں میں لینے

غصے میں مکا دکھلانے

اُس کے بچھڑے ہاتھ اچانک

پھر سے جسم میں اُگ آتے تھے

شاعر نے اس نظم میں سات جبلتوں کو لیا ہے۔ ان میں دو جبلتیں ایسی ہیں جن پر بحث ہوسکتی ہے کہ کیا یہ جبلتیں ہیں کہ نہیں۔ ہاتھ ملانا، رخصت کرتے ہوئے کسی سے ملنا، پانی پینا، سر کھجلانا، غصے میں مکا دکھلانا اور بچوں کو بانہوں میں لینا تو طے شدہ جبلتیں ہیں لیکن دوسروں کو راستہ دکھلانا اور شام کو لیمپ جلانے کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ انسانی جبلت میں شامل نہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ بھی انسانی جبلتیں ہی ہیں کیونکہ جب آدمی کسی کو راستہ سمجھاتا ہے یا اندھیرے میں یکا یک بلب جلانے کی ضرورت آن پڑے تو لاشعوری طور پر خود بخود ہاتھ حرکت میں آتے ہیں۔

اب اس نظم میں ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ شاعر نے اپنی نظم میں انہی جبلتوں کو کیوں چنا، کئی اور بھی جبلتیں ہوسکتی تھیں جن کا اظہار ہاتھوں کی حرکت سے ظاہر ہوسکتا تھا، مثال کے طور پر گرتے ہوئے شخص کو سہارا دینا، اپنی طرف آتے ہوئے پتھر کو روکنا وغیرہ۔ میرے خیال میں شاعر نے لاشعوری طور پر ان ہی جبلتوں کو چنا ہے جو ایک خوبصورت معاشرت کی تہذیبی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ علامتی سطح پر ان جبلتوں کو دیکھا جائے تو مصافحہ کرنا وصال کی علامت ہے، کسی کو رخصت کرنا ہجر و فراق کے باب میں آتا ہے، پیاس کی جبلت تلاشِ چشمۂ آبِ حیات سے لے کر لبِ فرات تک جاودانی کی داستانِ عظیم ہے۔ سر کھجلانے کا عمل کسی بھی تہذیب میں ندامت یا سوچ بچار کا اظہار کرتا ہے۔ لوگوں کو رستہ سمجھانے کی کھلی ہوئی علامت ارتقائے ذہنِ انسانی کے اس تسلسل کا نام ہے جس کی وجہ سے آج انسان چاند ستاروں کو مسخر کر رہا ہے۔ شام کو لیمپ جلانا صدیوں سے اندھیروں کے خلاف اُجالوں کی جیت ہمارے پیغمبروں کی روایت ہے جو ہر دور میں آسمانوں سے روشنی لاتے رہے۔ بچوں کو بانہوں میں لینا آنے والی نسلوں کا قرض اتارنا ہے کیونکہ ہمارے بڑوں نے ہمیں

بانہوں میں اٹھا کر ہمیں ہمارے بچوں کا مقروض بنایا تھا اور غصے میں مکا دکھلانا دفاع کی علامت ہے کہ میں بھی حملہ آور ہو سکتا ہوں۔ ان تمام جبلتوں کے پیچھے کیا کچھ موجود ہے اس پر بحث کرنے کے لئے دفتر درکار ہیں۔

نظم میں بنیادی بات ہے کہ ایک شخص جس کے دونوں ہاتھ تو کٹ گئے ہیں لیکن مختلف حالتوں میں ے کے اندر اس کے ہاتھوں کو متحرک کرنے والی جبلتیں جاگ پڑتی ہیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس کے کھوئے ہوئے ہاتھ اچانک اس کے جسم میں اگ آئے ہیں۔ یہ ایک ایسی نظم ہے جو فرد کے حوالے سے کہی گئی ہے مگر اسے اجتماعی سطح پر کسی قوم یا قبیلے کے پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو بھی پوری معنویت کے ساتھ مکمل طور پر اپنا اظہار کرتی ہے۔ اس وقت دنیا میں کئی قومیں ایسی ہیں جن کے ہاتھ کاٹ دیئے گئے ہیں۔ ہاتھ کاٹنے کی تحریک بھی انسان کو پتھر کے زمانے سے ورثہ میں ملی ہے۔ قدیم انسان کے اندر مشکل حالات میں زندہ رہنے کے لئے ضرر رسانی کی ضرورت رفتہ رفتہ ایک جبلت کی صورت اس کے لہو میں رچ گئی تھی۔ اگر کچھ لوگوں کو کسی درندوں بھرے ویران جزیرے میں چھوڑ دیا جائے تو ان کے اندر زندہ بچ رہنے کے لئے اپنے دشمنوں پر قابو پانے کی جبلت شدت سے ابھرے گی۔ اس وقت بھی دنیا اسی جبلت کے ہاتھوں لہولہان ہے۔ زیادہ طاقت حاصل کرنے اور دوسروں پر مکمل اختیار حاصل کرنے کی وحشی جبلت نے فلسطین، عراق، افغانستان میں جگہ جگہ سڑکوں، گلیوں اور مکانوں میں خوف، قتل وخون، غارت گری، رنج والم سے بھری تصویریں لگا رکھی ہیں۔ مگر انسان نے ابھی تک اپنی خیر کو شر پر فتح کرنے والی حیرت انگیز طاقت نہیں کھوئی ہے اور کسی حد تک یہ بات اس نظم میں بھی موجود ہے کہ ہاتھ کٹ جانے کے باوجود خیر کو پروان چڑھانے والی جبلتیں باقی رہ جاتی ہیں۔



احمد مسعود نوٹنگھم

نئے طرزِ ہنر کی شاعرہ: فرزانہ نیناں

فرزانہ ایک نظم میں کہتی ہیں:

اپنا رشتہ ڈھونڈنا اکثر
اتنا سہل نہیں ہوتا ہے
لوگوں کے اس جنگل میں
چلنا سہل نہیں ہوتا ہے

اس نے اپنا رشتہ ڈھونڈ لیا ہے اور اس پر اعتماد کے ساتھ گامزن ہے۔ ممتاز نقاد ڈاکٹر طاہر تونسوی فرزانہ کو اردو کی منفرد شاعرہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس نے نیلے رنگ سے اپنی شاعری میں ایک نیا انداز اور نیا طرز ہنر پیدا کیا ہے''

فرزانہ کہتی ہیں ''میری شاعری نیلگوں وسیع وعریض شفاف آسماں کا کینوس ہے جہاں میں اپنی مرضی کی تصویریں پینٹ کرتی ہوں''۔ رشیدہ عیاں کا ایک شعر ہے۔

عیاں نیا کوئی زیور سخن کو پہناؤ
وگرنہ شعر تو سارا جہان کہتا ہے

فرزانہ نے واقعی سخن کی دیوی کو نئے زیور سے آراستہ کیا ہے۔ آپ کو ان کے مجموعہ میں درجنوں نئی تشبیہات ملیں گی۔ ان کی شاعری میں جدت اور تازگی ہے اور یہ اپنی حسین تہذیب کی ترجمان بھی ہے۔ اس میں کہیں گھر کے پچھواڑے کے پیپل کی بات ہے، کہیں آم کے پیڑوں کا ذکر ہے اور کہیں سوغ بخنے اور صنوبر کی یادیں ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے کہا تھا:

صبح ہوتے ہی نکل آتے ہیں بازار میں لوگ
گٹھریاں سر پہ اٹھائے ہوئے ایمانوں کی

فرزانہ اپنے گاؤں کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہیں:

اک وراثت کی طرح گاؤں کی گڑسی باتیں

گھڑیاں باندھ کے اس دل کے نگر آتی ہیں

اچھوتی ترکیب نے خیال کو نیا رنگ عطا کیا ہے ندرتِ فکر وفن کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجئے۔

کوئی بھی نہ دیوار پر سے پکارے
مگر ذہن یادوں کے اپنے اتارے

☆

ناریل کی سفید قاشوں سے
روپ کی چاندنی بچھاؤں گی

یہ اشیاء کی شاعری کی بھی عمدہ مثالیں ہیں۔فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کی طرح فرزانہ نے بھی نسائی جذبوں کو بڑے حوصلے اور ہنر سے پیش کیا ہے۔وہ کہتی ہیں:

بدن نے اوڑھ لی ہے شال اس کی
ملائم، نرم، مخمل ہوگئی ہوں

☆

مرے قریب ہی گو زرد شال رکھی ہے
بدن پہ میں نے مگر برف ڈال رکھی ہے

پروین شاکر نے اپنے بیٹے کی ولادت کے حوالے سے خوبصورت نظم تخلیق کی اور فرزانہ کہتی ہیں:

تخلیق کا عمل اسے سچی خوشی لگا
عورت کو کربِ ذات نئی زندگی لگا

مرد کے حاکمانہ معاشرے میں عورت کے احساس اور اس کے کرب کو یوں بیان کرتی ہیں:

جس دن گھر سے بھاگ کے شہر میں پہنچی تھی
بھاگ بھری کے بھاگ اسی دن پھوٹے تھے

☆

ممکن ہے مار دے مجھے اس کی کوئی خبر
دشمن ہے جس کا میرا گھرانہ بنا ہوا

محبت کرنے والوں پر جبر کی ساری داستان کو اس ایک شعر میں یوں بیاں کیا ہے:

ہوا میں آج بھی روتی ہے بانسری، نیناں
اداس پھرتی ہے صدیوں سے ہیر جنگل میں

شعری مجموعہ میں کئی ایسے بھی اشعار ہیں جو آپ کو دعوتِ فکر دیتے ہیں

کسی کے عکس میں کھوئی ہوئی ہوں اتنی
خود آئینے سے اوجھل ہو گئی ہوں

☆

رہِ یقیں پہ قدم اٹھ نہیں سکا نیناں
گماں نے پاؤں میں زنجیر ڈال رکھی ہے

فرزانہ کی دلکش شاعری پر اردو کی معتبر شخصیات اظہار خیال کر چکی ہیں میں آخر میں عبداللہ علیم کا خوبصورت شعر ان کی نذر کرتا ہوں:

چھلک نہ جاؤں کہیں میں وجود سے اپنے
ہنر دیا ہے تو پھر ظرفِ کبریائی دے

☆☆☆☆

محمد ادریس مونس

تفہیم شعرِ غالب

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا؟
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

اس سے پہلے کہ اپنے خیال کے مطابق شعر کی تشریح پیش کی جائے ایک لطیفہ یا واقعہ تحریر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ایک بزرگ دوست صوفی صاحب نہایت عمدہ شعری ذوق کے ہیں۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب تقریبات میں خواتین اور مردوں کی نشستیں علیحدہ علیحدہ اور باپردہ ہوا کرتی تھیں، ایسی ہی ایک تقریب میں ایک بچہ روتا ہوا مردوں کی جانب آنکلا اور رونے لگا، صوفی صاحب نے بجائے کچھ سوال کرنے یا کہنے کے قدرے بآواز بلند کہا تو یہ کہا: ''نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا'' اُن کا یہ کہنا تھا کہ محفل زعفران زار ہوگئی اور نقش نقاش تک پہنچ گیا۔[1]

مذکورہ شعر میں نقش سے مراد ہر نظر آنے والی شے، یعنی مخلوق ہے، فریاد سے مراد اظہار و اعلان ہے، مزید اس میں ایک طرح کا شکوہ بھی ہے۔ پیکر تصویر سے مراد بھی مخلوقات ہی ہیں، کاغذی پیرہن سے مراد ان مخلوقات کا ناپائدار، کمزور اور فانی ہونا ہے، شوخیٔ تحریر اُن کی دلکشی اور حسن ہے۔

یعنی دنیا کا ہر نقش اپنے وجود سے اپنے نقاش، صناع اور خالق کا اعلان کرتا ہے۔ صناع عالم نے دنیا میں انتہائی دلکش اور حسین چیزیں تخلیق فرمائی ہیں، لیکن ہر 'نقش' اور ہر 'پیکر تصویر' ناپائدار ہے، اس کا پیرہن کاغذی یعنی نہایت کمزور اور فانی ہے، لفظ 'فریاد' میں یہ شکوہ بھی پوشیدہ ہے۔

مصرع میں سوالیہ انداز اختیار کیا گیا ہے اور جواب قاری یا مخاطب پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ یعنی یہ جو نقوش و پیکر نظر آرہے ہیں، یہ کس کے تخلیق کردہ ہیں؟ ان کا خالق کون ہے؟ یعنی ان تصویروں اور نقوش کا بنانے والا کوئی نہ کوئی ضرور ہے۔

نقش کی مناسبت سے تحریر، کاغذی پیرہن اور پیکر تصویر کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ خالق کائنات کے لئے صناع ازل اور نقاش ازل جیسی تراکیب بھی استعمال کی جاتی ہیں۔

[1] حجاز کے سلسلہ میں اس سے ملتا جلتا واقعہ مشہور ہے۔

سیفی سرونجی کی شخصیت اور فن

سیفی سرونجی کی شخصیت اور فن پر ایک دستاویزی کتاب جس میں ایک سو آٹھ اردو کے مشہور ادیبوں، نقادوں کے مضامین و تاثرات شامل ہیں، منظر عام پر آچکی ہے۔

صفحات:504، قیمت:-/Rs.500

اردو کے مخلص ادب نواز دوستوں کے صرف -/Rs.250 میں

ترتیب: محمد توفیق خاں

مضامین نگار:

پروفیسر گوپی چند نارنگ، عبدالقوی دسنوی، پروفیسر مظفر حنفی، پروفیسر آفاق احمد، ملک زادہ منظور احمد، ڈاکٹر بشیر بدر، پروفیسر عبدالمغنی، اقبال متین، ڈاکٹر غلام حسین، ڈاکٹر محمد ایوب واقف، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر عبدالغفار عزم، ڈاکٹر محمود شیخ، ڈاکٹر رفعت اختر، سید معراج جامی، ڈاکٹر جانکی پرشاد شرما، ابراہیم اشک، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر محمد نعمان صدیق، شاہد کلیم، شاہد جمیل، نذیر فتح پوری، عبدالاحد ساز، سیدہ نسرین نقاش، کرشن کمار طور، ڈاکٹر فراز حامدی، گلشن کھنہ، ڈاکٹر عزیز اندوری، راشد جمال فاروقی، ڈاکٹر شاہد میر، منور رانا، رونق شہری، ڈاکٹر اسلم حنیف، اختر شاہجہاں پوری، پروفیسر احتشام اختر، پروفیسر علیم اللہ حالی، صاحبزادہ شوکت علی خاں، ڈاکٹر خالد محمود، قمر سنبھلی، کوثر صدیقی، ظفر صہبائی، ڈاکٹر رضیہ حامد، احمد کمال پروازی، شکیل گوالیاری، ظفر اقبال ظفر، فاروق جائسی، خورشید ملک، ڈاکٹر غلام رسول ساجد، عشرت ظفر، ڈاکٹر یعقوب یاور، سلیم انصاری، پروفیسر مختار شمیم، رؤف جاوید، عارف عزیز، ڈاکٹر صغیر شاد، انل اگروال، بسمل عارفی، پروفیسر ظفر امام، قاضی مشتاق احمد، محمد صدیق نقوی، ڈاکٹر فاروق اعظم، انیس انصاری، ڈاکٹر ارشد عبدالحمید، ڈاکٹر پریمی رومانی، برج موہن دوبے، ماجد دیوبندی، پربھات جین، ڈاکٹر کے. پی. ماتھر، ڈاکٹر نفیس تقی، ڈاکٹر مفتی محمود، انیس دہلی، محمود ملک، ڈاکٹر محمد ایوب واقف، اقبال مسعود، ڈاکٹر شیام لتا بسواس، سلام مضطر نشاطی، عبدالرحمٰن گدی، احد پرکاش، محمد متین ندوی، محمد نعیم اطہر منصوری، انیس بن سعید، شارق ہندی، جاوید یزدانی، ڈاکٹر معین الدین شاہین اجمیری، رشید انصاری، ڈاکٹر تسخیر فہمی، ایم. اے. خان، فرید تنویر، شان بھارتی، آسیہ سیفی، عشرت قادری، اسماعیل ذبیح، ویرنرائن ایڈوکیٹ، آفاق سیفی اور محمد توفیق خاں۔

رشیدہ عیاں
امریکہ

جو غارِ حرا میں فرش بنا، اے کاش وہ پتھر میں ہوتی
جس پر قدموں کا نقش اترا اے کاش وہ پتھر میں ہوتی

پیشانیٔ مسجدِ نبوی پر، آئی ہے کیسی چمک دمک
جب نامِ محمدؐ نقش ہوا، اے کاش وہ پتھر میں ہوتی

تھک کر جو کبھی آرام کی خاطر، جنگل میں یا صحرا میں
جس پر آقا نے سر رکھا تھا، اے کاش وہ پتھر میں ہوتی

فتنوں کو مٹانے کی خاطر، حضرت کے مبارک ہاتھوں سے
دیوارِ حرم میں نصب ہوا، اے کاش وہ پتھر میں ہوتی

کونین کے سرور جس پہ کھڑے ہو کر خطبہ فرماتے تھے
نعلین کا جس کو لمس ملا، اے کاش وہ پتھر میں ہوتی

وہ کتنا افضل و اعلیٰ تھا، وہ کتنا قسمت والا تھا
جو پیٹ پہ حضرت نے باندھا، اے کاش وہ پتھر میں ہوتی

تعمیرِ حرم کی خاطر جو، حضرت نے اٹھایا کاندھوں پر
تقدیر کا اس کی کیا کہنا، اے کاش وہ پتھر میں ہوتی

تعمیر میں روضے کی یوں تو جانے کتنے کام آئے ہوں
قدموں کی طرف جو نصب ہوا، اے کاش وہ پتھر میں ہوتی

جو عکرمہؓ کے ایماں کا سبب تھا، سطحِ آب پہ ٹھہرا تھا
تھا اس پہ عیاںؔ فیضِ آقا کا، اے کاش وہ پتھر میں ہوتی

غزلیں

تمام رنگ جم چکے ہیں، دامنِ وجود پہ
اب اپنا اختیار کوئی ہست پر نہ بود پہ

وہ اک وجود، جو نگاہ درک میں نہ آ سکا
بکھر گئے ہیں اس کے رنگ دامنِ شہود پہ

زمین بے گیاہ تھی، مگر کسی کے پیار نے
کھلا دیئے ہیں پھول، میرے مزرعِ وجود پہ

بس اک سپردگی سی ہے، نہ بھید ہے نہ بھاؤ ہے
مدارِ عاشقی کسی زیاں پہ ہے نہ سود پہ

یہ حق ہے، اک یقین ہے، وجود کائنات بھی
ہے منحصر، تو صرف ایک شخص کے درود پہ

بتوں کو اپنے نفس کے، مدام پوجتے رہے
تو انگلیاں اٹھائیں کیوں، یہود یا ہنود پہ

ریاضتوں کی مشق ہی سفر قلم کا طے ہوا
مری نگاہ کب گئی ہے نام یا نمود پہ

بغاوتیں بھی کی ہیں، دل میں کیسے کیسے رن پڑے
مگر نہ زد پڑی، کوئی ضمیر کی قیود پہ

نجوم کا ہجوم چرخِ نیل فام پر عیاںؔ
کہ جیسے بادلا کڑھا ہو چادرِ کبود پہ

مصطفیٰ شباب

واپسی

میں شاید لوٹ آیا ہوں
جہاں سے کوئی بھی جا کر
کبھی واپس نہیں آتا

اندھیرا چیرتی
جب میری پتھرائی ہوئی آنکھیں کھلیں
تو رفتہ رفتہ مجھ کو کچھ سائے نظر آئے
تھکے ہارے، افسردہ، منتشر سے
نہ ہونے والے معجزے کے منتظر سے...

انتساب - ۵۷

قیصر نجفی

غزل

بے ترتیب سی دل میں دھڑکن لئے ہوئے
پھرتے ہیں ہم لوگ لبوں کو سیے ہوئے

ملتے ہیں ہر ایک سے جھینپے جھینپے سے
جیسے ہم ہوں جرم سا کوئی کئے ہوئے

جانے کیسا نشہ ہے اب تک اترا نہیں
ایک زمانہ بیت گیا ہے پئے ہوئے

آج اسی کو دار پہ کھینچ کے آئے ہیں
جس کی مسیحائی سے ہم ہیں جئے ہوئے

وہ داتا ہے، کام ہی اس کا دینا ہے
کیا بتلائیں کیا کیا ہے وہ دئے ہوئے

یہ قیصر کن راہوں پر ہم جا نکلے
مر مٹنے کا جذبہ دل میں لئے ہوئے

غزلیں

انور شیخ

لندن

سمجھا نہیں میں یارا جیون بھی کیا تماشہ
سب ہی مجھے گوارا جیون بھی کیا تماشہ

باتیں بڑی بناؤ حوریں کہاں ہیں زاہد
کیسے کریں گزارا جیون بھی کیا تماشہ

کیسے بتاؤں بیگم آنکھیں کھلی ہیں جب سے
خاوند ہوں تمہارا جیون بھی کیا تماشہ

قسمت کی بات ہے یہ سمجھے تھے تم کو شبنم
نکلے مگر شرارا جیون بھی کیا تماشہ

سورج ہے یا کہ چہرہ مثل حجاب یارب
کیسے کریں نظارا جیون بھی کیا تماشہ

میں تو قدم قدم پر یم راج سے لڑا ہوں
انور مگر نہ ہارا جیون بھی کیا تماشہ

ہو تم صنم تلخ ہو یا کہ شیریں
مگر محترم تلخ ہو یا کہ شیریں

ہمارے ہو تم اب گلہ کچھ نہیں ہے
خدا کی قسم تلخ ہو یا کہ شیریں

محبت کرو یا نہ اب سب ہے یکساں
نہیں کوئی غم تلخ ہو یا کہ شیریں

اُچکے نہیں ہم ، ہیں عاشق تمہارے
یہ اپنا دھرم تلخ ہو یا کہ شیریں

کوئی گر کہے بت کدہ تو سنیں کیوں
ہو تم تو حرم تلخ ہو یا کہ شیریں

کرو کچھ ہمیں تم ستاؤ ہنساؤ
تمہارے ہیں ہم تلخ ہو یا کہ شیریں

جہنم بھی ہو تو میں سمجھوں کہ جیسے
سراپا ارم تلخ ہو یا کہ شیریں

تقاضے محبت کے انور نرالے
ضروری بھرم تلخ ہو یا کہ شیریں

غزل

سلطانہ مہر
لاس اینجلس، امریکہ

کتنا ہی کوئی ہنس لے جب خوشی نہیں ہوتی
جشن جبر ہوتا ہے وہ ہنسی نہیں ہوتی

حادثات دنیا سے ڈر گیا ہے دل اتنا
اب خوشی کے موقع پر بھی خوشی نہیں ہوتی

ہم سے پوچھو گلشن میں گل کی وجہ بے قدری
بے حسی تو ہوتی ہے بے بسی نہیں ہوتی

بے عمل پہ ہوتی ہوں جس میں لاکھ تعزیریں
چاہے اور کچھ کہہ لو، زندگی نہیں ہوتی

تم چمن کے رکھوالے ہو اگر تو پھر تم کو
گریۂ کلی سے کیوں بے کلی نہیں ہوتی

مہر بات کرنے سے پہلے سوچ لیں ورنہ
بات لب سے جب سے نکلی آپ کی نہیں ہوتی

"یہ ہاتھ پروردگار سارے"

یہ دست محنت جنھوں نے دھرتی کو چیر کر بالیاں اُگائیں
یہ دست محنت جنھوں نے پھولوں سے کان کی بالیاں بنائیں
یہ دست محنت جنھوں نے گہرائی سے نکالا زمین کا جل
یہ دست محنت جنھوں نے انکھڑیوں میں سجایا کاجل
یہ دست محنت جو زلف گیتی کے بانکپن کو نکھارتے ہیں
یہ دست محنت جو اک سلیقے سے اپنے گیسو سنوارتے ہیں
یہ دست محنت جو پگھلے فولاد سے مشینوں کو ڈھالتے ہیں
یہ دست محنت کا ممتا بن کے ننھے بچوں کو پالتے ہیں
بغیر لاٹھی لئے بھی جو ہاتھ شرطیہ سانپ مارتے ہیں
بغیر پرکار کے بھی جو ہاتھ گول روٹی اُتارتے ہیں
یہ ہاتھ جو بُن رہے ہیں کپڑا یہ ہاتھ جو روئی دھن رہے ہیں
یہ ہاتھ جو جاگتے میں خوب سپنوں کی ایک زنجیر بُن رہے ہیں
یہ ہاتھ محنت کے ہاتھ سارے یہ ہاتھ باغ و بہار سارے
انہی عظمت پہ سر جھکاؤ، یہ ہاتھ پروردگار سارے

غزل

پھول کو خوشبو ، زمینوں کو گھٹا دیتا ہے
جتنا درکار ہو وہ اُس کے سوا دیتا ہے

یہ دُعا ہے کہ میسر ہو اُسے دل کا سکوں
ہجر میں جو مرے زخموں کو کھلا دیتا ہے

چپ رہوں گر تو پھٹا جاتا ہے سینہ میرا
اور اگر بولوں تو وہ مجھ کو سزا دیتا ہے

وہ مرے حق میں کوئی بات کہے یا نہ کہے
ایک یہ دل کہ اُسے پھر بھی دعا دیتا ہے

رت جگا اُس کے مقدر سے بھی کچھ دور نہیں
جو مری راتوں کی نیندوں کو اُڑا دیتا ہے

اُس کی باتیں جو سنیں تو ہوا ہم پر ظاہر
وہ ہی جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

مامون ایمن
نیویارک

رباعیات

خوش باش، طرح دار جوانی پائی
جو رُت بھی جہاں پائی، سُہانی پائی
میں شکر بجا بجا لاتا ہوں رب کا، ایمنؔ!
قطرہ تھا پہ دریا کی روانی پائی

☆

تقدیر کو اک روز سنورنا ہوگا
جینے کے لئے فرد کو مرنا ہوگا
منزل نما اک موڑ پہ آکر اک دن
غم ہو کہ خوشی ، سب کو ٹھہرنا ہوگا

☆

پردیس کے ہر غم کو اُچھالا جائے
یہ کام کبھی کل پہ نہ ٹالا جائے
ہجرت کے ستاروں کو بچاکر رکھیں
ایسا نہ ہو دھرتی سے اُجالا جائے

☆

تنہائی کو محفل جو بنا سکتا ہے
جینا وہ زمانے کو سکھا سکتا ہے
منزل کو سمجھتا ہو جو رستہ یکسر
ماحول سے باہر وہی جا سکتا ہے

☆

غزلیں

احمد مسعود
نوٹنگھم

خوش نصیبوں میں تھا شمار کبھی
ہم سے بھی تھا کسی کو پیار کبھی

شب مری خیر سے کٹی ہے کہاں
ظلمتوں سے مری بنی ہے کہاں

کس قدر تھا میں ذی وقار کبھی
میں کسی کا تھا اعتبار کبھی

ہر قدم پہ ہے موت کا منظر
کوئی دیکھے تو زندگی ہے کہاں

کوئی میرے لئے رہا بے چین
میرا بھی دل تھا بیقرار کبھی

رہنماؤ دھواں دھواں ہے فضا
ہوگئی صبح! روشنی ہے کہاں

ایک صورت بسی تھی آنکھوں میں
ایک خوشبو کا تھا خمار کبھی

آگ بن میں لگی تھی، بجھ بھی گئی
جو لگی من میں وہ بجھی ہے کہاں

اب غموں کا کوئی حساب نہیں
میری خوشیاں تھیں بے شمار کبھی

تیری آنکھوں میں یہ نمی کیسی
تیرے ہونٹوں کی وہ ہنسی ہے کہاں

پاس میرے نہیں پتے اُن کے
پیار تھا جن نے، جو تھے یار کبھی

تیری باتوں میں فلسفہ ہے بہت
تو ہے شاعر تو شاعری ہے کہاں

دل سے جاتی نہیں خزاں کی رُت
اِس میں آئی تھی کیا بہار کبھی

تجھ کو دعوئی ہے عشق کا مسعودؔ
تو ہے عاشق تو عاجزی ہے کہاں

اُس نے بھی دُکھ مجھے دیا مسعودؔ
وہ جو میرا تھا غمگسار کبھی

غزلیں

اقبال مرزا
لندن

آدمی لاکھوں تھے کم انسان تھے
کچھ سگِ دنیا تھے کچھ شیطان تھے
کس نے چھینی ان کے چہروں سے ہنسی
چلتے پھرتے لوگ کیوں بے جان تھے
حشر تک پھیلائیں گے جو روشنی
باخدا وہ صاحبِ ایمان تھے
آگ ، شعلے ، بجلیاں ، طوفان ، ہجر
رات میرے گھر میں یہ مہمان تھے
چاند تارے پھول خوشبو چاندنی
تو نہیں تو سب کے انجان تھے
ہوگئے ناپید اب دنیا سے وہ
جو غالبؔ کل تلک گنجان تھے
دن کے ہنگامے تو دن تک ہی رہے
رات میں سب راستے سنسان تھے
ان کو لے ڈوبا ہے ان کا ہی غرور
کل تلک یہ بھی بڑے دھنوان تھے
ساز نغمے گیت اور میری غزل
سب تری آواز پہ قربان تھے
مانگنے بیٹھے وفاؤں کا صلہ
تم بھی مرزاؔ کس قدر نادان تھے

تم نہ آئے تو بات کب ہوگی
شام سے پہلے رات کب ہوگی
جل رہا ہے جگر کا ہر گوشہ
مرزا اس سے نجات کب ہوگی
بس یہی ہے پھر اس کے بعد کہاں
دوسری کائنات کب ہوگی
یاد کے پھر دیے جلائے ہیں
ان کی دیکھیں وفات کب ہوگی
میں بھی غارِ حرا میں بیٹھا ہوں
قلب پہ واردات کب ہوگی
جس پہ نازاں ہو ہر بشر مرزاؔ
اس طرح کی حیات کب ہوگی

☆

روشنی میں بھی روشنی کم ہے
زندگی میں بھی زندگی کم ہے
ویسے گلشن بھی ہے بہار بھی ہے
گل کھلے ان میں تازگی کم ہے
جس کو دیکھو وہی اداس اداس
اس زمانے میں کیوں خوشی کم ہے
نام کا بھی اثر ہوا نہ کوئی
شانتی نام شانتی کم ہے
ہم کہاں تک نہ دوش دیں خود کو
زندہ رہ کر بھی آگہی کم ہے
کچھ تدارک کرو میاں مرزاؔ
دوستوں میں بھی دوستی کم ہے

جاوید چودھری
برمنگھم

پاسباں لفظوں کی حرمت کے

میں اک ڈربہ نما کمرے میں بود و باش کرتا ہوں
میں اپنے ہاتھ سے رکھی ہوئی چیزوں کو اکثر بھول جاتا ہوں
میں دن بھر کی تھکن جب دور کرنے کے لئے بستر میں جاتا ہوں
لباسِ شب خوابی پہنتا ہوں
میں اپنے سر سے جب چپکی ہوئی وگ کو ہٹاتا ہوں
الگ کرتا ہوں آلاتِ سماعت کو میں اپنے کانوں سے
پرے کرتا ہوں عینک کو میں جب بے نور آنکھوں سے
بہت مغموم ہوتا ہوں
ڈبوتا ہوں کسی محلول میں مصنوعی دانتوں کو
بگڑ جاتا ہے چہرہ آئینے کے سامنے آکر
مجھے بیتے ہوئے ایام پھر سے یاد آتے ہیں
تو جیسے آئینہ کوئی چیخ کر ٹوٹ جاتا ہے
مگر پھر بھی --- خدا کا شکر ہے
کہ اس نے باقی رکھی ہے
میرے ہاتھوں کی طاقت اور حرمت بھی قلم کی
مرے مالک ---
مجھے مہلت بھی دینا تو
مجھے توفیق بھی دینا
کہ میں تیری امانت کو
حوالے اُن کے کر جاؤں
کہ جو ہیں پاسباں لفظوں کی حرمت کے
مگر ہرگز نہ اُن کے
کہ جو الفاظ کو تیر و تفنگ کی شکل میں ڈھالیں
اور پھر --- خلق کے درپئے آزار ہو جائیں۔

شاہین فصیح ربانی
کراچی

ماہیے

قرآن نے بتایا ہے
اللہ نے انساں کو کمزور بنایا ہے!

☆

کوئی خواب سہانا ہو
گلیوں کو سجاؤں میں اور آپ کو آنا ہو

☆

کوئی پیڑ کھجوروں کے
تنہائی میں روتے ہیں دل ہم مجبوروں کے

☆

پانی چڑھا سونے کا
یہ فائدہ پایا ہے ترا عاشق ہونے کا

☆

تاروں کی مدھم لَو
ان ہجر کی راتوں میں ہمیں یاد تم آتے ہو

☆

اک چھاؤں میں رہتے ہم
پازیب اگر ہوتے ترے پاؤں میں رہتے ہم

☆

پیپل کی پناہوں میں
راحت ہے جہاں بھر کی ترے پیار کی بانہوں میں

پرویز مظفر
برمنگھم، انگلینڈ

غزل

کہنا آسان ہے، مشکل سے نکالیں خود ہی
یاد اپنی وہ مرے دل سے نکالیں خود ہی

دل کشی ان میں بھی کم گیسوئے برہم سے نہیں
پیچ و خم جادۂ منزل سے نکالیں خود ہی

ان کی الفت نے ہی پہنچایا ہے اس حالت کو
تیر کو سینۂ بسمل سے نکالیں خود ہی

جان ایسی ہی اداؤں پہ تو ہم دیتے ہیں
خود بلاتے ہیں وہ محفل سے نکالیں خود ہی

ہم کو طوفانوں نے کیوں بھیج دیا تھا واپس
کشتیاں پنجۂ ساحل سے نکالیں خود ہی

خطۂ غیر میں پرویز ہمیں کون بچائے
خود کو ہم نرغۂ قاتل سے نکالیں خود ہی

اطہر رضوی

غزل

دل میں اب ایک نیا وہم و گماں ہو جیسے
جو اشارت تھی وہی حرف و بیاں ہو جیسے
موسمِ ذات زمستاں کے قریں لگتا ہے
اور یہ بے نام سی منزل کا نشاں ہو جیسے
کوئی خواہش، نہ تمنا، نہ توقع، نہ گلا
اور یہ کیفیت اب راحتِ جاں ہو جیسے
یہ ہے معراجِ محبت یا عقیدت کا جنوں
ایسا لگتا ہے وہ ہر وقت یہاں ہو جیسے
وصف میراث سدا ساتھ رہا کرتا ہے
پاک و شفاف کوئی آبِ رواں ہو جیسے
سوچ کی آنکھیں گئی رات کھلی رہتی ہے
اور ہر سانس پہ دستک کا گماں ہو جیسے
یاد کی چھاؤں میں رہتی ہے گرفتہ خوشبو
دشتِ تنہائی میں گلشن کا سماں ہو جیسے
وہ جو غمگیں ہوں تو اور حسیں لگتے ہیں
گرمیوں بعد! یہاں حسنِ خزاں ہوتا ہے
کوئی آتا ہی نہیں بھول کے دروازے تک
شہرِ گمنام میں ویران مکاں ہو جیسے
مشورہ کس سے کریں کس سے ہدایت چاہیں
شہر میں اب نہ کوئی اہلِ زباں ہو جیسے
محفلِ شعر فسردہ ہے یہاں اُن کے بغیر
در و دیوار کو احساسِ زیاں ہو جیسے

پروین شیر، کینیڈا

کب تک آخر

پو پھٹتے ہی
آوازوں کے
گھنے گھنیرے
جنگل کے کونے کونے سے
دکھ کے نغمے
قطرہ قطرہ
ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ
ان کانوں میں گر جاتے ہیں
درد کے منظر
قریہ قریہ
قطرہ قطرہ
سوکھی آنکھیں چن لیتی ہیں
دل کی کھائی
جل تھل جل تھل
ہو جاتی ہے!
دن ڈھلتے ہی
ہو کا عالم سوکھی راتیں
بھیگا تکیہ
دیواروں پر چلتی چھایا
شور مچاتا
گونگا ماضی
ایسا عالم
کب تک آخر
کس سے پوچھوں؟

مقصود الٰہی شیخ

زوال، لازوال

صبح طلوع ہو رہی تھی

آسمان سے پھوٹتا اور زمین پر پھیلتا اجالا

اس کی نظروں سے اوجھل تھا کہ کھڑکیوں پر ابھی پردے پڑے ہوئے تھے۔

زاری کی حالت میں اس کی آنکھیں بند تھیں۔

نماز کے بعد وہ مراقبے میں چلا گیا۔

پھر،

اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے،

لرزاں ہونٹوں سے پہلا ہی لفظ نکلا ہوگا کہ

بھاری پپوٹوں اور مقفل پلکوں کی باڑھ چیر کر اشک رواں کی نہر بے قابو ہو گئی۔

بے وفا نہ کوئی دوسرا .... وہاں تھا!

وہ تو ہوگا

جو دکھائی نہیں دیتا مگر دیکھتا ہے

جس کی صدا نہیں پر معجزوں میں بولتا ہے۔

جس کی سماعت میں نہیں مگر سنتا ہے۔

شہ رگ سے قریب ہے!

کوہ و صحرا و سمندر میں،

سبزہ و گل میں،

شبنم میں،

مہیب و مقدس تاریکی میں،

کرنوں میں،

روشنی میں،

صدف میں،

پاک ومعصوم دلوں میں،
نور،
ہر سو ہر طرف موجود ہے۔
اس نے،
اس سے کہا
اگر یہی مقدر ہے تو مجھے صدموں کے یہ پہاڑ اٹھانے، سہارنے کی طاقت دے، مولا!
برداشت کرنے کی قوت بھی عطا کر او بے پرواہ!۔
بسمل نہ بنا،
بخل سے کام نہ لے،
رحم کر، فضل فرما، اندھیروں میں، یاسیت میں ڈھل رہے لمحوں سے بچا!

نیا ملک تھا، ۔
اجنبی شہر میں وہ اکیلا!
اب یہاں اس کے بچے، ان بچوں کی اولاد ہے۔
اولاد کی اولاد، جن کے نام یاد، بے شمار انگلیوں سے نکل رہا ہے۔
جب اکٹھے ہوتے ہیں،
ایک بھیڑ ہوتی ہے، میلہ سا لگ جاتا ہے۔
کوئی کمی نہیں۔
سب، میں ......

پھر بھی وہ اکیلا ہے!

اس نے تنہائی کی چبھن کو ناشکری جان کر توبہ بھی کی تھی پر اکیلے پن کی اذیت آتا جاتا سانس بن گئی تھی۔ اس سے چھٹکارہ نہ کوئی نجات تھی۔ زمین پر، لیٹے لیٹے بدن اکڑ گیا۔ کروٹ لینی مشکل، اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ سوچ ہی مونس بنی، لپٹی ہوئی تھی۔ "بہت دیکھ سن لیا۔ خوشی اور غم برت لیا"۔ اس کے اندر بے سبب تمنا جاگی "اے مالک! اٹھا بھی لے۔ اس دنیا سے جی بھر گیا۔"

جی بھر کر اس نے زمرد کو دیکھا نہ تھا۔ ڈرتا تھا نظر نہ لگ جائے۔ گن من کرتے دن، کول راتیں گننے سے پہلے وزد پا اجل آئی اور جل دے گئی۔ چاند چہرہ زمرد کو چھین کر لے گئی۔ رہ گئی حسرت کہ سامنے بٹھا کر دید کیا کرتا، خواہ یہ لمحے لاطویل ہوتے! واقعی، اس کے مرنے کے دن نہ تھے۔ اس نے بیوی کو ڈانٹا نہ وہ روٹھی! میاں بیوی میں کبھی کچھ ہوتا ہے۔ مہلت ہی نہ ملی جیسے اڑتے اڑتے پتنگ کٹ جاتی ہے ان کی بیاہتا زندگی انت ہوگئی۔ بے چاری، نو جوانی، نوعمری میں ناشاد گئی! تین سال میں دو ننھی منی ستانیاں، وچھوڑے کی سوغاتیں عدنان، عذرا یا پھر اپنی دکھ بھری بیماری کی یاد چھوڑ گئی۔

مغموم چھوڑ کر جانے والی محبوب صورت، زمرد کو، سپرد خاک کرتے ہوئے پاس نے عہد کیا تھا کہ بچوں کو کبھی ناخوش نہ ہونے دے گا۔ ان ننھے پھولوں کو کمہلانے، مرجھانے نہ دے گا۔ اپنے بچوں کو سنگل پیرنٹ بن کر ہی پالے گا۔ واپس گیا تو سگے عزیز رشتہ دار ہمدردی کی دودھاری چھری چلا چلا کر بچوں سے اپنائیت ظاہر کریں گے اور بھیتر بھیتر بچوں سے محرومی و کمتری کا نمونہ بنا دیں گے۔ اس کا گھر بسانے کے بہانے کسی ایسی خاتون کو اس کے سر منڈھ دیں گے جو والدین پر بھاری ہو چکی ہوگی۔

پھر،

بچے سیانے ہوئے۔

یہ تو ہونا تھا مگر وہ بھی ہوا جو نہ ہونا تھا۔

اس کے پاس،

بس یادیں رہ گئیں۔

وطن یاد آتا، گھر یاد آتا!

وہاں سکھ تھا آرام تھا۔ یہاں صبح سے شام کرنا مشکل تھا۔ یا نہ مددگار۔ شروع میں وہ جھنجھلایا کرتا۔ بچوں کو تیار کرنا، نرسری میں چھوڑنا۔ خود دفتر جانا۔ وہاں سے آکر گھرداری، چولہا چوکی! دیر گئے فرصت ملتی۔ بچوں کی وجہ سے دن میں تھوڑی بہت ''ہوم ہیلپ'' مل جاتی تھی مگر رات کو دکھ بیماری میں وہی دونوں بچوں کو سنبھالتا۔ وحشت تھی، تھکن تھی اور وہ تھا! آہستہ آہستہ اس کا دل لگ گیا۔ بچوں کی محبت میں سرشار، اسے یہ سب اچھا لگنے لگا۔ کبھی بیٹا پیارا لگتا اور کبھی لگتا نہیں اس کی جان تو بیٹی میں ہے۔ ویک اینڈ پر وہ مشین بن جاتا۔ بچے سو رہے ہوتے وہ لانڈری ہو آتا۔ جلدی جلدی استری کرتا۔ بچے اٹھتے، انہیں نہلاتا دھلاتا پھر وہ سب اکٹھے ناشتہ کرتے۔ عذرا ابو کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتی۔ وہ کرسی کھینچ کر سنک تک لے آتی۔ اس پر کسی نہ کسی طرح چڑھ کر کہتی ''آپ اتنے ڈھیر سارے برتن نہیں دھو سکیں گے۔ یہ کام میں کرتی ہوں۔ آپ بھائی کے اسکول کا کام کرا دیجئے۔ وہ

''اچھا'' کہہ کر اس کے منے منے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیتا۔ عذرا مجھتی وہی سچ مچ برتن دھوتی ہے۔ وہ بڑے مزے کی باتیں کرتی۔

''ابو!'' نائٹ رائیڈر والی کار لے لیجئے''

''بڑی مہنگی ہے۔ مت بھولو اپنی کار بھی اس سے کم نہیں!''

''اچھا؟ کیا اپنی کار بھی اسی کی طرح باتیں کرتی ہے؟''

اور وہ اپنی جان سے پیاری گڑیا کو گھڑ گھڑ کر قصے سناتا۔ عذرا یہ سب درست مان لیتی۔ عدنان کبھی کبھی شک ظاہر کرتا، ٹھنک کر کہتا ''عذرا! ابو تمہیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔ سب من گھڑت ہے۔ جب ہم کار میں ہوتے ہیں تب وہ کوئی بات کیوں نہیں کرتی؟''

''بھائی! آپ تو بے وقوف نہیں؟ کل پرسوں، ابھی تھوڑی دیر پہلے، آپ نے بھی کئی باتیں مان لی تھیں۔ کیا آپ کے سوالوں کے جواب ابو کار سے پوچھ کر نہیں بتاتے؟ جواب تو کوئی نہیں گھڑ سکتا!'' عذرا عقل لڑاتی۔

چھٹی اور اتوار کے دن وہ انہیں کہیں نہ کہیں گھمانے پھرانے لے جاتا۔ ہائیڈ پارک تو اکثر ہی جایا کرتے۔ کئی دوست مل جاتے۔ سب کو معلوم تھا بچے اس کی کمزوری ہیں اس کی پوری دنیا ہیں۔ بچوں کے بغیر اس کا تصور کرنا چھوڑ دیا گیا تھا۔ بچے ہر جگہ ہر مقام پر اس کے ساتھ ہوتے۔ دن تتلیاں تھے۔ اڑ رہے تھے اور یہ تینوں پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

اس روز جب عذرا نے اسکول سے آتے ہوئے کار اور اس کے درمیان مکالمے کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا۔ وہ حیران ہوا۔ اسے یاد آیا، کچھ عرصہ سے یہ موضوع ہی زیر گفتگو نہیں آرہا۔ عدنان اسکول سے آکر اپنے کمرے میں مشغول تھا۔ عذرا اپنے اور اس کے لئے چائے لینے کچن میں چلی گئی۔ عذرا چائے لے کر آئی تو اس نے مسکرا کر بیٹی کو خوشخبری سنائی ''تمہیں کل ہی، نیا ڈریس لے دوں گا''۔

''ابھی، پچھلے ہفتے، آپ نے سالگرہ پر اتنا شاندار ڈریس دیا ہے''۔

''بھولا تو نہیں، وہ مجھے یاد ہے''۔

''پھر؟'' عذرا حیران حیران تھی۔

اس نے چہرے پر سنجیدگی طاری کر کے کہا ''نئے ڈریس کی سفارش کار نے کی ہے''۔

عذرا کھلکھلا کر ہنس پڑی،

''اب نہیں بنوں گی۔ ابو! میں بڑی ہو گئی ہوں!!''

بڑے وہ دونوں ہو گئے تھے۔

بہن کے ساتھ بھائی مل کر، اپنے ابو کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ ہفتے کو سب دیر تک سوتے۔ ناشتہ ناغہ۔ برنچ (بریک فاسٹ+لنچ) کیا جاتا۔ سب مل کر ایسا پکوان بناتے جو صبح کے ناشتے اور دوپہر کے کھانے کا بدل ہوتا۔ اتوار کو بچے ذرا پہلے اٹھتے اور ابو کے لئے ناشتہ بناتے۔ روز و شب اچھے گزر رہے تھے۔ اپر اسکول میں گئے تو بچوں نے اور بہت سے کام اپنے ذمے لے لئے۔ لانڈری، استری، شاپنگ پر وہ ساتھ جاتے مگر کیا لانا ہے؟ اس کا دردِ سر نہ رہا تھا۔ وہ دفتر سے آتا، عمر کا تقاضا ہوگا، تھک سا جاتا۔ کبھی عذرا، کبھی عدنان چائے لا کر سامنے رکھتا۔ دونوں اپنی پیاری پیاری باتوں سے لبھاتے۔ اس کی ساری تھکن دور ہو جاتی۔ عدنان تھوڑا شریر تھا۔ کھلنڈرا تھا۔ پاکستانی والدین بچوں کو لاڈ پیار کے ساتھ ساتھ تمیز سکھانے کے خیال سے ڈانٹ ڈپٹ بھی لیتے ہیں یعنی کھلاؤ سونے کا نوالہ رکھو شیر کی نظر! بلکہ بعض پٹائی کرنے سے بھی باز نہیں رہتے۔ وہ بھی بیٹے کو نادانی پر ٹوکا کرتا تھا۔ لڑکوں میں غابنانا معمولی بات سمجھی جاتی تھی۔

لیکن یہ کوئی معمولی بات نہ تھی، پہلی بار اسکول کی رپورٹ خراب آئی تھی۔ باپ نے عدنان کے کان مروڑنے کے بعد ایک طمانچہ جما دیا۔ ہاتھ کچھ زیادہ ہی زور سے پڑا ہوگا دوبارہ ہاتھ اٹھتے دیکھ کر، عدنان بچنے کے لئے پیچھے ہٹا تو میز سے ٹکرا گیا جس پر ابلے انڈے چھیلے رکھے تھے، انڈے فرش پر گر پڑے۔ قالین کا سارا رواں انڈوں سے چپٹ گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک انڈہ مٹھی میں لے کر بھینچا اور سارا ملغوبہ عدنان کے منہ پر مل دیا۔ عدنان بلک بلک کر رو دیا۔ چوٹ لگی سو لگی، منہ پر چپکا لجلجا انڈہ بہت برا محسوس ہوا ہوگا۔ اس کا رونا ایسا دہلانے والا تھا کہ عذرا بھی رونے لگی۔ وہ خود بڑا رنجیدہ ہوا۔ تھوڑی دیر بعد عدنان سے "سوری" کہا۔ عدنان کچھ نہ بولا۔ دو روز تک چپ رہا۔ خاموش اپنے کام سے کام رکھا۔ تیسرے دن تناؤ کم دیکھ کر عذرا نے ہنستے ہنستے شرارتاً شکایت کی "ابو اسے کچھ نہ کہا کیجئے ورنہ یہ 999 ڈائل کر کے پولس بلا لے گا۔" عدنان بہن پر جھپٹا مگر باپ نے پکڑ لیا اور پیار سے ڈانٹتے ہوئے جھوٹ موٹ اس کی ناک صاف کرتے ہوئے کہا "بہت تنگ کرتی ہے۔ آج کاٹ کر ہی پھینک دیتے ہیں! عدنان کا منہ لال بھبوکا ہو گیا۔ ابو کی گرفت سے بعجلت نکلا اور دور جا کر فرش پر سے کچھ اٹھا کر اپنے منہ پر لگا لیا "یہ کیا، یہ کیا؟" عذرا اور ابو نے قطعی غیر متوقع حرکت پر ایک ساتھ پوچھا۔ "آپ نے میری ناک اکھاڑ پھینکی تھی، زمین پر گرنے سے پہلے اٹھا کر واپس لگالی" عدنان نے تڑ سے جواب دیا۔ عذرا ذرا حیران ہوئی پھر ابو کو ہنستے دیکھ کر وہ بھی ہنسنے لگی "عدنان میاں سچ مچ تمہاری ناک تھوڑی اکھاڑ پھینکی تھی"۔ عدنان سنبھل گیا تھا، جھٹ بولا "تو میں نے کب سچ مچ کی جان کر اٹھائی اور واپس لگائی ہے، جہاں تھی وہیں ہے!" پورے ماحول پہ

بشاشت طاری ہوگئی۔

کل کا ہشاش بشاش بچہ عدنان جوان ہو گیا تھا۔ عذرا بڑی خوبصورت، سگھڑ اور سلیقے کی لڑکی تھی۔ باپ پر ایک نظر ڈالتی اور سب حال جان لیتی ''اب آپ تھک رہے ہیں۔ چائے پئیں گے؟''

''ابو کوٹ اور شوز اتار کر ایزی ہو جایئے''''میں چپل لاتی ہوں۔ کپڑے بدل آیئے۔ استری کر کے ہینگر پر لٹکا دیئے ہیں۔''

''رومال میلا تو نہیں ہوا؟ نکال لئے دھو دوں''۔

عذرا کا یونیورسٹی میں پہلا سال تھا، اچانک ایک بہت ہی اچھا رشتہ آیا۔ لڑکے والے پاکستان سے سیر و تفریح کے لئے لندن آئے تھے۔ دور کی قرابت داری تھی۔ انہیں عذرا پسند آ گئی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو گیا اور بیٹی اپنے گھر چلی گئی۔

گھر میں، باپ بیٹا دونوں موجود تھے پھر بھی لگتا سناٹا ہے۔ رونق چلی گئی۔ روز مرہ معمولات بدلنے لگے۔ عدنان دیر سے آتا، کہتا یونیورسٹی میں دیر ہو گئی۔ ایک مرتبہ آدھی رات کو آیا۔ یہ غفلت کی نیند سو رہا تھا۔ عدنان چابی گھر بھول گیا تھا یا گم کر آیا تھا۔ زور زور کی بیل بجی تو ہڑ بڑا کر اٹھا۔ دروازہ کھلتے ہی عدنان بگڑا'' کچھ خبر ہے کب سے گھنٹی بجا رہا ہوں۔ پورا محلّہ جاگ گیا'' اب یہ غصہ سے پاگل ہو گیا۔'' کیا وقت ہوا ہے؟ اتنی رات گئے شریف لوگ گھر آتے ہیں؟'' جانے اس کے اپنے منہ کی بات تھی یا عدنان کے منہ سے بھبکا آیا تھا۔'' کیا شراب پی کر آئے ہو؟'' اس نے آگے دیکھا نہ پیچھے جوان بیٹے کو ادھیڑ دیا۔

دوسرے روز عدنان گھر چھوڑ گیا۔ کھانے کی میز پر رقعہ پڑا تھا۔ رات پی کر نہیں آیا تھا۔ اب پیوں گا۔ کیا کر لیں گے آپ؟؟؟

وہ کر ہی کیا سکتا تھا؟

اس کی دنیا اندھیر ہو گئی۔

پھر جاننے والوں کی زبانی پتہ چلا عدنان گوری لڑکیوں کے ساتھ گھومتا پھرتا ہے۔

تقدیر کا چکر ایسا گھوما کہ اس کی سوچنے کی حس مفلوج ہو کر رہ گئی۔ کسی نے سچ کہا ہے، جوان اولاد کا باپ بے اختیار ہوتا ہے، مجبور ہوتا ہے۔ دل کے ہاتھوں، حالات کی بنا پر، رسوائی کے ڈر سے کچھ کر نہیں پاتا! ناچار وہ بھی چپ ہو کر بیٹھ گیا، بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہنے لگا۔ دل لخت لخت تھا عقل ریزہ ریزہ تھی۔ اس نے بڑی محنت سے اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ کر بچے پالے تھے۔ یہ امید نہ تھی کہ یوں اجڑ کر رہ جائے گا۔ کس سے فریاد کرتا؟ دوسرے والدین اس کے سامنے اولاد کے شکوے کرتے،

گالیاں نکالتے، یہ پھر بھی چپ رہتا۔ اس نے ٹھان رکھی تھی کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے گا۔ یہاں کا ماحول ہی خراب ہے۔ فرار کا یہی تو ایک راستہ رہ گیا تھا کہ زمانے کو برا کہو اور بری الذمہ ہو جاؤ۔ واقعی اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہوا؟ کہاں چوک ہوئی؟ بہت سے سوال آنکھوں کے سامنے تیرا کرتے جن کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ بے بس تھا کہ اس کا دل بچوں کے پیار کا مارا تھا۔

غم واندوہ کا مارا،

وہ اندر ہی اندر گھلتا رہا۔

برف گھلنے کے کوئی آثار نہ تھے،

وہ دروازے پر، رات سے پڑی برف کا ڈھیر دیکھ کر گھبرا گیا۔ مزید برف گرنے کا امکان تھا گویا گھر سے نکلنے یا اندر آنے میں بہت مشکل پیش آئے گی۔ اس نے دفتر جانے سے پہلے راستہ صاف کرنا ضروری سمجھا۔ برف ہٹائی، مشقت اٹھائی، بے حال ہو گیا۔ پسینہ پسینہ ہو کر اندر آیا۔ منہ سوکھ رہا تھا۔ سانس برابر نہ تھا۔ دھڑکن قابو سے باہر تھی۔ اس نے ایمبولینس بلائی اور ایمرجنسی میں اسپتال چلا گیا۔ معائنہ کے بعد داخل کر لیا گیا۔ ٹسٹ ہوئے۔ دل کا معمولی سا حملہ ہوا تھا۔ عدنان بہت یاد آیا ''اسے ہرگز خبر نہیں کروں گا''۔ عذرا بھی یاد آئی۔ فون کرتے کرتے رک گیا کہ یوں پریشانی میں اطلاع دینا ٹھیک نہیں، خواہ روک دوں مگر آئے بغیر نہ رہے گی۔ نہیں، نہیں اس کی گھرداری پر بوجھ پڑے گا۔

وہ گھر جانے کی اجازت نہ ملنے پر اداسی اداسی میں اونگھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد آنکھ کھل گئی، دیکھا عدنان سرہانے بیٹھا ہے۔ وہ اپنے ابو کی حالت پر خاموش خاموش رو رہا تھا۔ دوسرے مریض دونوں کو جذبات میں ڈوبا دیکھ رہے تھے۔ نرس آئی۔ اس نے پردہ تان دیا۔ گلے لگے تو باپ بیٹے کا دل صاف ہو گیا۔

دل تو صاف ہو گیا مگر عدنان پھر بھی گھر نہ آیا۔ جوان بیٹا، دل کا ٹکڑا، اس کا لخت جگر عدنان جانتا تھا کہ باپ ریٹائر ہو چکا ہے۔ اب ہمہ وقت گھر پر ہوتا ہے لیکن عدنان کو یہ سوچنے کی فرصت کہاں تھی؟ اس کی اپنی زندگی تھی۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ ابو کو اب کوئی کام نہیں صرف اسی کا انتظار رہتا ہے۔ اور وہ غنیمت سمجھتا ہے کہ بیٹا کبھی کبھی ملنے آجاتا ہے۔ کاش اس نے سنگل پیرنٹ بننے کا فیصلہ کرتے ہوئے سوچا ہوتا کہ ایک روز وہ پیرنٹ نہیں صرف سنگل رہ جائے گا!!

ایک روز......

عدنان آیا،

سونا گھر خوشیوں سے بھر گیا گویا موسم گل آیا۔اس کے ہمراہ سلویا آئی۔

'' آپ کی بہو'' عدنان نے تعارف کرایا۔

''شادی کرلی؟''

''ایک بیٹا بھی ہے''

''کچھ بتایا بھی نہیں!''

تعجب میں وہ کسی قسم کی خوشی کا اظہار بھی نہ کرسکا۔

عدنان خاموش رہا، سلویا بول اٹھی پہلے تو احتجاج کیا کہ باپ بیٹا ایسی زبان میں کیوں گفتگو کررہے ہیں جو وہ نہیں سمجھتی پھر مزید تلخی دکھاتے ہوئے کہا'' مجھے معلوم تھا اولڈ مین نے تمہارا ناتا اپنی بھتیجی، بھانجی سے جوڑنے کا منصوبہ بنا رکھا ہوگا۔ یہ سب یونہی کرتے ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہاری فیملی مجھے کبھی Accept نہیں کرے گی۔ مجھے یہاں لے کر ہی کیوں آئے؟

اور وہ الٹے پاؤں چلے گئے۔

بے بنیاد، بغیر تعمیر اٹھائے ایک اونچی سی دیوار درمیان آگئی۔

برسوں بعد، اچانک عذرا اور جمال نے آدستک دی ان کے ساتھ دو بچے بھی تھے۔'' ابو ہم آپ کو سرپرائز دینا چاہتے تھے''۔ جمال کسی انٹرنیشنل ادارے میں ملازم تھا۔ وہ یہاں تین سال کے لئے تبادلہ پر آیا تھا۔

اس کی کھردری اور بے مزہ و بے نور زندگی میں چپکے سے بہار آگئی۔ عذرا قریبی بستی میں رہتی تھی۔ اس کا دل چاہتا عذرا اپنے بھائی سے، باپ کی صلح کرادے۔ جانے وہ کیوں الگ تھلگ سی تھی؟ پھر اسے معلوم ہوا کہ بہن بھائی آپس میں ملتے ہیں۔ تعجب تو ہوا کہ اسے بے خبر رکھا گیا مگر یہ اچھا بھی تھا۔ اب وہ عذرا سے کہہ سکتا تھا کہ بیچ میں پڑ کر باپ بیٹے اور اس کے اہل وعیال میں حائل دیوار ہٹانے میں پیش رفت کرے۔ وہ قلباً مسرور ہورہا تھا کہ سب مل بیٹھیں گے۔

وہ ملنے ہی گیا تھا بیٹی داماد اور بچوں سے اکیلے بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تھا، ہمت بنوتی روز جاتا۔ اس کا دل چاہتا کچھ ایسا ہو کہ وہ بے وجہ روٹھ جانے والے بیٹے کے یہاں بھی جاسکے۔ وہ سلویا سے کہے گا کہ اسی نے سب غلط سلط اپنے دماغ میں بٹھا رکھا ہے۔ ایسی کوئی بات سرے سے نہ تھی۔ نالائق عدنان بھی بیچ میں نہ آیا۔

اچانک عدنان اور اس کی بیوی بچے بھی آگئے۔ ممکن ہے اطلاع کرکے آئے ہوں۔ عذرا یا جمال نے ایسا کچھ ذکر نہیں کیا تھا۔ بہر حال یہ بڑا خوش ہوا۔ دو دہنوں کو چھوڑ کر پوتوں کی طرف بڑھا

کترا کے ہٹ گئے۔ بہو نے سلام کیا نہ بیٹے نے! یہ مسمسا کر رہ گیا۔ رنجیدہ ہوا۔ غصہ آیا پر خاموش رہا۔ عدنان کے جانے کے بعد وہ بیٹی پر برس پڑا۔

میری پیٹھ پیچھے بھائی سے ملتی ہو۔

تمہارا فرض تھا اسے سمجھاتیں، معافی منگوا کر صلح کراتیں۔

سلویا کے روکھے سوکھے اور خراب رویہ پر بھی تم لوگ کچھ نہ بولے۔

وہ جانے کیا کیا بکتا جھکتا رہا۔

کچھ دیر بعد محسوس کیا جمال خفگی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا ہے اور عذرا بھی درشت لہجہ اختیار کر چکی ہے۔

''ابو آپ مجھے ڈانٹ رہے ہیں''۔

''ہاں! میرا حق ہے یہ''۔

''اب میں بچی نہیں ہوں''۔

''بچی ہی تو ہو تم، میری! اتنی بڑی نہیں ہوگئی کہ مجھے تمہارے سامنے خاموش رہنا چاہئے''۔

''آپ میرے شوہر اور بچوں کے سامنے میری بے عزتی کر رہے ہیں''۔

''کیا عزت بے عزتی لگا رکھی ہے؟ ایک خون ہو کر غیر جانبدار بننا جائز ہے؟

جمال بول پڑا'' میں دخل نہ دیتا مگر اس کا اثر بچوں پر پڑ رہا ہے۔ ہم ناحق یہاں آئے۔ کہیں اور تبادلہ کرا لیتا۔ عذرا راتوں کو اٹھ کر پہروں روتی ہے۔ آپ نے اپنے بچوں کو پال پوس کر بڑا ضرور کیا مگر حقیقت ہے کہ آپ بہت سخت گیر تھے۔''

اس نے اپنا ناپ کوٹ لیا اور گھر آ گیا۔ یہ سب غیر متوقع تھا گویا اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا۔ جن پر جان چھڑکتا تھا وہی اب اس سے متنفر ہیں۔ عدنان ہی نہیں عذرا بھی ... کبھی برسوں برساتوں میں گھرکا، جھڑکا ہوگا۔ اسے اچھی طرح یاد ہے عذرا کو تو شاید ہی کبھی ڈانٹا ہو۔ اس پر ہاتھ تو ایک بار بھی نہ اٹھایا تھا۔

وہ یہ صدمہ بھی سہہ گیا کہ وقت وقت کی بات ہے۔

وقت کا کیا ہے؟ کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ پل پل کر کے مدت بنتا چلا جاتا ہے۔

مدت بعد، دل سے مجبور، ایک روز پھر وہ بیٹی کے یہاں چلا گیا۔ مبادا وہی کچھ زیادہ حساس نہ ہوگیا ہو؟ واقعی ایسا ہے یا وہم ہے کہ بچے پرے پرے پھر رہے ہیں اور عذرا و جمال کی نشست و برخاست سے سرد مہری جھلک رہی ہے۔ اسے شرمندگی محسوس ہوئی کہ ناحق آیا۔ اتنے عدنان کا فون آ گیا۔ پہلے جمال نے پھر عذرا نے بھائی سے بات کی۔ فون بند ہونے پر اس نے بیٹے کی محبت سے

مغلوب ہو کر خیریت پوچھی کچھ تجسس ظاہر کیا کچھ کردید کی۔ عذرا نے برا منایا اور اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ یہ اپنی جگہ بیٹھا جلتا بھنتا رہا۔ جمال نے بھی کوئی بات نہ کی۔ عذرا چائے لائی تو اس نے پوچھا "کیوں بھئی خفا ہو؟ بیٹی نے جواب نہیں دیا۔ باپ نے تلخی سے پوچھا "میرا آنا ناگوار گزرا؟"

عذرا بولی "میں بیچ میں نہیں آنا چاہتی۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ جمال اور میں کوشش کر چکے ہیں۔ عدنان اور سلویا دونوں نے کہہ دیا ہے، دخل دیا تو تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔"

ٹوٹ وہ گیا تھا، بکھر گیا تھا وہ۔ باپ تھا۔ اپنی دانست میں قصوروار بھی نہ تھا بلکہ اسے فخر تھا کہ زمرد کے اٹھ جانے کے بعد بچوں کی پرورش ماں اور باپ دونوں حیثیت سے کی۔ ان کے بالغ ہونے تک، نگہداشت کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ یہی پچھتاوا تھا۔ یہی پریشانی تھی" آخر پتہ تو چلے کہ اس نے کون سا گناہ کیا ہے؟ کون سا ظلم توڑا ہے جس کا یہ بدلہ دیا جا رہا ہے۔

نیکی کا بدلہ یہی ہے کہ نیکی کرنے والے کو دریا میں ڈبو دیا جائے!

چاہا اس نے بھی یہی تھا کہ ڈوب مرے بیچے، اب اسے آئینہ دکھانے لگے تھے!

اس روز جمال نے پھر سخت گیری کا طعنہ دیا تھا، آپ کی یہی بات ہمیں اچھی نہیں لگتی، جمال نے کہا تھا، آپ عدنان کی پٹائی کیا کرتے تھے؟ عذرا اپنی جگہ سہمی سہمی رہتی تھی۔ آج بھی آپ کے سامنے بولتے ہوئے اس کی جان نکلتی ہے۔" وہ تڑپ اٹھا" عذرا...... عذرا! تمہیں کبھی چھوا تک نہیں اور تم نے مجھے سخت گیر بتا کر بدنام کر رکھا ہے۔ کھلائے کا نام نہیں، رلائے کا نام ہو گیا۔" اس پر غم و غصہ سوار تھا" بچپن کی مار پیٹ کوئی بچہ دل پر لکھ کر نہیں رکھ لیتا"۔ اپنی حرماں نصیبی پر اس کا دل رو رہا تھا " عدنان حرامزادہ تھا پر بیٹی! مجھے تم سے ایسی توقع نہ تھی۔ دو انڈے، دونوں ہی گندے! مرنے والی مر گئی اور یہ نمونے، نشانیاں چھوڑ گئی۔ جنون میں وہ بکتا چلا جا رہا تھا۔

"ابو! آپ میری مری ماں کو کوس رہے ہیں"۔

بات بہت بڑھ گئی۔ ماحول بگڑ گیا۔ وہ بھنا کر باہر آ گیا اور گیٹ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ روح چیخ رہی تھی، پکار رہی تھی" آؤ مجھے واپس اندر لے چلو۔ میں غصے میں بکتا رہا ہوں مگر میرے بچو! مجھے تم سب سے محبت ہے۔ کیا میری قربانیوں کا یہی صلہ مجھے ملنا تھا؟ اس وقت بھی دیکھو تو میری جھلمل آنکھوں میں فراک پہنے ایک گڑیا کھڑی ہے۔ وہ میرے لئے منے منے ہاتھوں میں چائے کا مگا لئے تول تول کر قدم رکھتی آ رہی ہے، کہیں چائے قالین پر نہ گر جائے۔ ادھر گول مٹول عدنان ہے جسے سبق یاد نہ کرنے پر ڈانٹتے ہوئے الو کا پٹھا، حرامزادہ کہا تو اسے بہت برا لگا۔ روتا جاتا ہے اور کہتا جاتا ہے استانی ماں کہتی ہیں جو گالی بکتا ہے وہی یہ سب ہوتا ہے!! نادان بچے

کے بھولپن پر باپ کا غصہ رفع ہوگیا تھا۔ اس نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا تھا۔

خیال جھٹک کر حقیقت کی دنیا میں آ کر دیکھا وہ ابھی بیٹی کے دروازے سے لگا کھڑا ہے۔ کچھ رفع دفع نہیں ہوا تم بھی بڑے ہو گئے ہو...... میرے باپ بن گئے ہو...... میں، میں چھوٹا ہو گیا ہوں...... اور وہ سسک سسک کر رونے لگا۔ شاید پاس سے کوئی گزر رہا تھا۔ وہ سنبھلا۔ اس نے شدید خواہش سے مغلوب ہو کر، پلٹ کر دیکھا۔ عذرا نہ جمال کسی نے باہر جھانکنے تک کی زحمت نہ کی تھی۔ وہ مایوس، مایوس، بھاری قدموں سے کار تک آیا اور اپنے کنج تنہائی کی طرف روانہ ہو گیا۔

رواں وقت کا دھارا رُکا ہے نہ رُکے گا۔ اسے کچھ خبر نہیں، عذرا اور جمال یہیں ہیں یا واپس چلے گئے، عدنان کہاں اور کس حال میں ہے؟ اس کے کتنے پوتے ہیں؟ وہ سب کو فراموش کر بیٹھا۔ زمرد بھی یاد نہیں آتی۔ یہ کون سا عالم ہے؟ دل پر پتھر رکھ لیا۔ دامن سے ساری یادیں جھٹک دیں۔ انسان چاہے تو کیا نہیں کر سکتا؟؟

ایک روز،

اس روز شہر کے جانے مانے سماجی لیڈر شیر افگن دو چار ہم وطنوں کے ساتھ آئے اور اسے ہیٹن کے نئے قائم ہوئے ایشیائی بزرگوں کے ''ہوم'' میں لے گئے۔ شیر افگن نے کہا'' آپ تعلیم یافتہ ہیں۔ دیکھئے یہ سب ان پڑھ اور گردوپیش سے بے نیاز اپنے ماضی میں لپٹے رات دن کس اذیت میں بسر کر رہے ہیں۔ اپنا اخبار یہ پڑھ نہیں سکتے۔ کسی سے انگریزی میں اپنی ضرورت تک بیان نہیں کر سکتے۔ کوئی پرسان حال نہیں، بات کرنے کو ترستے ہیں، کیا آپ ان کے لئے تھوڑا سا وقت نکال سکیں گے؟

اس کے پاس وقت ہی وقت تھا۔ جیب میں اور کوئی سکہ ہی نہ تھا!

اس لئے، اس نے دیر تک، دور تک سوچا! زندگی کتنی بے رحم ہے! یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تن من دھن لٹا کر اولاد کو ولایت بھیجا پھر جدا نہ رہ سکے۔ محبت میں کھنچے آ گئے۔ شاید ان کے بچے نافرمان ہیں نہ باغی! روزی روٹی کمانے میں لگے محض مجبور ہیں۔ صبح کام دھندے پر گئے، شام چلے۔ اپنی طرف سے وہ بزرگوں کو شاندار گھروں، آرام دہ صوفوں اور نرم و گرم قالینوں کی دنیا میں چھوڑ جاتے ہیں۔ بے خبر نہیں جاتے تنہائی میں یہ بوڑھے کتنے بے آرام، کس قدر بے چین رہتے ہیں۔ دکھ بیماری ایک طرف چار دیواری میں گونگے قیدیوں کی سی زندگی گزارتے ہیں۔ بعض ہمت کر کے باہر نکلے لیکن گم ہو گئے، بھٹک گئے، گھر واپس نہ پہنچ سکے۔ ٹریفک حادثے کا شکار ہو کر ہسپتال پہنچا دئے گئے۔ ایک مرتبہ ایک مکان میں آگ لگ گئی۔ مدد پہنچنے تک بوڑھا باپ اور بوڑھی ماں اندر ہی بھسم ہو گئے۔

یہ ''ہوم'' ان کے لئے تازہ ہوادار کھڑکی ہے جس سے چھن چھن کر امید اور روشنی کی کرنیں ان تک پہنچ رہی ہیں۔ کچھ تو ہوا؟ اس نے سماجی کارکنوں سے وعدہ کیا ان مرجھاتی روحوں میں تازگی و دلچسپی پھونکنے کی کوشش کرے گا...... کیا خبر اس طرح اس کی اپنی تنہائی کے زخموں کی جراحت کا بھی سامان ہو جائے!

گھر آتے آتے،

وہ ایک نیا آدمی بن چکا تھا!

ایک ایسا شخص جسے تنہائی چاٹتی ہے نہ وہ کسی بھیڑ میں گم ہوتا ہے۔

اس نے نہایت متانت سے اپنے وکیل کو فون پر تاکید کی ''نئی وصیت تیار کرو، پرانی ساقط اور منسوخ ہے''۔

اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو - اشک رواں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو

(منیر نیازی)

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا - جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(مومن)

اللہ الصمد!

ایک پرانا امریکی ٹی وی سیریل (Knight Rider) جس کے ہیرو کی ''ناکنگ'' کار مشکل وقت میں ہیرو کو بچ نکلنے کی ہدایت دیتی اور گر بتاتی تھی۔ اپنے وقت میں یہ سیریل بچوں میں بڑا مقبول تھا۔

☆☆☆☆

طاہر نقوی

نہ آنے والے کا انتظار

اچانک شور اٹھا، نسوانی چیخیں سنائی دیں اور چاروں طرف سراسیمگی پھیل گئی۔ اس وقت پوری بستی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی اور کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ان چیخوں سے خوف پھیل گیا کیونکہ اندھیرے میں خوف ہوتا ہے کچھ معلوم کرنے کے تجسس میں لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر اس جانب لپکے جہاں سے سہمی ہوئی چیخیں اب بھی آرہی تھیں وہ ایک بیوہ کا گھر تھا جو اپنی نوجوان بیٹی کے ساتھ رہتی تھی گھر کے باہر کھڑے ہوئے لوگ اپنے اپنے طور پر اس ناگہانی کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے رہے۔ اسی دوران گھر سے ایک سایہ نکل کر تیزی سے ایک طرف کو ہولیا۔ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اسی لمحے بجلی آگئی اور پوری بستی روشن ہوگئی۔ دراصل شام ڈھلے سے اس بستی میں بجلی کی لوڈ شیڈنگ تھی اب روشنی ہونے سے کئی نوجوان اس سائے کو پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے لپکے۔ مگر اسے پہچان کر ٹھٹھک کر رہ گئے اور سہمے سہمے انداز میں ایک دوسرے سے نظریں چرانے لگے۔ وہ ان سب پر طنز کے تیر برساتا ہوا وہاں سے صاف نکل گیا بیوہ ہراساں ہراساں اپنے گھر کے دروازے تک آئی اس نے اس پڑوس کے لوگوں کو کھڑے ہوئے دیکھا تو ہمت سے کام لے کر بتانے لگی۔

''وہ ہمیں دھمکی دینے آیا تھا''

''کیسی دھمکی؟'' کسی نے پوچھا

''وہ میری بیٹی سے نکاح کرنا چاہتا ہے''

سب نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا مگر کچھ کہہ نہیں پائے۔

''میرے انکار پر وہ ہمیں دھمکا کر گیا ہے''

اس بات پر بھی لوگوں نے بیوہ کے لئے ہمدردی کا کوئی لفظ ادا نہ کیا کیونکہ کسی میں اتنی جرأت نہ تھی۔ سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ اس سے دشمنی مول لے کر اس بستی میں کوئی چین سے نہیں رہ سکتا۔ وہ اس کی مخالفت کر سکتے تھے اور نہ بیوہ سے ہمدردی۔ انہیں چپ دیکھ کر بیوہ نے

حقارت سے کہا۔

"تم لوگ اس سے اتنا کیوں ڈرتے ہو؟"

بیوہ کا یہ سوال سن کر سب چونک پڑے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو چور اور متلاشی نظروں سے دیکھا مگر اب بھی خاموش رہے۔ ان کے پاس کوئی مناسب جواب نہ تھا۔ ان سے مایوس ہو کر بیوہ نے جھلا کر اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔

اس بستی میں زیادہ تر نچلے متوسط طبقہ کے لوگ آباد تھے۔ اپنی روٹی روزی کی تلاش میں وہ صبح سویرے پرندوں کی طرح نکل کھڑے ہوتے اور اندھیرا ہوتے واپس لوٹتے۔ مگر اس بستی کا سکون راجہ نے غارت کر رکھا تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔ کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو اس کے ہاتھوں محفوظ نہیں تھی۔ وہ دوکانداروں سے بھتہ لیتا اور جب چاہتا کسی راہ گیر سے رقم اینٹھ لیتا۔ در پردہ کسی نے اس کے خلاف تھانہ میں رپورٹ درج کرائی تو کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بلکہ اس کی منہ زوری اور بڑھ گئی۔ پھر اہل محلہ کیچڑ میں پاؤں ڈالنے کے بجائے اس سے بچ کر نکلنے لگے۔ یوں اس کا خوف ان کے دلوں میں بیٹھتا چلا گیا۔ البتہ اس نئے واقعے کے بعد عورتیں پہلے سے زیادہ سہم کر رہ گئیں۔

اگلی صبح راجہ کے چہرے پر مزید سفاکی نظر آئی۔ وہ گلیوں میں مکاری سے مسکراتا ہوا گزرا۔ اچانک اس کی نظر بیوہ کی بیٹی پر پڑی جو اس وقت کالج یونیفارم پہنے ادھر سے گزر رہی تھی۔ وہ لپک کر اس کے قریب جا پہونچا۔ لڑکی نے حقارت سے دیکھا۔ وہ بے نیازی سے کہنے لگا۔

"دیکھو۔ میری بات مان جاؤ، تم ماں بیٹی کا سارا خوف جاتا رہے گا"

لڑکی کوئی جواب دیئے بغیر لاپروائی سے آگے بڑھ گئی۔ راجہ کو یوں لگا جیسے اس نے بھرے بازار میں منہ پر تھوک دیا ہو۔ وہ اپنی اس ہتک پر تلملا کر رہ گیا اور اپنی شرمندگی مٹانے اور بھرم رکھنے کی خاطر رحیم دکاندار کی طرف جا پہنچا۔

"اس مرتبہ مہربانی کر دو۔" رحیم نے گھگھیا کر کہا

"میں کسی پر مہربانی نہیں کیا کرتا۔"

"محنت مزدوری کی عادت ڈالو" رحیم کی آواز میں خوف نمایاں تھا۔

"بھلا محنت کی کیا ضرورت ہے" راجہ نے طنزیہ جواب دیا۔

"اس طرح ضمیر مطمئن رہتا ہے"

"ضمیر محض اپنے آپ کو بہلانے کا نام ہے" یہ کہہ کر راجہ نے سفاکی سے گھورا۔ چنانچہ معاملے کی

نزاکت محسوس کرکے رحیم نے چند نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے وہ بے حیائی سے ہنستا ہوا چلا گیا۔
شام ڈھلے بستی کے بازار میں حسب معمول کافی چہل پہل تھی۔ اسی دوران وہاں ایک ٹیکسی آکر ٹھہری۔ اس میں سے راجہ اتر کر ایک طرف جانے لگا۔ ڈرائیور نے کرایہ طلب کیا تو اس نے پلٹ کر حیرانی سے دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر غصے کی لہر سانپ کی طرح رینگ گئی۔

''اس کا مطلب ہے تو مجھے نہیں جانتا''

''مزدور صرف اپنی مزدوری کو جانتا ہے'' ڈرائیور نے لاپروائی سے جواب دیا، یہ سن کر راجہ نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ اب ڈرائیور بھی پھنکارتا ہوا باہر نکلا۔ اسی لمحے آس پاس سے راجہ کے خوشامدی نوجوان وہاں آموجود ہوئے۔ چنانچہ ڈرائیور نے وہاں سے چپ چاپ واپس چلے جانے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ راجہ ہلکے ہلکے قہقہہ لگاتا فاتحانہ انداز میں ان نوجوانوں کے ہمراہ قریبی ہوٹل میں جا بیٹھا۔ وہ نوجوان پہلے ہی سے وہاں بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے اس نے ہر ایک کے سامنے اس کے حصے کی ہڈی کے طور پر چند نوٹ ڈال دیئے۔ چائے پیتے ہوئے وہ یکا یک سنجیدہ ہوگیا۔ دراصل وہ بیوہ کی بیٹی کے ہاتھوں اپنی بے عزتی ابھی تک نہیں بھولا تھا۔ وہاں سے اٹھ کر وہ سیدھا اسی کے دروازے پر جا پہنچا۔ دروازہ کھلا تو بیوہ نے جھانک کر دیکھا اور سہم کر رہ گئی، مگر بظاہر اس نے پر اعتماد لہجے میں پوچھا۔

''کیوں آئے ہو؟''

''تمہاری بیٹی نے راہ چلتے میری بے عزتی کی ہے''

اس موقع پر بیوہ کی بیٹی بھی قریب آگئی۔ ماں کے بجائے اس نے بپھر کر جواب دیا۔

''تم نے مجھے راستے میں کیوں روکا تھا''

اس لہجے سے اب راجہ پر ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی کیونکہ وہ ایسے رویے کا عادی نہیں تھا۔
بیوہ کی بیٹی نے اسی ناگواری سے دوبارہ کہا

''وہ تو میں بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی''

راجہ کے چہرے پر مختلف رنگ دیکھ کر بیوہ خوف زدہ ہوگئی۔ تاہم اس کی بیٹی لاپروائی سے بولی۔'' تم باز آجاؤ۔ ورنہ.........'' اپنی بات نامکمل چھوڑ کر اس نے راجہ کو حقارت سے دیکھا۔ اب بیوہ نے معاملے کو نمٹانے کے لئے کمزور سا احتجاج کیا۔

''تمہارے خلاف قانون کی مدد لوں گی''

اس بات پر پہلے تو راجہ تلملا کر رہ گیا، پھر تلخی سے کہنے لگا۔

"دیکھو۔ میں تمہاری بیٹی کو بدنام کر کے رکھ دوں گا۔ تم اپنی شکل دکھانے کے قابل نہیں رہو گی"

"کیا۔کیا ہے میں نے" لڑکی نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"بدنامی کے لئے کچھ کرنا ضروری نہیں ہوتا" راجہ نے سفاکی سے قہقہہ لگایا۔ اب ماں بیٹی کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکل پایا۔ وہ دونوں سکتے کی حالت میں راجہ کو دیکھنے لگیں۔

"تب تمہاری بیٹی کا ہاتھ تھامنے والا کوئی نہ ہوگا"

یہ سن کر دونوں ماں بیٹی اپنے اپنے وجود کے اندر دہل کر رہ گئیں۔ بیٹی کی آنکھوں سے بے بسی کے آنسو بہہ نکلے۔ اس لئے ماں نے بات بڑھانے کے بجائے اسے سہارا دے کر دروازہ بند کر دیا۔ باہر سے راجہ کے بے ترتیب قہقہے دیر تک سنائی دیتے رہے۔

رات کے اندھیرے میں جنگلوں سے آنے والے خونخوار بھیڑیوں کا خوف بستی والوں کے دل میں بیٹھ جاتا ہے۔ ایسا ہی خوف راجہ کا بھی تھا۔ کسی جرم میں دو تین روز تھانے میں بند رہ کر وہ اپنے گھر کی طرف آرہا تھا۔ اس وقت چند عورتیں گلی میں کھڑی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ راجہ کو دیکھ کر انہیں سانپ سونگھ گیا اور وہ اپنے گھروں میں گھس گئیں۔ اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے راجہ اپنے گھر میں داخل ہوا تو حسب معمول نہ بیوی نے اس کے غائب ہونے کی وجہ معلوم کی اور نہ اس نے خود کچھ بتایا۔ البتہ خلاف توقع راجہ کی بیوی نے اسے دیکھ کر کسی ناگواری کا کوئی تاثر نہیں دیا۔ بلکہ اس وقت وہ خوش تھی اس تبدیلی سے راجہ کو تعجب ہوا۔ قریب آکر وہ رازداری سے بتانے لگی۔

"ہماری بیٹی کے لئے رشتہ آیا ہے، کل شام وہ لوگ آرہے ہیں؟

آنے والوں نے لڑکی کو پسند کیا اور رشتہ طے کر کے خوشی خوشی رخصت ہو گئے۔ راجہ اور اس کی بیوی اس رشتے پر مطمئن تھے گویا ان کے سینے سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔ چنانچہ دونوں شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ اسی دوران جہیز کا سامان خرید کر ایک دن راجہ گھر پہونچا تو بیوی کو برعکس حالت میں دیکھا۔ وجہ دریافت کرنے پر بیوی نے تلخی سے جواب دیا۔

"لڑکے والوں نے انکار کر دیا"

"کیوں" راجہ نے حیرانی سے پوچھا تو بیوی نے اس پر نفرت سے نظر ڈالی۔

"وجہ جاننا چاہتے ہو؟"

راجہ نے اس غیر متوقع بات پر اسے صرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔ اس کی بیوی نے اپنی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان کہا۔

باقی صفحہ ۱۶۲ پر....

سید معراج جامی، کراچی

معمّہ

یقین کیجئے! میں نہ بزدل ہوں اور نہ ڈرپوک، مگر اس واقعہ نے مجھے بزدل بھی بنادیا ہے اور ڈرپوک بھی۔ مگر شکر ہے کہ میری اس کیفیت سے کوئی اور شخص واقف نہیں ہے اور یہ واقعہ بھی ایسا ہے کہ میں کسی کو نہ سنا سکتا ہوں اور نہ اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرسکتا ہوں۔ عجیب مخمصے میں گرفتار ہوں۔

اس واقعہ سے میں وہم کا بھی شکار ہوگیا ہوں۔ اس سے پہلے میں اوہام پرستی میں گرفتار نہیں تھا۔ زندگی میں ویسے تو کئی ایسے حادثات رونما ہوتے ہیں جن کی بنیاد اوہام پر ہے۔ اور میں کبھی کبھار اس میں گرفتار ہو جاتا ہوں مگر اس قدر شدت سے نہیں۔ مثلاً کالی بلی رستہ کاٹ جائے تو کہا جاتا ہے کہ وہ کام اب نہیں ہوگا جس کام سے گھر سے نکلے تھے۔ کالی بلی کئی مرتبہ میرا راستہ کاٹ گئی۔ ہلکا سا وہم اور خوف دل میں پیدا ہوا مگر میں اپنے اس کام میں کبھی ناکام نہیں ہوا۔ اس کے باوجود جب بلی نے راستہ کاٹا دل دھڑکا ضرور۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے میں خود اس کی توجیہ پیش کرنے سے قاصر ہوں کہ آیا یہ واقعہ میرے بچپن میں پڑھی جانے والی دیومالائی کہانیوں کا کوئی منظر تھا یا اس کا حقیقت سے بھی کوئی تعلق ہے مگر وہ واقعہ جس طرح پیش آیا اسے میں خواب، وہم یا نظر کا دھوکہ کسی طرح کا بھی نام نہیں دے سکتا ہوں۔ واقعہ صد فی صد جاگتی آنکھوں سے عالم بیداری میں اور رات کے وقت پیش آیا۔ واقعہ کے تمام مناظر حقیقی ہیں اور آج بھی بلکہ اس وقت بھی میں انہیں دیکھ رہا ہوں۔ اس واقعہ میں صرف تین کردار ہیں۔ جن میں سے ایک کردار میں ہوں دوسرا کردار اس لڑکی کا ہے۔ اس واقعہ کا یہی دوسرا کردار ہے جو اہم بھی ہے مرکزی بھی ہے اور جس نے مجھے بے حد مضطرب و پریشان کردیا ہے۔ تیسرے کردار کے بارے میں آپ کو کیا بتاؤں، آپ خود واقعہ پڑھ لیں گے تو جان جائیں گے۔ میرا خیال ہے میں آپ کے سامنے پورا واقعہ بیان کردوں۔ شاید میرے اس واقعہ کو سن کر آپ میں سے کوئی میرے اس بیان کی صداقت کو قبول کرلے۔

میں جس بلڈنگ میں رہتا ہوں وہ لب سڑک ہے۔ اس علاقے کی پہلی رو جو لب سڑک ہے وہ کمرشیل ہے اور اس کے بعد کا سارا علاقہ رہائشی۔ اس لئے سڑک کے ساتھ ساتھ چار چار منزلہ عمارتیں کھڑی ہیں جس میں سولہ فلیٹ اور آٹھ دکانیں ہیں مگر یہ عمارتیں لگاتار نہیں ہے۔ علاقہ ابھی زیر تعمیر ہے اس لئے بلڈنگ بھی فاصلے فاصلے سے ہیں۔ بلڈنگ کے پیچھے والے علاقے میں بنگلے ہیں، مگر بنگلوں کی تمام رو مکمل نہیں ہیں۔ شروع کی چار رو میں بنگلے ہیں اور وہ بھی فاصلے سے ہیں اور بن رہے ہیں۔ پانچویں اور چھٹی رو میں تو اکا دکا بنگلے ہیں جن میں بیشتر نامکمل ہیں۔ اس کے بعد ایک بڑا علاقہ خود رو جھاڑیوں سے بھرا ہوا ہے۔ تقریباً دو کلو میٹر کا یہ علاقہ آگے جا کر رن وے کی خاردار تاروں کے پاس چل کر ختم ہوگیا ہے۔ رن وے اور اس کے بعد ایئر پورٹ کی بلڈنگ ہے۔ رن وے پر نصب زرد طاقت ور بلبوں کی روشنیوں نے ہمارے علاقے کے گھٹا ٹوپ اندھیرے کو قدرے کم کر دیا ہے۔ ہاں جیسے جیسے ہم رن وے کی طرف جاتے ہیں علاقہ زرد روشنیوں سے عجیب طلسماتی یا آسیبی منظر پیش کرتا ہے۔ ہمارے علاقے میں اسٹریٹ لائٹ نہیں ہیں۔ مین سڑک بھی رات کو اندھیرے میں ڈوبی رہتی ہے۔ اس سڑک سے گزرنے والے اپنی گاڑیوں کی روشنیوں سے اپنا راستہ طے کرتے ہیں۔

جب فضا بالکل صاف ہوتی ہے تو رن وے کی زرد روشنی ہماری بلڈنگ کے فلیٹ کے اندر تک آجاتی ہے کہ ہمیں بیڈ روم کے ساتھ اٹیچ باتھ روم کا بلب جلانے کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ مگر شہر کی فضا اس قدر آلودہ، گرد و غبار اور دھواں سے اٹی رہتی ہے کہ ایسا دن کبھی کبھار ہی آتا ہے بارشیں ہوں تو شاید فضا بھی صاف رہے۔

میں رات کا کھانا کھانے کے بعد فوراً میز پر بیٹھ کر کام کرنے لگتا ہوں۔ بیگم میرے اس عمل سے ہمیشہ نالاں رہتی ہیں۔ تقریباً ہر دوسرے دن یہی اصرار رہتا ہے کہ میں رات کا کھانا کھا کر باہر ٹہل لیا کروں۔ کھانا بھی ہضم ہو جایا کرے گا اور جسم کا فربہ پن بھی شاید کم ہونا شروع ہو جائے۔ میرا فلیٹ مین سڑک نہیں بلکہ اندر والی سڑک کی جانب ہے جہاں سے رن وے اور رن وے پر اترتے اور چڑھتے جہاز نظر آتے ہیں۔ بڑا دلچسپ اور دل پسند نظارہ ہوتا ہے۔ گیلری میں بیٹھ کر ہم سب رات کی خاموشی اور دور چمکتے رنگ برنگے بلبوں سے مزین نیون سائن سے لطف لیتے رہتے ہیں۔ جب بیگم بہت زیادہ اصرار کرتی ہیں تو پھر میں بلڈنگ سے اتر کر رن وے کی سمت جانے والے نیم اندھیرے کچے راستے پر چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ جہاں جہاں بنگلے بنے ہوئے ہیں ان کے صدر دروازے پر بلب لگے ہوئے ہیں صرف زمین کا وہ حصہ روشن ہوتا ہے اور پھر جیسے اس بنگلے سے آگے بڑھتے اندھیرا بڑھنے لگتا ہے۔

میں عموماً اس علاقے کے قدرے آباد چار رو تک جاتا ہوں اور وہاں سے الٹے ہاتھ مڑ کر

بنگلوں کے ساتھ ساتھ چلتا ہوں پورا ایک بلاک مکمل کر کے واپس اپنے فلیٹ کی جانب آ جاتا ہوں۔ تقریباً ۴ فرلانگ کا یہ ٹکڑا میری صحت کے لئے بہت ہے۔ کیونکہ نہ تو میں اس سے زیادہ آگے تک جا سکتا ہوں کہ مزید علاقہ غیر آباد ہے اور نہ ہی میں زیادہ وقت چہل قدمی میں صرف کرنا چاہتا ہوں کہ میرے پاس کام بہت ہے اور میں اتنا وقت بھی دے کر سمجھتا ہوں کہ میں نے بہت وقت ضائع کیا۔ حالانکہ یہ وقت ضائع نہیں ہوا ہے۔ زندگی ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ آدمی چہل قدمی میں کچھ وقت قصداً ضائع کر دے۔ میں رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی کی افادیت سے بہت اچھی طرح واقف ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ چہل قدمی میرے لئے کتنی ضروری ہے پر طبیعت ادھر نہیں آتی۔

یہ واقعہ بھی ایک رات کا ہے۔ میں بیگم کے اصرار پر فلیٹ سے نکل کر رن وے کی سمت چہل قدمی کے انداز سے چلنے لگا۔ اتفاق سے کوئی خاص کام بھی نہیں تھا۔ لہٰذا یہ خیال بھی نہیں تھا کہ میری چہل قدمی سے میرے کام کا حرج ہوگا۔ پہلے تو میں اطراف کے بنگلوں کو دیکھتا ہوا چلتا رہا۔ پھر نہ جانے کس خیال کے تحت میں اپنے بچپن میں پہنچ گیا۔ جب میں اپنے گھر میں والدین کے ساتھ اکیلا رہتا تھا۔ اس وقت نہ کوئی مجھ سے بڑا تھا اور نہ چھوٹا۔ اس اکیلے پن نے مجھ میں خواب کی دنیا آباد کر دی۔ اسکول سے آ کر کھانا کھا کر امی ابا تو سو جاتے میں اپنے کمرے میں لیٹا خواب بنتا رہتا۔ پھر دیو مالائی کہانیاں پڑھنے لگتا۔ روز ایک آنے کرایے پر کہانیوں کی دو کتاب لاتا اور دوسرے دن دونوں واپس کر دیتا۔ جی چاہتا کہ ایک ساتھ چار پانچ کتابیں لایا کروں مگر جیب خرچ اس عیاشی کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ دیو مالائی کہانیوں کا تصور آتے ہی مجھے ان کہانیوں کے شہزادوں، شہزادیاں، ملکائیں، بادشاہ سلامت اور پری کے ساتھ دیو بھی یاد آ گئے۔ دیو کا خیال آتے ہی میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں نے ڈر کر اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا۔ تو عالم ہوش میں آیا مگر جیسے ہی میں نے اپنے اطراف میں نظر ڈالی تو مجھ پر مزید خوف طاری ہو گیا۔ میں دیو مالائی کہانیوں کے طلسم میں چلتا ہوا بہت آگے آ گیا تھا۔ رن وے کی پیلی روشنیوں میں یہ اجاڑ اور غیر آباد علاقہ عجیب نظارہ پیش کر رہا تھا میرے جسم کے رونگٹے ایک بار پھر کھڑے ہو گئے۔ رن وے کے حدود کی خاردار تاریں مجھے کچھ فاصلے پر نظر آ رہی تھیں۔ مکانات کی رو سے میں تقریباً تین رو آگے نکل آیا تھا۔ مجھے پہلا خوف جو محسوس ہوا وہ کتوں کا تھا۔ اور میں کتوں سے بہت ڈرتا ہوں۔ دوسرا خوف یہ تھا کہ شاید کوئی چور اچکا بھی آ جائے۔ ویسے تو میری جیب بھی خالی تھی۔ ہاتھ میں گھڑی بھی نہیں تھی۔ صرف تن پر کپڑے تھے مگر مہنگائی نے چور اچکوں کو بھی اس حد تک ناقابل اعتبار بنا دیا ہے کہ وہ اس بات پر یقین ہی نہیں کریں گے کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ اب میں واپس ہونے کے لئے گھوما۔ تو میرے کانوں نے

انتساب-۵۷

سسکیوں اور ہچکیوں کی آوازیں سنیں میرا خوف پھر پیدا ہوگیا بلکہ اس میں شدت آنے لگی کیونکہ وہ سسکیوں اور ہچکیوں کی آوازیں کسی نوجوان لڑکی کی تھیں مگر وہ لڑکی کہاں ہے میں نے اپنے بائیں جانب دیکھا تو جیسے کچھ فاصلے پر ایک بنگلہ نظر آیا۔ رن دے کی پیلی روشنیوں میں وہ بنگلہ بھوت بنگلے سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ اس بنگلہ کی دہلیز پر ایک لڑکی جو سفید کپڑوں میں ملبوس تھی ہچکیوں سے روئے جارہی تھی مگر اس کی آواز بہت بلند نہیں تھی۔ وہ لڑکی دہلیز پر بیٹھی اپنا سر گھٹنوں میں دیئے روئے جارہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ خود بھی خوف کے عالم میں ہے۔ روتے روتے جب اس کی آواز بلند ہونے لگتی وہ فوراً اپنی آواز کو دبا دیتی۔ اسے دیکھتے ہی میرے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے۔ فوراً میرے ذہن میں چڑیل کا خیال آیا۔ میں نے بچپن میں کئی کہانیوں میں پڑھا بھی تھا اور میری امی بھی بتاتی تھیں کہ ایسے غیر آباد علاقوں میں چڑیلیں ہوتی ہیں وہ بالکل عورتوں کی طرح ہوتی ہیں بلکہ خوبصورت عورتوں کی طرح اور وہ اس ویران علاقے میں آنے والے مسافر، راہ گیر کو پکڑتی ہیں۔ جب وہ نظر آتی ہیں تو ایک حسین عورت کی شکل میں اور جب شکار بھاگنے لگتا ہے تو پھر اپنی اصل صورت میں آجاتی ہیں جو بہت بھیانک ہوتی ہے۔ ہاں ان کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ ان کے پاؤں مڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ یعنی پیر کی انگلیاں پیچھے کی سمت ہوتی ہیں۔ یہ خیال آتے ہی میرے جسم کے رونگٹے مزید سخت ہوگئے۔ جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ خوف سے پسینے چھوٹ گئے۔ دعائیں یاد کرنے لگا تو خوف اس حد تک طاری ہو چکا تھا کہ آیت الکرسی تک بھول گیا۔ میں کئی ساعت خوف کے عالم میں یونہی کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پاؤں میں دم نہیں تھا کہ میں بھاگنے کی کوشش کروں۔ پاؤں من بھر کے ہوگئے تھے۔ بڑی مشکل سے پاؤں کو چلنے پر آمادہ کیا۔ گھبراہٹ میں پتا نہیں کون ہی کون سی سورتیں دل ہی میں پڑھتا رہا۔ پاؤں بڑی مشکل سے اٹھے اور میں آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے سے سرکنے لگا کہ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی میں بھی اس پر نظریں گاڑیں آہستہ آہستہ چلتا رہا تھا۔ اس کے پاؤں کو دیکھنا چاہتا تھا مگر اس کے پاؤں شلوار کے پائنچوں کے اندر تھے۔ اس لئے میں یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ لڑکی چڑیل ہے یا انسان مگر میں اسے انسان سمجھنے کے لئے کسی حد تک تیار نہیں تھا کہ جس بنگلے کی دہلیز پر وہ بیٹھی تھی وہ غیر آباد اور نامکمل تھا۔ اس بنگلے کے اطراف اور کوئی بنگلہ نہیں تھا۔ لہٰذا اپنے گھر سے روٹھ کر کوئی لڑکی اس خوف ناک ویرانے میں آنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی ہے۔ لڑکی نے جیسے ہی مجھے دیکھا وہ ایک دم کھڑی ہوگئی۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ سورتیں آپس میں گڈمڈ ہوگئیں۔ میری آنکھوں سے بھی خوف جھلکنے لگا۔ میری نظر فوراً اس کے پاؤں کی جانب گئی تو اس کے دونوں پیروں میں کھسے تھے۔ اور پیر بھی سیدھے تھے۔ میں انتظار کرنے لگا کہ کب وہ میرے نزدیک آتی ہے۔ قہقہہ لگاتی ہے اور

اس کے پیرا لٹے ہوتے ہیں۔ وہ میرے نزدیک تو آئی مگر ڈرتے ڈرتے اور مجھ سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گئی۔ خوف اس کی آنکھوں سے بھی جھانک رہا تھا۔ اب میری آنکھوں میں خوف کی جگہ حیرانی نے لے لی۔

لڑکی کی ہچکیاں بھی رک گئی تھیں مگر آنسو اب بھی اس کی آنکھ سے بہہ رہے تھے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پیلی روشنیوں میں واقعی کسی چڑیل کی آنکھیں لگ رہی تھیں۔ گھنے بال جو شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ لان کی قمیص اور شلوار میں ملبوس ڈوپٹا شانوں پر لٹکا ہوا۔ چہرہ یقیناً سرخ سپید ہوگا مگر زرد رنگ کی روشنی نے اسے یرقان کا مریض بنا دیا تھا لگتا تھا جیسے ابھی ابھی بستر سے اٹھ کر آئی ہے۔ کیونکہ شلوار قمیص شکنوں سے بھری ہوئی تھی۔

"خدا کے لئے میری مدد کریں۔ مجھے اس ظالم سے نجات دلائیں۔ آپ کو اللہ رسول کا واسطہ"۔ اس نے روتے روتے عاجزانہ انداز میں کہا اور میرے سامنے ہاتھ جوڑنے لگی۔ چڑیل اللہ رسول کا واسطہ تو نہیں دیتی۔ یہ تو خود مظلوم ہے۔ اگر چڑیل ہوتی تو کس کی مجال تھی کہ اسے ایذا پہنچاتا۔ یہ سوچ کر میرا رہا سہا خوف بھی دور ہوگیا۔ جسم کے رونگٹے بھی بیٹھ گئے۔ مگر میری حیرانی اب بڑھنے لگی۔ اس کا مہذب لہجہ اور خوبصورت آواز اس کے تعلیم یافتہ اور باتہذیب ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔

"آپ کون ہیں؟ اور اس ویرانے میں کیسے آئی ہیں؟" میں اس کی جانب قدم بڑھتا ہوا بولا۔

وہ مڑ کر بنگلے کی جانب بڑھی اور دہلیز پر بیٹھ گئی میں اس سے ہٹ کر دہلیز کے دوسرے سرے پر بنے ہوئے کیاری کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔

ماحول پر ایک سکوت طاری ہوگیا تھا۔ زرد روشنی سے فضا کو انتہائی پُراسرار بنا دیا تھا۔

اس نے ڈوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ پونچھا وہ بغیر میک اپ کے بھی بہت پرکشش تھی۔ چہرے کے نقوش خوبصورت اور جاذب نظر تھے۔ اس کے کراہتے ہوئے ہونٹ اور بڑی بڑی آنکھیں راہ چلتی ٹریفک کو یک لخت روک دینے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔

میں انتہائی کوشش کے باوجود اس کے چہرے سے نظریں نہ ہٹا سکا۔ جس کا مجھے ملال بھی ہوا کہ وہ کہیں مجھے بازاری نہ سمجھ بیٹھے۔ مگر میں دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ میں اس شش و پنج میں تھا کہ کس طرح اپنی نظریں اس کے چہرے سے ہٹاؤں کہ وہ بولی۔

"میں اسکیم نمبر ایک میں رہتی ہوں۔ میرے پاپا بزنس کے سلسلے میں عموماً گھر سے باہر غیر

ممالک کے دوروں پر رہتے ہیں۔ گھر میں امی اور میرے علاوہ دو نوکرانیاں اور چار نوکر ہیں۔ ہمارا بنگلہ دو منزلہ ہے، میرا بیڈ روم دوسری منزل پر ہے۔ جبکہ امی نیچے والے بیڈ روم میں سوتی ہیں۔ مجھے رات کی کھلی فضا بہت پسند ہے۔ میں عموماً چاندنی راتوں کو گھنٹوں اوپر کے ٹیرس پر بیٹھی رہتی ہوں۔ کبھی چاند کو تکتی ہوں کبھی تاروں کو اور کبھی فضا کی وسعتوں میں خود کو تیرتا محسوس کرتی ہوں۔ سارے ملازم نیچے ہی رہتے ہیں۔ امی نے کئی مرتبہ مجھ سے کہا کہ تم کہو تو میں پروین کا بستر تمہارے کمرے میں بچھوا دوں مگر میں نے انکار کر دیا۔ پروین میری خدمت پر مامور نوکرانی کا نام ہے۔ پروین بہت اچھی سمجھ دار سگھڑ نوکرانی ہے۔ مگر میں اپنے بیڈ روم میں اور اپنے معمولات میں کسی کی دخل اندازی گوارا نہیں کر سکتی۔

ایسی ہی ایک چاندنی رات تھی۔ چودھویں کا چاند اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ کرنیں پھیلا رہا تھا۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ چودھویں رات کو سمندر کا پانی چاند کو چھونے کے لئے بڑی بڑی قلانچیں بھرتا ہے۔ سمندر میں جوار بھاٹا کی کیفیت ہوتی ہے۔ سنا ہے لوگ رات کو ساحل سمندر پر جاتے ہیں لہٰذا میں بھی جا کر دیکھوں۔ یہ سوچ کر اپنے کمرے سے نیچے آئی امی اپنے بیڈ روم میں سو چکی تھیں۔ ملازم بھی آرام کر رہے تھے صرف چوکیدار اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ میں نے پہلے تو سوچا کہ اکیلی چلی جاؤں مگر مجھے پتہ تھا کہ خان مجھے گھر سے اکیلا نکلنے نہیں دے گا۔ لہٰذا میں نے پروین کو جگایا۔ اور بشیر کو ساتھ لیا اور گاڑی میں بٹھا کر گھر سے ساحل سمندر کی جانب روانہ ہوئی۔ تینوں کو یہی بتایا کہ میری سہیلی کا فون آیا ہے۔ اس کے والد کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے لہٰذا میں اسپتال جا رہی ہوں۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد آ جاؤں گی۔ پروین اور بشیر تو میرے ساتھ تھے لہٰذا خان بابا نے مجھے جانے دیا۔

میں سیدھا ساحل سمندر کی جانب پلٹی۔ وہاں خاصا رش تھا اور اپنی ذاتی سواریاں رکھنے والی بہت فیملیاں آئی ہوئی تھیں۔ پروین اور بشیر حیران ہوئے کہ میں اسپتال کی بجائے ساحل سمندر کیوں آئی۔ دونوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چودھویں رات کو سمندر دیکھوں، اگر تم لوگوں کو اصل بات بتاتی تو یقیناً تم لوگ بھی انکار کر دیتے اور خان بابا تو مجھے کسی صورت گھر سے نکلنے نہیں دیتے۔ دونوں یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ ہم تینوں ساحل کی دیوار پر چڑھ کر کھڑے ہو گئے۔ رات میں سمندر کا شور بہت بڑھ گیا تھا۔ چودھویں کا چاند اپنی پور سحر سامانی کے ساتھ طلائی طشت کی مانند سروں پر جلوہ افروز تھا۔ سمندر کی لہریں اسے چھونے کی کوشش میں بڑے زوں سے اچھلتیں اور ناکامی کی صورت میں ساحل کی دیواروں سے سر پٹکاتیں۔ سمندر واقعی

ایک ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھا۔ کسی سرکش شیر کی مانند دھاڑیں مار رہا تھا۔ کسی ضدی بچے کی طرح اٹھ اٹھ کر گر رہا تھا۔ کسی عاشق زار کی طرح اپنا گریباں چاک کر رہا تھا۔ سمندر کے شور میں اس کی آہیں بہت واضح تھیں۔ لگتا تھا کہ وہ چاند کے غم میں بہت مضطرب ہے اور خوب اچھل اچھل کر چاند کو پکڑنا چاہ رہا تھا۔ خاصی بلند لہریں تھیں اور چاند...... چاند، سمندر کی بے قراری اور بے بسی پر ہنس رہا تھا۔ یہ منظر میرے لئے کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ میں دیوار کی منڈیر پر چلنا چاہتی تھی مگر لوگ دیوار پر بیٹھے اور کھڑے ہوئے تھے میں نے پروین اور بشیر سے کہا کہ وہ یہیں رکیں۔ میں ذرا آگے تک جانا چاہتی ہوں۔ یہ کہہ کر میں نیچے سڑک پر آئی اور آگے کی جانب چلتی گئی۔ میں اس روح پرور منظر میں کھوئی ہوئی تھی۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ میں کتنی دور آ گئی۔ جب ذرا ہوش آیا تو دیکھا کہ میں لوگوں کے ہجوم سے بہت آگے نکل آئی ہوں۔ میں دیوار پر چڑھ گئی۔ آگے کوئی نہیں تھا۔ میں دیوار پر بیٹھ گئی اور چاند کو تکنے لگی۔ مجھے ایسا لگا کہ چاند مجھے دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا۔

''تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

آواز آئی ''ہاں'' میں نے اسی خوابناکی کے عالم میں پوچھا ''کیا؟'' آواز آئی ''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں'' یہ سن کر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ مجھے چاند کے منہ سے یہ سن کر بہت اچھا لگا۔ میں روحوں کے انداز میں زور زور سے ہنسنے لگی ''کیا تم تیار ہو'' اس آواز پر میں نے چاند کی جانب نظر کی تو دیکھا کہ چاند کو تو ایک بدلی نے چھپالیا ہے پھر یہ آواز کہاں سے آئی میں نے حیران ہو کر سمندر کی جانب دیکھا شاید یہ آواز سمندر کی ہو مگر سمندر کو تو اپنے زخم بھرنے سے فرصت کہاں، وہ تو ایک وحشی درندے کی طرح مسلسل چیخے چنگاڑے جا رہا تھا۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ میرے بائیں جانب کوئی بیٹھا ہے۔ میں نے اپنے بائیں جانب دیکھا تو حیران بھی ہوئی اور خوف زدہ بھی۔ ایک باریش سرخ مگر بڑے چہرے والا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی موٹی موٹی سرخ آنکھیں، بڑے ہونٹ موٹی ناک اور بڑے بڑے کان لگتا تھا وہ انسان نہیں کوئی دیو ہے۔ داڑھی نے اس کے چہرے کی کرختگی کو قدرے کم کر دیا تھا مگر سرخ سرخ آنکھیں خوف زدہ کرنے کے لئے کافی تھیں۔ ایسے چہرے کو دیکھ کر کسی کمزور دل والے کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔ میں پھرتی سے اٹھ کھڑی ہوگئی اور چھلانگ مار کر سڑک پر آ گئی۔

''ٹھہرو!'' اس کے لہجے میں سختی آ گئی۔ آواز کی سختی نے میرے پاؤں پکڑ لیئے۔

''دیکھو! میں مذاق نہیں کر رہا تھا۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے تمہاری جیسی ہی آدم زاد کی تلاش تھی!'' اس کا لہجہ حالانکہ نرم تھا مگر اس کی اس نرمی میں بھی چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ آدم

زاد کا لفظ سنتے ہی مجھے خوف نے آلیا۔ سارے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ "آدم زاد! تم کون ہو؟" میں نے ڈرتے کانپتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"ڈرو نہیں! تم ایک باہمت لڑکی ہو۔ مجھے امید ہے کہ تمہارے اعصاب بہت مضبوط ہیں۔ اسی لئے تم خوف زدہ نہیں ہوگی۔ میں جن ہوں۔ ہم میں سے بہت سے جن آدم زاد سے شادی کرتے ہیں۔ ہمیں اس کے لئے باقاعدہ اجازت لینی پڑتی ہے۔ مگر یہ اجازت اس وقت ملتی ہے جب ہمارے ہاں دیوزادیوں کی قلت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا مجھے امید ہے کہ تم میری درخواست قبول کرو گی۔ میں اپنے علاقہ کا ایک خوشحال، شریف اور پابند صوم وصلوٰۃ جن ہوں۔ میں ایک مکتب چلاتا ہوں۔ اس لئے تم کو مجھ سے کسی قسم کا خوف نہیں کھانا چاہئے۔ اور نہ ہی میں تم کو کوئی گزند پہنچاؤں گا۔ آج کل ہم اسی پریشانی سے دوچار ہیں۔ ہمارے ہاں شادی کا ایک وقت اور عمر ہوتی ہے۔ ہمیں اس عمر میں اور اس مقررہ وقت میں لازمی شادی کرنا ہوتی ہے۔ کیا میں امید کروں کہ تم مجھ سے شادی کرلو گی۔ بصورت دیگر مجھے سختی کرنا پڑے گی۔ کیونکہ تم ہر لحاظ سے ہمارے لئے موزوں ہو"۔

یہ سن کر میری جان ہی نکل گئی۔ سختی کا سن کر میری رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ تاہم میں نے جی کڑا کر کے کہا "اگر میں انکار کردوں تو تم کیا کرو گے"۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ بھی آئی تو ایسے جیسے وہ مجھ پر دانت پیس رہا ہو۔ میرے پاس ڈیڑھ ماہ کا وقت ہے۔ مجھے ہر صورت میں ڈیڑھ ماہ کے اندر اندر شادی کرنا ہوگی۔ وگرنہ پھر میں ساری عمر شادی سے محروم رہوں گا۔ اور میرا رتبہ بھی قوم میں گھٹ جائے گا۔ مکتب کا نظام بھی مجھ سے لے لیا جائے گا۔ اور میں ایک عضو ناکارہ بن کر رہ جاؤں گا لہٰذا میں خود بھی نہ چاہوں گا کہ مجھ پر ایسا برا وقت آئے۔ اگر تم راضی نہ ہوئیں تو پھر میں خود بھی مرجاؤں گا اور تم کو بھی مار ڈالوں گا کیونکہ میں زبردستی تم سے شادی نہیں کرسکتا ہوں۔ یہ ہمارے نظام کے خلاف ہے۔ اگر میں نے ایسا کیا تو سردار مجھ سے میری قوت چھین کر مجھے...... میں تبدیل کر دے گا۔

"آخر تم میرے ہی پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ یہاں اور بھی تو لڑکیاں ہیں۔ ان میں سے کسی کو تلاش کرلو" مجھ سے اب برداشت نہیں ہوا اور میں رو پڑی۔

"دیکھو! میری دنیا میں ہر آدم زادی نہیں رہ سکتی ہے۔ وہاں رہنے کے لئے جن صفات کی ضرورت ہوتی ہے وہ تم میں موجود ہیں۔ میں تمہاری ان صفات کا ذکر نہیں کروں گا مگر یاد رکھو کہ میرے اور میری دنیا کے لئے تم ہی موزوں ترین ہو۔ لہٰذا انکار مت کرنا۔ تم کو میں بیس پچیس دن کا وقت دیتا ہوں۔ خوب اچھی طرح سوچ لو۔ ہاں یہ یاد رکھنا کہ یہ دن تمہیں جو دیئے جا رہے ہیں وہ

اقرار کرنے کے لئے ہیں انکار کے لئے نہیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

اور میری آنکھوں کے سامنے وہ دیوہیکل شخص بلکہ جن غائب ہو گیا۔ میں بھاگتی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف آئی اور گاڑی کے پاس آتے ہی گر پڑی۔ پروین اور بشیر پہلے ہی پریشان تھے میری حالت دیکھ کر اور گھبرا گئے۔ بشیر کو گاڑی بھی چلانی نہیں آتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کیسے گھر آئی۔ کون لایا۔ بس یہ معلوم ہے کہ جب آنکھ کھلی تو امی بستر پر بیٹھی سورہ پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونک رہی تھیں۔ پروین، بشیر سر جھکائے کھڑے تھے، دیگر نوکر بھی تھے اور میری سہیلیاں بھی۔ ایک سہیلی نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا اور میری امی سے بولی بخار کا زور ٹوٹ گیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔ مگر کسی نے پھر سے کوئی بات نہیں کی۔

دوسرے دن تک میں نے سوچ لیا کہ مجھے سب لوگوں کو کیا بتانا ہے۔ میری گھڑی ہوئی کہانی سن کر سب مطمئن ہو گئے۔ اور یہ واقعہ سب کے ذہنوں سے اتر گیا مگر میں جس عذاب میں پھنس چکی تھی اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ جن کے بارے میں مجھے بھی کچھ معلومات تھیں۔ لہٰذا ان کی دسترس سے نکل کر کہیں بھی پناہ نہیں ہے۔ میں بظاہر مطمئن تھی مگر جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ بھوک اڑ چکی تھی۔ آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ میں ساری ساری رات بستر پر کروٹیں بدل کر گزار دیتی۔ کبھی خوف زدہ ہو جاتی کبھی اپنا انجام یاد کر کے روتی رہتی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنی مشکل کس سے بیان کروں۔

ایک دو بار خیال آیا کہ کسی اللہ والے یا نیک بزرگ سے اس سلسلے میں مدد لوں مگر اللہ کے نیک بندے تک پہنچنے کے لئے بھی تو کسی کو یہ بات بتانی پڑے گی اور جیسے ہی میں کسی کو بات بتاؤں گی جنگل کی آگ کی طرح یہ بات سب میں پھیل جائے گی۔ بزرگ تو کیا ملیں گے اور کئی مشکلات میں گرفتار ہو جاؤں گی۔ غرض کہ تین دن اسی کرب میں گزر گئے۔ چوتھے دن میں رات کو بستر پر بیٹھی ہوئی اپنی قسمت کو کوس رہی تھی اور اس بری گھڑی کو یاد کر رہی تھی جب میرے دل میں چودھویں رات کو ساحل سمندر پر جانے کا خیال آیا کہ اچانک وہ میرے پلنگ کے بائیں جانب کھڑا نظر آیا۔ میں اچھل کر بستر سے زمین پر کھڑی ہو گئی۔ خوف اور بے چارگی میری آنکھوں کا سارا پانی آنسوؤں کی شکل میں بہانے لگی۔

اس کے لہجے میں کرختگی تھی۔ "کیا فیصلہ کیا!"۔ "میری حالت پر رحم کرو۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔" میں اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

"دیکھو! میں بھی بہت مجبور ہوں۔ اگر تم راضی خوشی حامی بھر و تو ہم دونوں زندہ رہ سکتے

ہیں۔تم میری دنیا میں عیش کرو گی۔ اور ہاں تم صرف اپنی امی اور ابا سے مل بھی سکو گی۔ مگر کسی تیسرے فرد سے نہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم کو کوئی تکلیف نہیں دوں گا''۔ اس کے لہجے میں اب برائے نام عاجزی بھی تھی۔

میں مسلسل ہاتھ جوڑے روئی جارہی تھی اور میری نظریں زمین پر گڑی ہوئی تھیں کہ میں ان موٹی موٹی سرخ آنکھوں کو دیکھنے کی تاب ہی نہیں رکھتی تھی۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور ہی میرے لئے کسی خوفناک حادثے سے کم نہیں تھا میں اس کے وجود سے جب اس قدر خوف زدہ ہوگئی تھی تو ساری زندگی کی قربت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اسے میرے دل کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ وہ غصے سے بولا'' ٹھیک ہے۔تم مت کرو مجھ سے شادی میں بھی اب اپنی قوم کے لئے بیکار ہو جاؤں گا لہٰذا اب وہی ہوگا جو میں نے سوچا ہے۔ تاہم میں پھر تمہیں دس دن دیتا ہوں مگر میں رات تم کو یہاں سے اٹھا کر کسی ویرانے میں لے کر چھوڑ آؤں گا۔ اور صبح فجر سے پہلے تمہیں تمہارے کمرے میں چھوڑ جاؤں گا۔ یہ تمہاری سزا ہے۔ اگر تم نے دس دن میں فیصلہ نہیں کیا تو گیارہویں دن میں اپنے ساتھ ساتھ تم کو بھی ختم کر دوں گا۔ خودکشی ہمارے ہاں حرام ہے مگر زندہ درگور ہونے سے بہتر ہے کہ میں حرام موت ہی سہی خود کو زندگی بھر کی اذیت سے بچالوں۔تم اگر بات مان لو تو دونوں زندہ رہ سکتے ہیں ورنہ تم بھی بے موت ماری جاؤ گی''۔

یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنے دونوں ہاتھوں میں ایسے اٹھالیا جیسے کوئی بچی کسی گڑیا کو اٹھالیتی ہے۔ میں چیخنا چاہتی تھی مگر مجھے لگا کہ میری آواز حلق سے باہر نکل ہی نہیں رہی ہے۔ ہاتھ پیروں میں جان نہیں رہی۔ میں ایک گڑیا کی طرح اس کے ہاتھوں میں پڑی تھی۔

وہ مجھے اس بنگلے کی دہلیز پر چھوڑ گیا۔ مجھے یہاں روتے ہوئے پوری رات گزارنی پڑتی ہے۔ پوری رات میں خوف کرب اور اذیت سے گزرتی ہوں اس کا تصور بھی محال ہے۔ آپ پہلے آدمی ہیں جو آج بھولے سے یہاں آگئے ہیں۔ خدا کے لئے میرے لئے کچھ کریں۔ میرے پاس کل کا آخری دن ہے۔ آج آٹھ دن ہوگئے ہیں۔ اس اذیت سے گزرتے ہوئے میرے گھر والوں اور ملازموں کو قطعی علم نہیں کہ میں رات اپنے آرام دہ بیڈ پر سوتی ہوں یا اس ویرانے میں خوف، دہشت اور کرب کے عالم میں گزارتی ہوں۔''

اس کی یہ حیرت انگیز مگر دردبھری کہانی سن کر میری حالت کچھ عجیب سی ہوگئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کردار اصلی ہے، کہانی سچی ہے اور کیا ایسا ممکن ہے۔ میں عجیب گومگو کے عالم میں تھا۔

''آپ کیا سوچ رہے ہیں؟'' اس کے اس جملے سے میں چونک گیا اور اپنی حالت میں آگیا۔

"کچھ نہیں۔ دراصل آپ کی کہانی میری زندگی کی اب تک کی فرضی اور اصلی کہانیوں میں سب سے زیادہ حیرت انگیز اور دلچسپ ہے۔" میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی سچ اگل دیا۔

"کیا آپ کو میری کہانی میں کوئی شک ہے؟ میں نہیں چاہتی کہ آپ بھی اس کے ظلم کا نشانہ بنیں ورنہ میں آپ کو فجر تک یہیں رکنے کا کہتی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کو جان سے مار ڈالے گا۔ میرے پاس صرف کل کا دن ہے خدا کے لئے میرے لئے کچھ کیجئے، مجھے اس ظالم کے شکنجے سے نجات دلا یئے، میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

اس نے اپنے نرم و نازک ہاتھ میرے آگے جوڑتے ہوئے زار و قطار رونے لگی۔

میرا دل پسیج گیا میں نے اسے تسلی دی کہ میں کل صبح ہی کسی اللہ والے کے پاس جاتا ہوں اور اس ظالم جن سے تمہیں آزاد کراتا ہوں۔

یہ کہہ کر میں اٹھا، اس نے میرے اٹھ جانے پر مجھے یوں دیکھا جیسے کسی ڈوبتے کا آخری سہارا بھی اس سے چھن رہا ہو۔ ایک بار پھر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ میں نے بڑے بوجھل قدموں سے گھر کا راستہ لیا۔ اب میرے دل و دماغ سے سارا خوف تو دور ہو گیا تھا مگر اس مظلوم لڑکی کی کہانی پر یقین کرنے کو جی اب بھی نہیں مان رہا تھا۔ حالانکہ اس کی حالت، اس کا رونا اور اس کے واقعی مظلوم ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔ ہمارے معاشرے کے کتنے ہی آزاد خیال گھرانے کی لڑکیاں کم از کم ایسا ڈرامہ نہیں رچا سکتیں کیونکہ جو ماحول اس جگہ کا تھا اسے تو دیکھ کر مضبوط دل گردے والے کا بھی حوصلہ پست ہونے لگتا۔ میں خود حیران تھا کہ میں نے اس ماحول میں کیسے وقت گزارا۔

پھر ذہن میں اللہ والوں کا پتہ ڈھونڈنے لگا میرے دوستوں میں اکثر ایسے اللہ والوں کا ذکر ہوتا رہتا ہے جو کسی کے سر سے بھوت اتارتے ہیں، کسی لڑکی کو جن کے چنگل سے چھڑاتے ہیں، کسی کے سر سے سایہ بھگاتے ہیں۔ اگرچہ میں ان پر اعتقاد ذرا کم ہی کرتا ہوں مگر دوست جس طرح کے واقعات سناتے ہیں وہ اس طرح مضبوط اور پختہ ہوتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے ذہن و دل اسے قبول کر لیتے ہیں۔ میں راستے بھر یہ سوچتا آیا کہ کس دوست سے رابطہ کروں۔ کس دوست کے پاس بڑے پہنچے بزرگ ہیں، جن کے ایک دفعہ کے آجانے سے لڑکی کا مسئلہ حل ہو جائے۔ کیونکہ اس لڑکی کے پاس بھی صرف کل کا دن ہے۔ بیچاری لڑکی۔

گھر پہنچا تو گھر والے پریشان کہ کہاں تو چہل قدمی کے لئے جاتے نہیں تھے اور اب گئے تو ایسے گئے کہ واپس آنے کا نام نہیں لیتے۔ میں نے بہانہ بنایا کہ گل ہاؤس میں ایک دوست کے پاس چلا گیا تھا۔ رات بستر پر نیند آنکھوں سے دور تھی۔ نیند بھلا آتی بھی کیسے۔ بار بار اس لڑکی کا آنسوؤں

سے بھرا چہرہ اور اس کا رونا نظروں کے سامنے آجاتا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ بیگم نے فضائل کی ایک کتاب مجھے دکھائی تھی اس میں انسانی معاشرے میں رونما ہونے والے حادثات، واقعات، سانحات اور جن بھوتوں کے چکر میں مبتلا ہو جانے پر قرآنی آیات درج تھیں۔ میں فوراً بستر سے اٹھا، بیگم کی طرف دیکھا وہ دن بھر کی تھکی بڑی گہری نیند میں تھی۔ میں اسٹیڈی روم میں آیا۔ اور بتی جلا کر کتاب تلاش کی۔ کتاب نہیں ملی۔ پھر خیال آیا کہ ہو نہ ہو بیگم نے اپنے قرآن شریف کے ساتھ رکھی ہو جہاں دیگر اسلامی کتب بھی رکھی ہیں۔ بچوں کے کمرے میں آیا بتی جلائے بغیر اندازے سے ٹی وی کیبنٹ کی طرف بڑھا اور اس کی دراز کھول کر ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ قرآن جزدان میں بندھا ہوا محسوس ہوا، اس کے برابر چند کتابیں محسوس ہوئیں میں سب کتابیں اٹھا کر اسٹیڈی روم لے آیا۔ یہ کل تین کتابیں تھیں، میری مطلوبہ کتاب بھی انہی میں ایک تھی۔ میں دوبارہ اپنے بیڈ پر آ گیا اور ٹیبل لیمپ جلا کر کتاب کی ورق گردانی شروع کر دی کہ شاید اس کتاب سے کوئی ایسی مدد مل جائے، پھر خیال آیا کہ جن تو لڑکی کو فجر سے پہلے اس کے گھر چھوڑ آیا ہوگا۔ اب وہ رات گئے واپس اس ویرانے میں لڑکی کو چھوڑنے آئے گا۔ مولوی صاحب بھلا اس دوران کیا کریں گے۔ کیا وہ رات گئے اس ویرانے میں کوئی عمل وغیرہ کریں گے؟ پھر میں نے اپنے ذہن کو ان خیالات سے جھٹک دینے کی کوشش کی کہ رات ڈھلتی جا رہی تھی اور مجھے صبح دفتر بھی جانا تھا۔

دوسرے دن میں دفتر گیا تو سب سے پہلے میں نے مولوی مشتاق کو تلاش کیا۔ مولوی مشتاق دراصل دفتری ساتھیوں کا رکھا ہوا نام ہے ان کا نام تو مشتاق احمد ہے وضع قطع چونکہ مولوی جیسی ہے اس لئے سب انہیں مولوی مشتاق کہتے ہیں، وہ ان کاموں سے اور ایسے کام کرنے والوں سے خوب واقف ہیں۔ جب میں ان کے سیکشن میں گیا تو پتہ چلا کہ مولوی مشتاق تو چار دن سے چھٹی پر ہیں اور آج ان کی چھٹی کا دوسرا دن ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ دفتر میں سارا دن بظاہر کام تو کرتا رہا مگر ذہن اس ادھیڑ بن میں رہا کہ اب میں کس سے بات کروں، دراصل یہ بات کر کے میں اپنا تماشہ بھی بنانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ دفتر میں بہت کم ایسے لوگ ہوتے ہیں جو سنجیدگی سے ایسے مسئلے کو سننے اور حل کرنے کے لئے صائب مشورے دیں، مشورے تو ایک ہزار مل جائیں گے مگر وہ سب نیم حکیم کے نسخے کی طرح ہوں گے، کام وام ہوگا نہیں بس میرا ریکارڈ لگ جائے گا۔

کام کی زیادتی کی وجہ سے میں نے پھر اس مسئلے پر سوچنا بھی بند کر دیا کیونکہ میں بھی مجبور تھا، دفتر سے چھٹی لے کر جاتا بھی تو کہاں، اگر دفتر ہی نہ آتا تو شاید کسی نہ کسی ایسے بزرگ کو تلاش کر لیتا مگر اب دفتر سے جانا ناممکن تھا۔ لہٰذا صبر وشکر کر کے بیٹھ گیا۔

رات میری ہمت نہ پڑی کہ اس ویرانے کی طرف جاؤں، اگر وہ لڑکی وہاں مل گئی تو میں اسے کیا منہ دکھاؤں گا۔ اسے کیا بتاؤں گا کہ میں اس کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ وہ رات بھی میں نے بے چینی سے گزاری، کوشش بسیار کے باوجود میں اس رات لڑکی کو اپنے ذہن سے نہیں نکال سکا نتیجہ یہ ہوا کہ صبح جب اٹھا تو سر بھاری تھا بلکہ سر میں ہلکا ہلکا درد بھی شروع ہو گیا۔ غسل کیا دفتر کے لئے تیار ہوا مگر کسلمندی کسی طرح ختم نہیں ہوئی۔

دفتر میں کام کی زیادتی کی وجہ سے اس لڑکی کا خیال اور اس کا انجام میرے ذہن سے محو ہو گیا۔ شام آرٹس کونسل چلا گیا، وہاں کسی کتاب کی رونمائی تھی، کئی ایسے احباب مل گئے جن سے ملاقات کو عرصہ ہو گیا تھا، مزید کچھ وقت خوش گپیوں میں گزر گیا۔ مغرب بعد گھر آیا، گھر آتے ہی اس لڑکی کا خیال آیا مگر اب وہاں جانا بے سود تھا کیونکہ بقول اس لڑکی کے گزشتہ کل جن کی دی ہوئی میعاد پوری ہو چکی تھی، ہاں اس جن نے اس لڑکی اور اپنے ساتھ کیا سلوک کیا اس کا مجھے کیا کسی کو بھی پتہ نہیں چل سکے گا مگر اچانک ایک خیال آیا جن جیسا کہ لڑکی نے بتایا اسے بھی مار ڈالے گا اور خود کو بھی ختم کر لے گا کیونکہ وہ کسی بھی صورت زبردستی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا تھا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن کے بارے میں تو کسی کو نہیں معلوم ہو گا مگر لڑکی کے مارے جانے یا اس کے غائب ہونے کی اطلاع تو اخبار میں آئی ہو گی۔ یہ سوچتے ہی میں نے آج کا اخبار دیکھا۔ پورا اخبار چھان مارا، کہیں کوئی ایسی خبر نہ تھی جس سے کسی لڑکی کے اغواء ہونے، غائب ہو جانے یا کسی ویرانے میں اس کی لاش ملنے کی اطلاع ہوتی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لڑکی والوں نے اس خبر کو شائع ہونے سے چھپایا ہو۔ مگر یہ بھی ناممکن سی بات ہے پھر خیال آیا کہ اگر جن نے اپنے ساتھ لڑکی کو بھی مار دیا تو فوراً تو کسی کو اطلاع نہیں ملے گی، اس نے یقیناً لڑکی کو اسی ویرانے میں مکان کے اندر مارا ہو گا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس مکان کی طرف چلا جائے، کچھ نہ کچھ تو سراغ مل جائے گا۔ دن کا وقت ہے اب تو خوف کا وہ عالم بھی نہ ہو گا۔ یہ سوچ کر میں نے دفتر فون کیا اور بتایا کہ میں دفتر دیر سے آؤں گا اور گھر سے تیار ہو کر بائیک میں اس ویرانے کی طرف چلا۔

دن میں بھی وہ جگہ ایسی ہی ویران تھی، کیونکہ ابھی تک اس علاقے میں مزید کسی مکان کے بننے یا بنیاد ڈالنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ دن کی روشنی میں اس جگہ آنے پر مجھے محسوس بھی ہوا اور حیرت بھی ہوئی کہ میں پہلی مرتبہ رات کو چہل قدمی کرتے ہوئے کتنی دور تک آ گیا تھا۔ یہ علاقہ واقعی ویرانہ تھا۔ میں اندازے سے جب اس مکان کی جانب بڑھا تو مجھے اس رات کا منظر یاد آ گیا۔ بالکل وہی مکان تھا میں اس مکان کی جانب بائیک لے جانا چاہتا تھا کہ اچانک میرے پیچھے سے سفید رنگ

کی ہنڈا اکارڈ آئی اور اس مکان کے صدر دروازے پر رک گئی۔ میں گھبرا گیا اور فوراً بائیک کو آگے لے جا کر پلٹا اور اس مکان سے تھوڑا دور لے جا کر کھڑا ہو گیا۔ گاڑی میں کون تھا، یہ میں نہ دیکھ سکا بس دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر مکان کے گیٹ کھلنے کی آواز بھی میں نے سنی، میں اس وقت اپنی بائیک کو اس مکان سے دور لے جانا چاہتا تھا پھر میں نے مکان سے ذرا دور رک کر اپنی بائیک کو کھڑا کیا اور اس کا پلگ نکال کر صاف کرنے کے بہانے اپنی نظریں مکان کی طرف لگا دیں، ویرانی کا وہی عالم تھا بس اس منظر سے خوف نکل گیا تھا۔ اکا دکا آوارہ کتے یا کبھی کبھار کوئی مزدور اس کچے راستے سے گزر جاتا تھا۔ میں حیران تھا کہ نئی ماڈل کی ہنڈا اکارڈ میں کون اس مکان میں آیا ہے کیونکہ یہ مکان کسی طرح بھی آباد نہیں لگ رہا تھا۔ پھاٹک بھی گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ ہاں پھاٹک کے ہنڈل البتہ ہاتھوں کے استعمال سے کچھ صاف نظر آرہے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مکان کسی کے استعمال میں ہے مگر کس کے؟ ابھی میں یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک پھاٹک پھر کھلنے لگا تو میں جلدی سے نیچے بیٹھ گیا اور بائیک کے پیٹرول کی نلکی کو انجن سے نکال کر پلگ کو پیٹرول سے صاف کرنے لگا مگر کن انکھیوں سے پھاٹک کی طرف دیکھتا بھی رہا۔ پھاٹک سے ایک شخص برآمد ہوا، لحیم شحیم، چوڑے شانے والا، سرخ و سفید بڑا چہرہ، سفید عربی لباس میں ملبوس، میں اپنی نظروں کو بچانے میں کامیاب نہ ہو سکا اور اس کی طرف پوری توجہ سے دیکھنے لگا۔ جیسے ہی میں نے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا، میری آنکھیں جیسے کسی تیز روشنی کے اچانک پڑ جانے سے جھپ گئیں، ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس کے چہرے پر آنکھیں نہیں ہیں دو دہکتے ہوئے انگارے ہیں۔ میں نے جلدی سے اپنی آنکھوں کو ملا۔ وہ شخص گاڑی میں بیٹھ چکا تھا اتنے میں اس پھاٹک سے ایک لڑکی برآمد ہوئی لڑکی کو دیکھ کر میرے ہاتھوں سے پلگ گر گیا اور میں غیر ارادی طور پر کھڑا ہو گیا۔ یہ تو وہی لڑکی تھی میں مبہوت ہو کر اسے دیکھنے لگا، اس بات کا بھی خوف نہیں تھا کہ وہ شخص اگر مجھے دیکھ لے گا تو میرا کیا حشر کرے گا۔ لڑکی بہت حسین لگ رہی تھی، چہرے سے کسی بھی قسم کی پریشانی، کرب یا دکھ کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ ہشاش بشاش نظر آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پرس تھا، اس نے مجھے دیکھا، مسکرائی اور گاڑی میں بیٹھنے کے لئے گاڑی کا دروازہ کھولتے وقت اس نے پرس کو اپنے شانوں پر رکھا اور مجھے دیکھتے ہوئے الوداعی ہاتھ ہلایا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے قبل ایک بار پھر اس نے گردن موڑ کر مجھے دیکھا، مسکرائی اور گاڑی میں بیٹھ گئی، گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی روانہ ہو گئی۔

پلگ زمین پر گرا ہوا تھا اور میری بائیک کا سارا پیٹرول مٹی میں جذب ہو چکا تھا۔



اقبال انصاری

آپریشن سداچار

مرتیولوک کے سمراٹ نے اپنے نائب خاص مرتیوکمار کو اپنے آفس میں طلب کیا اور انگلی سے نیچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" دھرتی کے اس ٹکڑے کو دیکھ رہے ہو مرتیوکمار؟"

"جی مہاراج، دیکھ رہا ہوں" مرتیوکمار نے نیچے جھانکتے ہوئے بڑے ادب کے ساتھ جواب دیا۔ اس کی نگاہ زمین کے اس خطے پر مرکوز تھی جو تین طرف سے نیلگوں سبز، نیلگوں سیاہ اور نیلگوں مٹ میلے پانیوں سے گھرا ہوا تھا اور چوتھی سمت سبز و سفید بلندیاں تھیں جن کا سلسلہ سورج کے اس دروازے سے اس دروازے تک پھیلا ہوا تھا۔

"دھرتی کے اس ٹکڑے پر بہت بھرشٹاچار پھیل گیا" مہاراج نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "کبھی یہ ٹکڑا بڑا اپوتر تھا۔ یہاں رشی ہوتے تھے، اچھے انسان ہوتے تھے، کنتو اب اس کی اپوترتا کا کوئی جواب نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ دھرتی کا یہ ٹکڑا پھر سے اپنی پراچین پوترتا کو پراپت کرلے، وہاں کے نواسی پھر سے اتم منش بن جائیں، اپنے دھرم گرنتھ پڑھیں اور ان میں جو آچرن انہیں بتائے گئے ہیں وہ کریں، بھرشٹاچار وہاں سے سماپت ہو جائے، ہر طرف وہاں سکھ شانتی سچائی، نیک چلنی اور ایمانداری کا راج ہو۔ اس دھرتی کھنڈ کا منش ہمیں بہت پریہ ہے...... اس لئے ہم نے تمہیں بلایا ہے۔ تم اپنے ڈھنگ سے دھرتی کے اس کھنڈ سے بھرشٹاچار سماپت کردو...... ایک ماس میں ہمیں پرینام چاہئے اور پرینام کیول یہ ہو کہ اس دھرتی کھنڈ سے بھرشٹاچار پوری طرح سے ختم ہو گیا ہے، اور اس کی مہانتا اسے واپس مل گئی ہے"۔

"جو آگیا مہاراج" مرتیوکمار نے ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر کہا۔

"بس اب جاؤ اور اپنا کام ابھی سے شروع کردو" مہاراج نے حکم دیا۔

مرتیوکمار نے مہاراج کو پرنام کیا اور اپنے آفس میں آکر ایک ارجنٹ میٹنگ طلب کی۔ اپنے نائبین کو حالات سے آگاہ کرتے ہوئے اس نے حکم صادر کیا" اس دھرتی کھنڈ پر جتنے قاتل، ڈاکو، لٹیرے، چور، بلیک میلر اور اسمگلر ہیں، ان سب کو لاکر نرک میں ڈال دو۔" نائبین نے یہی کیا۔ نرک میں خاصی رونق ہو گئی۔

لیکن دھرتی کے اس ٹکڑے پر بھرشٹاچار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ مرتیوکمار نے حکم دیا

"سارے شرابیوں، افیونیوں، چرسیوں، اسمیکیوں کو لاؤ اور نرک میں ڈال دو"۔
وہ سب بھی لائے گئے۔ نرک کی آبادی میں اضافہ ہوگیا۔ مگر نیچے کرپشن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مرتیو کمار نے جھلا کر اپنے نائبین کو حکم دیا۔ "دہشت گردوں، انتہا پسندوں، بردہ فروشوں اور تمام پیشہ ور اور بدکردار عورتوں کو لاؤ اور ڈالو نرک میں۔"
اگلے دن نرک کی رونق دیکھتے ہی بنتی تھی، لیکن وہ سب کرۂ ارض کے جس خطے سے لائے گئے تھے اس میں کرپشن ہنوز جاری رہا۔ مرتیو کمار نے غصے کے ساتھ حکم دیا "فسادیوں اور منافرت پھیلانے والوں کو لاکر ڈالو نرک میں"
نائبین دوڑتے ہوئے چلے گئے اور حکم کی تعمیل کی۔ نرک میں خوب شور شرابا رہنے لگا۔ مرتیو کمار خوش ہوا۔ مگر نیچے جھانکتے ہی اس کا پارہ پھر اوپر ہوگیا۔ اس دھرتی کھنڈ پر اسے نہ کہیں سداچار نظر آیا نہ پوترتا۔ دانت پیس کر اس نے ناجائز اسلحہ سازوں اور ان کے سوداگروں اور خریداروں کو بھی اٹھوالیا۔ نرک سے ٹھونک پیٹ کی آوازیں تو آنے لگیں مگر نیچے وہ بھرشٹ دھرتی کھنڈ بھرشٹ ہی رہا۔ اگلے دن مرتیو کمار نے سارے جواریوں اور جملہ سٹے بازوں کو پکڑوا منگایا۔ مگر نیچے حالات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ مرتیو کمار نے چلا کر کہا "جمع خوروں، ملاوٹ کرنے والوں، نقلی دوائیں بنانے والوں اور زہریلی شراب بنانے والوں کو لاؤ"۔
وہ سب بھی لائے گئے۔ نرک کی آبادی میں خاصہ اضافہ ہوا، مگر اس دھرتی کھنڈ پر کرپشن اپنی پرانی رفتار سے جاری تھا۔ مرتیو کمار نے پھر دانت پیسے "کام چوروں اور وقت چوروں کو لاؤ"
نائبین دوڑتے ہوئے گئے اور کام چوروں اور وقت چوروں کو لاکر نرک میں ڈال دیا، مگر مرتیو کمار سے خوشی اب بھی روٹھی رہی۔ اب بار اس نے ٹیکس چوروں اور رشوت خوروں کو پکڑوا منگایا، پھر بھی جب نیچے اسے کرپشن میں کوئی کمی نظر نہیں آئی تو ہڑتالیں کرنے والوں، تالا بندی کرنے والوں، ہر طرح کی غنڈہ گردی اور داداگیری کرنے والوں کو بھی اٹھوا کر اس نے نرک میں ڈلوادیا۔ پھر بھی نیچے اس دھرتی کھنڈ پر کرپشن اسی رفتار سے جاری رہا جس رفتار سے آپریشن سداچار شروع ہونے سے قبل تھا۔
مرتیو کمار نے سر پکڑ لیا۔ اس کے نائبین اس کے سامنے کھڑے ہانپ رہے تھے۔ آکاش سے دھرتی تک اور دھرتی سے آکاش تک چکر لگاتے لگاتے انہیں خود چکر آنے لگے تھے۔ کئی نائبین کے تو بیس بیس کلو وزن کم ہو گئے تھے۔ انجر پنجر تو سبھی کے ڈھیلے ہو گئے تھے۔ اسی وقت مرتیو سمراٹ ادھر آنکلے۔ مرتیو کمار کا مایوس چہرہ دیکھ کر انہوں نے ایک نگاہ نیچے ڈالی۔ ساری بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ "میں شما چاہتا ہوں مہاراج" مرتیو کمار نے شرمندگی کے ساتھ کہا "میں نے اس کھنڈ کی ایک

چوتھائی دھرتی خالی کرادی، کنتو بھرشٹا چار جہاں تھا وہیں ہے۔"

"تم نے خود غلطی کی مرتیو کمار" مہاراج گرج کر بولے "اگر تم پہلے ہی کیول راج نیتکیوں اور نیتاؤں کو پکڑوا لیتے تو اس دھرتی کھنڈ سے بھرشٹا چار کب کا ساپت ہو گیا ہوتا۔"

"میں جانتا ہوں مہاراج" مرتیو کمار نے کھکھیا کر کہا "پرنتو اگر میں ایسا کرتا تو پھر نرک کو سنبھالنا کٹھن ہو جاتا...... نرک کی دشا بھی دھرتی جیسی ہی ہو جاتی۔

"اوہ!" مہاراج کی آنکھیں گول ہو گئیں "یہ تو ہم نے سوچا ہی نہیں تھا۔ تم نے ٹھیک ہی کیا۔ اب ایسا کرو کہ جن لوگوں کو تم نے پکڑوایا ہے اور نرک میں ڈلوایا ہے، ان سب کو پھر اس دھرتی کھنڈ پر بھجوا دو۔ یہ سب دوشی ہیں کیونکہ یہ سب راج نیتکیوں اور نیتاؤں کے پیدا کئے ہوئے اور پالے ہوئے ہیں۔ ان سب کو بھجواؤ ان کی دھرتی پر اور پھر وہاں کے سارے راج نیتکیوں اور نیتاؤں کو پکڑوا منگواؤ"۔

مرتیو کمار نے ہاتھ جوڑ کر کہا "مہاراج، تب تو دھرتی کے اس کھنڈ پر بہت تھوڑے سے لوگ ہی بچیں گے، کیونکہ وہاں لگ بھگ ہر ویکتی راج نیتکیہ ہے۔ کیول کچھ ہی لوگ اس بھو بھاگ پر ایسے ہیں جن کا راج نیتی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔" "ہوں......" مرتیو سمراٹ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "اس کا ارتھ یہ ہے کہ وہاں کچھ اچھے اور شریف لوگ بھی ہیں۔" "جی مہاراج" مرتیو کمار نے بڑے وثوق سے سر کو اثباتی جنبش دی "اس دھرتی کھنڈ پر کچھ اچھے اور شریف لوگ بھی ہیں۔" مہاراج بولے "تو ایسا کرو کہ راج نیتکیوں اور نیتاؤں کو وہیں پڑا رہنے دو۔ جن لوگوں کو آپریشن میں نرک میں ڈلوایا ہے انہیں پھر سے اس دھرتی کھنڈ پر واپس بھجوا دو، اور جو تھوڑے سے اچھے اور شریف لوگ وہاں ہیں انہیں پکڑواؤ اور نرک میں ڈال دو، کیونکہ وہ اور زیادہ دوشی ہیں۔ انہوں نے اپنی اچھائی سے کوئی کام نہیں لیا اور بھرشٹا چار کو خاموشی سے پھیلنے دیا، پھولنے دیا، پھلنے دیا، اتنا کہہ کر مہاراج اپنے چیمبرس میں چلے گئے۔

مرتیو کمار نے تمام پکڑوائے ہوئے لوگوں کو نرک سے پھر ان کے دھرتی کھنڈ پر بھجوا دیا اور تمام شریف لوگوں کو وہاں سے پکڑوا کر نرک میں ڈلوا دیا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ ایک دن مرتیو سمراٹ ٹہلتے ہوئے نرک میں پہنچے اور ان شریف لوگوں کے نزدیک جا کر بڑے طنز سے بولے "کیا حال ہے آپ لوگوں کا؟"

"مہاراج کی جئے ہو" سبھی نے ایک آواز میں کہا "آپ واقعی کرپالو ہیں، دیا کے ساگر ہیں۔ بس ہماری ایک ہی پرارتھنا، ایک ہی ونتی ہے۔ ہمیں کبھی اس سورگ سے نکال کر ہمارے دھرتی کھنڈ پر واپس مت بھیجئے گا۔" ☆☆☆☆☆

اور انسان جاگ اٹھا

اس کا پورا نام تو جیکب جانسن تھا مگر سب لوگ اسے جیک کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ میرے گھر کے قریب ہی کیمبرج کلوز میں رہتا تھا۔ کیمبرج کلوز میں بارہ گھر تھے اور اس جگہ صرف انگیز اور آئرلینڈ سے ہجرت کر کے انگلینڈ میں آباد ہونے والے سفید فام ہی قیام پذیر تھے۔ جیک اپنی بیوی باربرا کے ساتھ مکان نمبر دس میں مقیم تھا۔ اس کا قد لمبا اور جسم فربہ تھا۔ اس کے چہرے پر نفاست سے تراشی ہوئی داڑھی اور چھوٹی چھوٹی کتروان مونچھوں کے علاوہ ہمیشہ تکبر، نفرت، بے گانگی اور سفاکی کھیلتی رہتی تھی۔ سیاہ فاموں سے نسلی امتیاز برتنے والی دائیں بازو کی نیشنل پارٹی کا وہ ایک سرگرم رکن تھا۔ وہ بڑا ظالم اور جابر قسم کا انسان تھا۔ اسے کالے رنگ کے کسی بھی انسان یا جانور پر رحم نہیں آتا تھا۔ کالے اور رنگدار لوگوں سے وہ سخت نفرت کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کالے لوگ پس ماندہ، جاہل، گنوار اور گھٹیا نسل کے لوگ ہیں۔ ان کی شکلیں گھٹیا ہیں، دماغ گھٹیا ہیں اور وہ صرف گھٹیا اور ادنیٰ درجہ کے کام کرنے کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ سیاہ فاموں سے وہ اس قدر نفرت کرتا تھا کہ کسی بس یا گاڑی میں سفر کرتے وقت اگر کوئی کالا مسافر اس کے قریب آ کر کھڑا ہو جاتا تو وہ اسے بڑی حقارت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنا چہرہ اس طرح دوسری طرف پھیر لیتا تھا جیسے وہ کالا کوئی انسان نہ ہو بلکہ کسی گھٹیا سگریٹ کا دھواں ہو جو مسلسل اس کی آنکھوں میں گھسا جا رہا ہو۔ ایشیا اور افریقہ کے کئی ملکوں سے آنے والے کالے اور رنگدار لوگ اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے اس کا بس چلتا تو وہ ان سب کو گولی سے اڑا دیتا سیاہ فاموں کو دیکھتے ہی اس کے دل میں دبی نفرت کی چنگاری بھڑک اٹھتی تھی اور وہ دھیمی سی آواز میں انہیں ''بلیکی''، ''باسٹرڈ'' یا ''ڈرٹی نیگر'' کہہ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لیا کرتا تھا۔ انگلینڈ میں جوں جوں کالے اور رنگدار لوگوں کی تعداد بڑھتی گئی اس کے اندر کی ساری کی ساری نفرت اور سیاہی اس کے چہرے پر نمودار ہوتی گئی۔ ایک بار جب کونسل نے ہماری سڑک پر ایک خالی مکان افریقہ کے ایک ملک صومالیہ سے آئے ہوئے چند پناہ گزینوں کو الاٹ کر دیا تو جیک نے دو نوجوانوں کو پکڑ کر اس لئے پیٹ ڈالا کہ وہ کالے تھے اور بغیر کوئی کرایہ ادا کئے اس گھر میں رہنے لگے تھے۔ ان

لوگوں سے نسلی امتیاز برتنے کی بنا پر اس پر مقدمہ بھی چلایا گیا تھا مگر وہ بڑی چالاکی سے اس مقدمے سے بری ہوگیا تھا۔ پھر ایک بار جب کالے رنگ کے ایک کتے نے اس کے گھر کے سامنے گندگی پھیلا دی تو اس نے اسے پتھر مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ کتے کے مالک نے اس پر مقدمہ دائر کیا تو اسے تین سو پونڈ جرمانہ ہوا تھا۔ جرمانہ ادا نہ کرنے پر اسے دو ماہ کی قید ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا تھا اور اس کے دل میں سب کالے اور ایشیائی لوگوں کے لئے نسلی تعصب بدستور قائم رہا تھا۔

میرا گھر کیمبرج کلوز کے کونے پر ہی تھا۔ جیک متعدد بار اپنی کار میرے گھر کے سامنے پارک کر جاتا تھا جس کی وجہ سے مجھے اپنی کار کے لئے جگہ نہیں ملتی تھی۔ جب میں نے اسے اپنے گھر کے سامنے کار پارک کرنے سے منع کیا تو وہ مجھ سے بھی الجھ پڑا تھا۔ میں نے جب اسے اسی کی زبان اور لہجے میں کھری کھری سنائیں اور پولس کی دھمکی دی تو اس نے میرے گھر کے سامنے اپنی کار پارک کرنی بند کر دی تھی۔ اس کے بعد میرے ایک آئرش پڑوسی نے اسے بتایا کہ میں کرسچین ہوں اور یونیورسٹی کالج میں انگریزی کا لیکچرار ہوں تو اس نے مجھ سے الجھنا بند کر دیا تھا مگر دوسرے تارکین وطن اس سے بہت خوف کھاتے تھے اور اسے دیکھتے ہی اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیتے تھے۔

ویسے تو جیک ہر روز میرے گھر کے سامنے سے اپنی کار میں گزرتے ہوئے نظر آجاتا تھا مگر اب گزشتہ کئی دنوں سے میں نے اسے یا اس کی بیوی کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کے گھر کا دروازہ تین چار ہفتوں سے بند تھا۔ اس کے پڑوسیوں کو بھی اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ میں نے جب اپنے آئرش پڑوسی مارک سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ کیمبرج کلوز میں کسی کو بھی اس کی خبر نہیں تھی۔ جیک محلے میں اس قدر بدنام ہو چکا تھا کہ کسی کو بھی اس کے بارے میں جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تقریباً چار ہفتے وقت کی لپیٹ میں کھو چکے تھے مگر جیک ابھی تک اپنے گھر نہیں پہنچا تھا پھر ایک اتوار کی صبح کو وہ مجھے اچانک ہولی ٹرنٹی چرچ میں اپنی بیوی باربرا کے ساتھ دکھائی دیا۔ وہ بدلا بدلا سا نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرے سے تکبر، سفاکی، بے رحمی اور نفرت کے سب آثار غائب ہو چکے تھے اور اس کی جگہ پیار، محبت اور خلوص کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں اس کے اس بدلے ہوئے روپ کو دیکھ کر بڑا حیران ہوا تھا کیونکہ آسمان وہی تھا۔ زمین وہی تھی۔ شہر وہی تھا یعنی ہر چیز پرانی تھی مگر اس کا روپ نیا تھا۔ بات کرنے کا انداز نیا تھا اس اتوار کی صبح کو جیک کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ میرے لئے ایک پہیلی سے کم نہیں تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ سے بات کرنے کا خواہشمند ہو مگر میں اس سے کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ نہ جانے کب اور کس وقت

میرے خلاف اس کی نفرت جاگ اٹھتی۔ اس لئے میں اس کو نظر انداز کرتا ہوا اپنی بیوی کے ساتھ گھر لوٹ آیا تھا۔

جب ہم گھر پہنچے تو اس وقت دوپہر کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے اور موسم بہار کی دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ ہم نے گھر پہونچ کر دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر میں ستانے کے لئے اپنے بیڈروم میں چلا گیا اور بیوی باورچی خانے میں اپنا کام سنبھالتی رہی۔ بستر پر لیٹے لیٹے میری آنکھ لگ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو شام کے چار بج رہے تھے اور باہر صبح کی کھلی کھلی دھوپ غائب ہوگئی تھی۔ اس کی جگہ آسمان پر بادل چھا گئے تھے۔ چند لمحوں بعد بادل گرجے اور بارش ہونے لگی۔ اسی اثناء میں میری بیگم نے شام کی چائے کے لئے مجھے آواز دی۔ میں بستر سے اٹھ کر نیچے ڈائننگ روم میں پہونچ گیا۔ ابھی ہم چائے کے لئے ٹیبل پر بیٹھے ہی تھے کہ ہماری کال بیل کی آواز سنائی دی۔ میں نے جب دروازہ کھولا تو باہر جیک اور اس کی بیوی باربرا کو کھڑے پایا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دونوں ایک ساتھ ہی بول اٹھے۔

''گڈ آفٹر نون مسٹر تھامس۔''

''گڈ آفٹر نون مسٹر اینڈ مسز جانسن۔'' میں حیرانگی کے عالم میں بولا۔

''کیا ہم اندر آسکتے ہیں۔؟'' ان دونوں نے کہا۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں نرمی اور چہرے پر اپنائیت کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ جیک کے ہاتھ میں چند کاغذات اور ایک بڑی سی ڈائری تھی۔

''جی تشریف لائیے۔'' میں نے جواب دیا اور وہ دونوں میرے ساتھ ڈرائنگ روم میں آگئے۔

جب ہم اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تو میں نے ان سے پوچھا۔ ''مسٹر اینڈ مسز جیکسن فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''پہلے تو آپ ہمیں مسٹر اینڈ مسز جیکسن نہیں بلکہ جیک اور باربرا کہہ کر مخاطب کریں اور ہم آپ کو جارج کہیں گے کیونکہ اپنوں میں تکلف نہیں ہونا چاہئے۔''

اس وقت ان دونوں کی باتوں میں بڑی مٹھاس اور چہرے پر محبت اور خلوص کے آثار دیکھ کر میں بہت حیران ہو رہا تھا۔ جیک کے کردار میں کس قدر تبدیلی آچکی تھی۔ نہ جانے وہ کیوں اور کیسے اتنا بدل چکا تھا۔ چند لمحوں تک میں ان دونوں کے چہروں کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو جیک ہم تو پڑوسی ہیں۔ ہم میں تکلف کیسا۔ آج پہلی بار آپ میرے

غریب خانے تشریف لائے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی وجہ پوچھوں۔ بتایئے کیا آپ ہمارے ساتھ چائے نوش فرمائیں گے؟"

"ہاں دوست چائے تو ضرور پئیں گے۔"

ان کا جواب سنتے ہی میں نے اپنی بیگم کو چائے لانے کے لئے کہا۔ چائے تو قریب تیار تھی۔ بیوی فوراً چائے کی ٹرے سجا کر کمرے میں لے آئی۔ چائے ختم کرتے ہی میں نے جیک سے پوچھا۔ "لگتا ہے کہ آج کوئی خاص بات ہے جو آج آپ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے ہیں۔"

"ہاں بات تو خاص ہی ہے۔ سونامی میں تباہ ہونے والے ملکوں، خاص کر تھائی لینڈ۔ انڈومان اور نکوبار جزائر۔ انڈیا اور سری لنکا کے بے گھر اور لاچار انسانوں کی مدد کے لئے ہم نے ایک ریلیف فنڈ قائم کیا ہے۔ اسی سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔ ہم دونوں ہی نہیں بلکہ میرے کئی اور انگریز ساتھی بھی اس نیک کام میں میری مدد کر رہے ہیں آپ سے بھی درخواست ہے کہ اس ریلیف فنڈ میں زیادہ سے زیادہ حصہ ڈال کر دکھیوں، یتیموں اور بے گھر لوگوں کی مدد کریں۔ یہ بڑے ثواب کا کام ہے۔"

جیک کے منہ سے ایسے کلمات سن کر میں حیرت اور استعجاب بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جیک جیسا جابر اور نسل پرست کالے لوگوں کی مدد کے لئے چندہ اکٹھا کرنے نکلا ہے۔ میں چند لمحوں تک اس کے چہرے کو بغور پڑھتا رہا اور پھر بولا:

"جیک تم تو کالے اور رنگ دار لوگوں سے شدید نفرت کرتے ہو پھر اچانک ان کی مدد کرنے کا خیال تمہارے دل میں کیسے آیا؟"

"میرے دوست نفرت کرتا نہیں ہوں بلکہ کرتا تھا۔ اب میری آنکھوں سے نفرت اور حقارت کا وہ کالا پردہ اٹھ چکا ہے اور یہ سارا کرشمہ سونامی کی لہروں کے قہر نے کر دکھایا۔"

"سونامی کی لہروں نے" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں میرے دوست میں تو تمام عمر اندھیرے میں بھٹکتا رہا مگر سونامی کی لہروں نے نفرت کی تاریک غاروں سے نکال کر مجھے زندگی کا صحیح راستہ دکھایا۔"

"وہ کیسے؟ میری بیوی اور میں نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

ہمارا یہ سوال سنتے ہی وہ کہنے لگا۔ "شاید آپ کو یہ معلوم ہی ہو کہ ہر سال کرسمس کی چھٹیاں گزارنے کے لئے ہم میاں بیوی کبھی ہانگ کانگ، سنگاپور یا تھائی لینڈ چلے جاتے تھے۔ اس بار بھی کرسمس کا تہوار منانے کے لئے ہم نے چند دوستوں کے ساتھ تھائی لینڈ کا رخ کیا اور وہاں ایک

چھوٹے سے قصبے فوکٹ۔ جو عین سمندر کے کنارے واقع ہے کے ایک عالی شان ہوٹل "لاپلازہ" میں ٹھہرے تھے۔ یہ ہوٹل صرف یوروپین لوگوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس ہوٹل میں کوئی بھی سیاہ فام قیام نہیں کرسکتا تھا۔ البتہ کچھ مقامی اور کئی دوسرے ملکوں سے آنے والے رنگدار لوگوں کو صرف ہوٹل کے کمروں اور برتنوں کی صفائی وغیرہ کے لئے ملازم رکھا گیا تھا۔ ہمیں یہ ہوٹل اور جگہ بہت پسند تھی۔ کیونکہ یہ ساحل سمندر پر واقع ہے۔ ہم دونوں کو سمندر کے ساحل پر بڑا سکون ملتا ہے اور سمندر کے کنارے اگے ہوئے اونچے اونچے درخت جب کسی جوان لڑکی کے لمبے لمبے اور آوارہ بالوں کی طرح ہوا میں لہراتے ہیں تو آپس میں ایک عجیب انداز میں سرگوشیاں کرتے نظر آتے ہیں اور رات کے وقت چاند کسی شرمائی ہوئی دلہن کی طرح ان لمبے لمبے درختوں کی اوٹ میں چھپا رہتا ہے مگر اس کی سیمیں کرنیں سمندر کی مچلتی ہوئی لہروں سے ہم آغوش ہوتی رہتی ہیں۔ ایسے خوبصورت قدرتی مناظر کو دیکھ کر ہمارے دل کو بہت سکون ملتا ہے۔ اسی سکونِ دل کی خاطر ہم اس برس بھی وہاں گئے تھے مگر کیا معلوم تھا کہ اس سال ہمارا سکون درہم برہم ہوکر رہ جائے گا۔

۲۵ دسمبر ۲۰۰۴ء کی شام بڑی حسین تھی۔ ہوٹل "لاپلازہ" کو بڑی محنت اور خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ سمندر کی تازہ پاک اور صاف ہوا پیڑوں کے بڑے بڑے پتوں سے گزرتی ہوئی فضا میں مدھر نغمے بکھیر رہی تھی اور کرسمس کی چھٹیاں منانے کے لئے ہم لوگ ہوٹل کے ہال میں اکٹھے ہوئے تھے۔ وہاں زندگی میں حسن تھا۔ لطافت تھی، وقت کس قدر خوبصورت تھا اور لمحات سج دھج کر ہمارے سامنے سے گزر رہے تھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے فضا سے نور ہی نور برس رہا ہو۔ کرسمس کے شاندار اور پرلطف ڈنر کے بعد ہم سب لوگ موسیقی کی لے پر ڈانس کرنے لگے تھے۔ آدھی سے زیادہ رات گزر جانے کے بعد بھی سازندوں کی لے پر ڈانس ہوتا رہا۔ جسم ڈانس ہال کے فرش پر تھرکتے رہے اور پھر جب ہم تھک گئے تو ہم لوگوں کا رقص بھی تھم گیا۔ ہم لوگ بہت خوش تھے۔ دوسری صبح باکسنگ ڈے تھا۔ یہ ہمارے لئے بڑا اہم دن ہوتا ہے کیونکہ کرسمس کے دن ملے تحفوں، جو چھوٹے بڑے ڈبوں میں بند ہوتے ہیں کو صبح ہوتے ہی کھولتے ہیں مگر افسوس اس بار ہمیں وہ موقع نصیب نہ ہوسکا۔ ابھی ہم جی بھر کر سوئے بھی نہیں تھے اور صبح کا اجالا نمودار ہونے ہی والا تھا کہ وہاں بابا کارمچ گئی۔ سمندر کی البیلی اور دھیمے سروں میں کھیلنے والی لہریں اب ایک خوفناک شکل اختیار کرچکی تھیں۔ لہروں اور موجوں کے خوفناک شور اور بڑے بڑے تھپیڑوں کے سوا کچھ سنائی یا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جدھر نظر جاتی تھی سمندر کی ہیبت ناک لہریں تھیں۔ خوفناک موجیں ہر چیز کو اپنی بانہوں میں سمیٹے بہائے لئے جارہی تھیں۔ یہ سمندری تلاطم دور کہیں سمندر کے نیچے زلزلہ آجانے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا

اور اس وقت سمندری تلاطم کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ اونچے اونچے درخت۔ ساحل کے قریب بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھر۔ ان گھروں کے مکین اور ان کا سامان سب تیزی سے بہتے جا رہے تھے۔ اس صبح سمندری لہروں کی رفتار شاید پانچ سو کلومیٹر سے بھی زیادہ تھی۔ سارے کا سارا علاقہ سونامی کی ان لہروں کی لپیٹ میں آ چکا تھا اور سمندری تلاطم سے پیدا ہونے والی وہ زوردار لہریں کسی خوفناک اژدھے کی طرح سب کچھ نگلتی جا رہی تھیں۔

ہم لوگ ہوٹل کی دوسری منزل پر مقیم تھے اور سوچ رہے تھے کہ ہم ان تیز رفتار اور خوفناک لہروں سے بالکل محفوظ تھے مگر ہمارا یہ خیال غلط نکلا۔ یکا یک ایک مہیب اور انتہائی خوفناک لہر ہمارے ہوٹل سے آ کر ٹکرائی اور آدھی عمارت مسمار ہو گئی۔ اس ناگہانی آفت سے ہر کسی کے چہرے پر خوف و ہراس پھیل چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم بھاگ کر کسی محفوظ جگہ پر پناہ لیتے کہ ایک دیوزاد لہر بلا کی صورت میں ابھری اور چند دوسرے لوگوں کے ساتھ میری بیوی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لہر گزر جانے کے بعد مجھے میری بیوی کا وجود کہیں نظر نہ آیا اور میں اس کو خود سے بچھڑتا دیکھتے ہی کانپ کر رہ گیا۔ میرے پاؤں تلے سے زمین کھسکتی نظر آنے لگی۔ پھر چند لمحوں بعد ہی میری بیوی کا جسم ریسپشن ہال کے حشر برپاتے پانی میں ہاتھ مارتے نظر آیا۔ وہ بلڈنگ کے ایک بڑے سے ستون کے ساتھ اٹکی پانی میں ڈبکیاں کھا رہی تھی۔ میں اس کو پانی میں ڈوبتا دیکھ کر چلا اٹھا۔ ''بچاؤ۔ بچاؤ۔ کوئی میری وائف کو بچاؤ'' مگر وہاں کے شور و غل میں میری آواز کسی کو سنائی نہیں دے رہی تھی۔ قریب تھا کہ سونامی کی کوئی دوسری طوفانی لہر اسے اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی کہ ہوٹل کے دو رنگدار مزدوروں نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے تیزی سے پانی میں کود کر میری بیوی کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر پانی سے باہر اچھال دیا۔ اس اثنا میں پھر ایک لہر اٹھی اور ایک رنگدار مزدور کو بہا کر لے گئی۔ یہ بڑا کربناک منظر تھا میری بیوی کے جسم پر بہت خراشیں آئی تھیں اور وہ بیہوش ہو چکی تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر میں کسی انجانے خوف کی صلیب پر جھولنے لگا تھا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو چکی تھیں۔ لاکھوں انسانوں کو برباد کر کے جوں ہی سونامی کا خدائی قہر تھما تو میری بیوی کو ایک مقامی اسپتال میں پہنچایا گیا۔ وہاں پر بھی اس کا علاج ایک ایشیائی ڈاکٹر نے بڑی محنت، لگن اور قابلیت سے کیا اور وہ چند ہی دنوں میں بالکل تندرست ہو گئی۔ ان مقامی رنگدار لوگوں کی ہمت اس ایشیائی ڈاکٹر کا پیار، محبت اور زخمی لوگوں کی تیمارداری کرنے کی لگن دیکھ کر میرے ضمیر نے مجھے جھنجھوڑا۔ میرے اندر کا انسان جاگ اٹھا۔ اور میرے ضمیر کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ ''جن کالے اور رنگدار لوگوں سے تم عمر بھر نفرت کرتے رہے انہیں ادنی، حقیر اور پست کردار کے لوگ کہتے رہے انہیں میں سے ایک

نے اپنی قربانی دے کر تمہاری بیوی کو بچالیا تھا۔ اس کے ساتھ تمہارا کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا۔ اگر کوئی رشتہ تھا تو صرف انسانیت کا رشتہ تھا۔ جلد کا رنگ کالا ہونے سے کوئی انسان حقیر، گھٹیا یا اوچی نسل کا نہیں ہوسکتا۔ انسان کی پہچان صرف اس کی انسانیت سے ہی ہو سکتی ہے۔'' اپنے اندر کی یہ آواز سنتے ہی میرے جذبات اور احساسات نے ایک نیا موڑ لیا۔ ایک نیا راستہ دیکھا اور نئے راستے پر پہلا قدم رکھتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میرے خون کی گردش معمول پر آ گئی تھی۔ تنا ہوا جسم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ نفرت، تعصب، حقارت اور غرور کا ہر خیال کسی اندھیرے کنوئیں میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔ میرے من کا ساگر چھلک اٹھا تھا۔ آنکھوں میں پچھتاوے کے آنسو بہہ نکلے تھے۔ جب من کا میل آنسو بن کر میرے اندر سے نکل چکا تو میں ایک نیا انسان بن کر گھر لوٹا۔ آتے ہی میں نے چرچ میں جا کر خداوند یسوع مسیح سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ مگر یہ کافی نہیں ہے کیونکہ آج بھی اس حادثے نے ہم دونوں کے ذہنوں کو اس شدت سے جکڑ رکھا ہے کہ ہم میاں بیوی کانپ کر رہ جاتے ہیں۔ اب ہم نے سونامی میں تباہ ہونے والے سب انسانوں کی تن-من اور دھن سے مدد کرنے کا پکا ارادہ کرلیا ہے تا کہ ہمارے عمر بھر کے گناہوں کا کفارہ ہو سکے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بہت جذباتی ہو گیا تھا پھر اچانک اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر بہہ نکلا اور بہتا ہی چلا گیا۔

☆☆☆☆

....بقیہ صفحہ ۱۳۸

''انہوں نے کہا ہے کہ وہ کسی غنڈے کی بیٹی سے رشتہ نہیں کر سکتے''۔

راجہ کو اپنے متعلق ایسی رائے سن کر غصہ تو آیا مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے پوچھا

''وہ اس بستی کے رہنے والے تو نہیں، انہیں میرے بارے میں کیسے علم ہوا؟''

اب اس کی بیوی نے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے مایوسی سے جواب دیا۔

''ایسی باتیں ڈھکی چھپی نہیں رہتیں۔ بدنامی، نیک نامی سے زیادہ پھیلتی ہے''

اب یکا یک راجہ کے کانوں میں بستی کے لوگوں کے طنزیہ قہقہے گونجنے لگے اور ذہن میں کسی آنے والے خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ وہ سامنے کھڑی اپنی بیٹی کی سوال کرتی آنکھوں کی تاب نہ لا سکا اور اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆☆

غزلیں

کرشن کمار طور
دھرم شالہ

یقیں نہیں ہے تو لب پر دعا نہ آنے پائے
شکستہ کمرے میں ہرگز ہوا نہ آنے پائے

مجھے خود اپنے ہی زخموں سے کچھ فراغ نہیں
کوئی پیام بس اب یار کا نہ آنے پائے

ہے جو بھی فیصلہ کرنا وہ دو بدو کرلیں
ہمارے بیچ ہماری انا نہ آنے پائے

فقیر اور شہنشاہ میں کوئی نہیں فرق
بس ایک تسمۂ رنگیں قبا نہ آنے پائے

نشانِ خیر یہی ہے سلوک خیر یہی
مری زباں پہ کبھی بد دعا نہ آنے پائے

لبوں پہ ضبط فغاں کا چراغ جلتا رہے
ہو درد جتنا بھی لیکن صدا نہ آنے پائے

خدا کا مسئلہ اب تیرے اس کے بیچ ہے طور
خیال رکھنا کوئی تیسرا نہ آنے پائے

اسلم حنیف

(شجرۂ اخرب واخرم کے اشتراک سے ماورا)
مروّجہ چوبیس اوزان میں

اظہار سے محروم ہوں ہوکر فنکار
یارب! یہ عطا کئے ہیں کیسے آزار

ہر سینۂ دشمن میں حسد جاگ اٹھے
کر اتنا بلند اپنا کردار و وقار

کردے وہ عطا یارب اسلوب مجھے
الفاظ ہوں سادہ اور معنی تہہ دار

پھر فیض ہی کیا بہار کی آمد سے
غنچوں کا اگر نہ ہوسکے سینہ فگار

ملتی نہیں عزت کی دولت اس کو
جس شخص کے ہوتے نہیں شستہ افکار

دے گی مجھے دھوکا یہ کہاں تک یارب
احساس میں رخشندہ خزاں دیدہ بہار

رؤف خیر

(ایک نئی صنف سخن جس میں دو مختلف کرداروں کا جائزہ تیسرا کردار بہ حیثیت مبصر لیتا ہے۔ خیر)

اقبال

رحمتہ اللہ علیہ سبھی اقبال — کچھ عقائد تو ان کے ایسے تھے
ماننے میں جنھیں تامل ہو — سربسر صوفیوں کے جیسے تھے
خارجیت سے بھی عقیدت تھی — غرقِ شیعیت اک سے سے تھے
بدعتی اور خبیث بھی خوش تھے
ان سے اہل حدیث بھی خوش تھے

اقبالیئے

فکر اقبال ہے بہت مشکل — اور بعضوں کے واسطے آسان
وہ بھی اقبال کی تلاش میں ہیں — جو کبھی دیکھتے نہیں قرآن
کچھ تو اقبال کے مخالف ہیں — کچھ ہیں اقبالیئے علی الاعلان
جن کی پہچان کچھ نہیں تا حال
ان کی پہچان ہوگئے اقبال

مبصر

ایک اقبال ہی پہ کیا موقوف — آدمی ہی تھے ، پیر، پیغمبر
کوئی آکاش سے نہیں اترا — جنم سب کا ہوا ہے دھرتی پر
بھول چوک آدمی کی فطرت ہے — آدمی پھول ، آدمی پتھر
تم اگر چاہتے ہو شہرت ہو
ہر بڑے آدمی کو گالی دو

☆

غزلیں

ڈاکٹر اوم پربھاکر
بجنڈ (ایم.پی.)

کب ہوئی ابتدائے سفر بھول جا
ختم ہوگی کہاں رہ گزر بھول جا

پہلے یہ بھول جا کیسے گزرا سفر
پھر تو اپنا شہر اپنا گھر بھول جا

بھول جا تیری آنکھوں کا کیا کام ہے
اپنی پہچان کو سر بہ سر بھول جا

جتنی طے تھیں اڑانیں کبھی بھر چکا
آسمان و ہوا بال و پر بھول جا

پھول بن کے کھلا تھا کسی باغ میں
ماں زمیں تھی پتا تھے شجر بھول جا

ڈال کر تجھ کو منجدھار میں جو گئی
وہ کہاں سے اٹھی تھی لہر بھول جا

انتساب-۵۷

خواب میں ہی مگر دیئے ہوتے
بے ٹھکانوں کو گھر دیئے ہوتے

اپنے گلشن کے چار چھ غنچے
نام پت جھڑ کے کر دیئے ہوتے

میں بھی کہتا کبھی سبحان اللہ
دو نوالے تو تر دیئے ہوتے

میری بستی کے کچھ درختوں کو
کھانے لائق ثمر دیئے ہوتے

اتنا بے سمت آسماں دے کر
دو سے زائد تو پر دیئے ہوتے

شاہد عزیز
اودے پور، انڈیا

قصّہ

نہ جانے کب کا قصہ ہے
جو وہ مجھ کو سناتا ہے
کہ پہلے لوگ آپس میں
بہت مل جل کے رہتے تھے
کسی کے غم میں روتے تھے
خوشی میں مسکراتے تھے
کسی کی جب کوئی حاجت
کبھی پوری نہیں ہوتی
تو آپس میں کبھی مل کر
اس کی سب ضرورت
پوری کرتے تھے
کبھی کچھ ٹھیک ہو جانے پر
وہ خوشیاں مناتے تھے
نہ جانے کب کا قصہ ہے
جو وہ مجھ کو سناتا ہے
کہ پہلے لوگ اپنے گھر سے
جب بھی دور جاتے تھے
تو گھر کی ساری چیزوں کو
پڑوسی کے یہاں پر
رکھ کے جاتے تھے
اور جب بھی لوٹ کر آتے
تو اپنی ساری چیزوں کو
بہت محفوظ پاتے تھے
مگر اب تو ہم اپنے گھر کی
دیواروں سے ڈرتے ہیں
نہ جانے کب کوئی آ کر
مکینوں کو جلا ڈالے
پرانے سارے رشتے
ایک ہی پل میں مٹا ڈالے
☆

ڈاکٹر بختیار نواز
بنارس

غزل

تری زلفوں کا جب سایہ نہیں تھا
تو دل پہ درد کا پہرہ نہیں تھا

تری آنکھیں سمندر سی ہیں گہری
مجھے پہلے یہ اندازہ نہیں تھا

ہم ایسے گھر میں رہتے تھے جہاں پر
دریچہ تھا تو دروازہ نہیں تھا

تھی لاکھوں آدمی کی بھیڑ لیکن
کوئی انسان کا چہرہ نہیں تھا

تمہیں کو سوچنا ہے زندگی بھر
یہ سب پہلے کبھی سوچا نہیں تھا

نوازؔ اک بے وفا کی بے رخی سے
میں تنہا ہو کے بھی تنہا نہیں تھا

غزلیں

نذیر فتح پوری
ایڈیٹر اسباق، پونا

محفل محفل آگ لگاتے لوگ ملے
لبوں کی بارود بجھاتے لوگ ملے
میں لوگوں سے ملتا بھی تو کیا ملتا
مجھ کو میرا "میں" سمجھاتے لوگ ملے
پانی کی بوندوں نے وہ سنگیت دیا
پنگھٹ پنگھٹ گیت سناتے لوگ ملے
بچپن کی شوخی سے بوڑھی سوچوں تک
تتلی کے پیچھے منڈلاتے لوگ ملے
برفیلے احساس نے جب انگڑائی لی
پاس پڑوس سے آگ چراتے لوگ ملے
ریت کی ڈور تھا رشتوں کا احساس نذیر
تیز ہوا سے لڑتے لڑاتے لوگ ملے

جاوید عرشی

احساس پہ چھائے ہوئے جادو سے نکالا
میں نے تیرا امکاں تیری خوشبو سے نکالا
فرصت میں ڈوپٹے کی گرہ کھول کے اُس نے
اک یاد بندھی تھی جسے پلّو سے نکالا
چھلکی تو مسرت تھی مگر اہل جہاں نے
کچھ اور ہی مطلب میرے آنسو سے نکالا
تاروں میں نمایاں تیری تصویر بنا کر
اک چاند نیا چاند کے پہلو سے نکالا
اُس حسن کے پیکر نے کھنکتا ہوا لہجہ
خود اپنی ہی پازیب کے گھنگرو سے نکالا
اب تک جو میری تشنہ دہانی میں نہاں تھا
میں نے وہی دریا میرے چلّو سے نکالا

مجھے ترکِ تعلق کی سزائیں دے رہے ہیں لوگ
اور اس کے بعد بھی شبھ کامنائیں دے رہے ہیں لوگ
ہیں سب افراد گھر کے صحن میں موجود، اس پر بھی
پسِ دیوار یہ کس کو صدائیں دے رہے ہیں لوگ
اندھیرے گھر میں رکھوں گا انہیں سوغات کی صورت
مجھے جو چاند تاروں کی ردائیں دے رہے ہیں لوگ
دلوں کی بستیاں جس نے اُجاڑی ہیں نذیر احمد
اسی طوفان کو مل کر دعائیں دے رہے ہیں لوگ

بھگوان داس اعجاز

نئی دہلی

پاسبان

جب کوئی سایہ دکھائی دے
بیگانی ذات کا
ٹوٹ پڑتا ہے
آسماں سر پہ اٹھائے
ٹوٹ پڑتا ہے
آسماں سر پہ اٹھائے
پالتو کتا!
اس سرے سے اُس سرے تک۔
بھونکتا ہے
ہاں جو ہاں ملائے
محلے کے سبھی کتے
جواباً
چونکتے ہیں
بھونکتے ہیں
جیسے اک سپاہی
سیٹی بجا کر
رابطہ کرتا ہے قائم
اپنے کو جکڑتا ہے
آہنی زنجیر بن کر

شکار

بعد مدت اک دوست نے
مدعو کیا
شکار کے لیے
شوق ڈھلتی عمر کے
ہائے اللہ
بیوی بدبدائی اور بولی۔
دانت نقلی گھر پہ ہی رکھ جائیے
اٹھاؤ مت! روپے تین سو کا۔
جوکھم!

نا مرے بچے
باگھ کا شکار ہے
دل لگی نہیں
مدتوں پہلے کہا تھا
میری اماں جان نے!

اجازت مل گئی اور چل دیئے
پہنچ کر تالاب پر
بانس اور رسی نکالی دوست نے
شکار باگھ کا نہیں۔۔۔ مچھلی کا
دن ہوا تمام
لوٹے ہیں خالی ہاتھ
دونوں سر جھکائے ساتھ ☆

غزلیں

ملک زادہ جاویدؔ
غازی آباد

رت کی دریا دلی کا اثر ہوگیا
میرے گملے کا پودا شجر ہوگیا

میرے قدموں کی آہٹ غزل نے سنی
اس حوالے سے میں معتبر ہوگیا

اپنے اخلاق سے میں پریشان ہوں
ہنس کے جس سے ملا میرے سر ہوگیا

عمر ڈھلنے پہ دلچسپیاں گھٹ گئیں
اُس کا قصہ بہت مختصر ہوگیا

میرے ہاتھوں میں آسیب جیسا ہے کچھ
میں نے جس کو چھوا بے ہنر ہوگیا

جو بھی جاویدؔ آیا ، رُکا چل دیا
میرا دل اک مسافر کا گھر ہوگیا

تلک راج پارسؔ
جبلپور

خدا نے جن کے معانی نہیں بتائے ہیں
وہ صرف ذہن میں اپنی جگہ بنائے ہیں

ستارے شمس و قمر آنکھ روشنی دستہ
ہم ایسی نعمتیں پا کے بھی لڑکھڑائے ہیں

کبھی کبھار اگر "میں" زباں پہ آیا ہے
ہم اپنی ذات سے کس . . . خوف کھائے ہیں

کسے خریدیں کسے چھوڑ دیں یہ الجھن ہے
ہمارے خواب ہر اک شے میں جھلملائے ہیں

جو اپنے آپ پہ قابو کبھی نہ رکھ پائے
اب ان کے ہاتھ میں سب اختیار آئے ہیں

ہر ایک جنس سے رکھتا ہے رابطہ اپنا
بشر نے اپنے کئی سلسلے بنائے ہیں

جب ایک مومن دلوں میں اتر گیا پارسؔ
تو ہم نے رب کی عبادت میں سر جھکائے ہیں

غزلیں

احمد سراج فاروقی

نہیں یہ شہر اب ایسا بھی بے منظر نہیں لگتا
جو خوابوں نے تراشا بس وہی پیکر نہیں لگتا

کہیں کا بھی نہیں رکھا ہمیں گھر کی سیاست نے
جہاں پیدا ہوئے وہ گھر ہی اب تو گھر نہیں لگتا

ہمیں بھی گردشِ حالات نے کتنا بدل ڈالا
کسی کے طنز کا نشتر بھی اب دل پر نہیں لگتا

ہمارے رہبروں کی یہ کرم فرمائی ہے ہم پر
کسی رہزن سے لٹنے کا ہمیں اب ڈر نہیں لگتا

تمہارے ہجر میں بھی نیند اب تو آ ہی جاتی ہے
کوئی بستر بھی اب کانٹوں بھرا بستر نہیں لگتا

جو پھل دیتے ہیں اوروں کو انہیں کا یہ مقدر ہے
جو سوکھے پیڑ ہوتے ہیں انہیں پتھر نہیں لگتا

اپنی پلکیں یوں ہی اشکوں سے بھگونے والا
اب نہیں کوئی میری یاد میں رونے والا

چاہتا ہوں کہ بدل جائے یہ دنیا لیکن
مجھ سے یہ کام اکیلے نہیں ہونے والا

یوں نہ ہو، یوں ہو، نہیں ایسا نہیں ایسا ہو
اپنے سوچے سے یہاں کچھ نہیں ہونے والا

ایک دن ہم پہ مسلط وہ کیا جائے گا
قتل کرکے جو نہیں ہاتھ بھی دھونے والا

کھل گئی مجھ پہ حقیقت میرے افسانے کی
اب میں راتوں کو نہیں چین سے سونے والا

اپنے حصہ کے بھگتتے ہیں یہاں سب کو عذاب
دوسرا کوئی نہیں بوجھ یہ ڈھونے والا

خود بخود بنتا چلا جائے ابھی ہار سراج
کوئی آئے تو سہی پھول پرونے والا

ایکسرے

نام کتاب : بادبان
مصنف : ایڈیٹر ناصر بغدادی
مبصر : سیفی سرونجی

سہ ماہی بادبان مشہور کہانی کار ناصر بغدادی کی ادارت میں نکلتا ہے جس کا ہر شمارہ ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے شمارہ نمبر 15 - چار سو اڑتالیس صفحات پر مشتمل ایک ایسا شمارہ ہے جس میں صرف کہانیاں، غزلیں، نظمیں ہی نہیں ہیں بلکہ ادب کے تمام اصناف پر بھر پور مضامین اور کچھ ایسے منفرد کالم ہیں جو بادبان دوسرے ادبی رسائل سے الگ دکھائی دیتا ہے سب سے اہم تو ناصر بغدادی کے اداریے ہوتے ہیں جن میں پورا ادبی سیاسی پس منظر ہوتا ہے ان کے ان بیباک اداریوں کی گونج ادبی دنیا میں سب سے زیادہ دکھائی دیتی ہے وہ کھل کر ہر موضوع پر گفتگو کرتے ہیں اور اپنی تحریر کے ایک ایک لفظ میں سچائیوں کے موتی پرو دیتے ہیں اور یہ تلخ ترش سچائیاں پڑھنے والوں کو ادب میں ہونے والی گروپ بندیوں اور ان سے منسلک تمام چہروں کو بے نقاب کر دیتی ہیں۔ حالانکہ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا لہجہ تلخ ہو گیا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب کو سچ کا آئینہ دکھانے کی خاطر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو ضائع کر رہے ہیں اس لئے کہ ان کی کہانیاں اتنی زوردار ہوتی ہیں کہ وہ ادب میں ایک منفرد مقام کی حامل قرار دی جانے والی ہیں لیکن وہ اپنا وقت جذباتی تحریروں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ لیکن ادب میں ہونے والی دھاندلیوں کو اجاگر کرنے والے اگر خاموشی اختیار کر لیں تو یہ ادب کی دھارا نہ جانے کن سمتوں میں چل جائے اس لحاظ سے ناصر بغدادی کے یہ بیباک اداریے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ کوئی تو اپنا لکھنے والا ہے جو بغیر مصلحت بنا کسی سے مرعوب ہوئے سچ کے اظہار میں اپنے آپ کو تمام خطرات سے بچاتے ہوئے صرف قلم کی طاقت پر تن تنہا میدان جنگ میں کھڑا ہے اس لئے کہ ادب بھی اب جنگ کا میدان ہو گیا ہے جس میں جتنی طاقت ہے وہ اتنا ہی بڑا ادیب ہے بہر حال بادبان میں ادب کے ہر منفرد موضوع پر ایک ایسا انتخاب ہوتا ہے کہ قاری کو نہ صرف پوری ذہنی تسکین ہو جاتی ہے بلکہ اس کی معلومات میں ایک زبردست اضافہ ہو جاتا ہے مثلاً چوکھٹے میں جو اقتباس دیئے جاتے ہیں وہ بے حد اہم اور معلوماتی ہوتے ہیں وہ خطوط تاثرات بادبان ایک ایسی انفرادی پیش کش ہوتی ہے جو اردو کے کسی دوسرے رسالے میں نظر نہیں آئے گی۔ سچائی تو یہ ہے کہ بادبان کا ہر ضخیم شمارہ ناصر بغداد کی صلاحیتوں کا جیتا جاگتا نمونہ ہوتا ہے جس سے ان کی مدیرانہ

قابلیت، ناقدانہ اور ایک سچے بیباک صحافی کی شخصیت بھی اجاگر ہوجاتی ہے بادبان کے شمارہ 15 میں بارہ بہترین کہانیاں شامل ہیں جن میں اقبال متین، حسن منظر، ڈاکٹر سلیم اختر، رشید امجد، قیوم راہی، حسین الحق، طاہر نقوی، مشتاق احمد، احمد ظفر، محمد حامد، سراج ناصر بغدادی شامل ہیں۔

غزلوں میں یوں تو 25 سے زیادہ شاعروں کی غزلیں شامل ہیں لیکن ندا فاضلی، مظفر حنفی، زبیر رضوی، کرشن کمار طور کی غزلیں خوب ہیں۔ دوسرے دنیا کی مختلف زبانوں میں لکھی جانے والی بہترین تخلیقات کے تراجم ہیں جنہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں ہی نہیں دیگر زبان میں کتنا اچھا اور کیا کچھ لکھا جارہا ہے پروفیسر گیان چند جین اور لطیف الزماں نے بہترین خاکے لکھے ہیں جو اوپندر ناتھ اشک اور عزیز احمد پر ہیں۔ مضامین کا حصہ اور بھی معلوماتی اور متاثر کرنے والا حصہ ہے جس میں پروفیسر شکیل الرحمن، مظہر امام، یوسف سرمست، راشد آزاد، خالد عرفان، ناصر بغدادی کے مضامین شامل ہیں تبصروں کا کالم ختم ہونے سے کچھ تشنگی محسوس ہوئی کہ اس سے کئی ادبی کتابوں کی اشاعت کے بارے میں نہ صرف معلومات ہوجاتی ہے بلکہ مصنفین کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی ہے ایک شاعر ادیب کو اردو میں اور ملتا بھی کیا ہے سوائے تبصروں کے، بہر حال بادبان کی اشاعت اور اتنا مواد جمع کرکے اسے سلیقے سے شائع کرنا ناصر بغدادی جیسے قابل افسانہ نگار کا ایک بہت بڑا کمال ہے۔

نام کتاب : ترانۂ بیداری

شاعر : جی.ایس. جین جوہر

مبصر : سیفی سرونجی

ترانۂ بیداری ایک ایسے شاعر کا شعری مجموعہ ہے جس نے اپنی ابتدائی شاعری ہی سے بڑے بڑے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا اور علامہ سیماب اکبرآبادی نے پیش گوئی کی تھی کہ تم بڑے ہوکر ہندوستان میں بہت شہرت حاصل کروگے لیکن کاروبار کا بار سنبھالتے ہی وہ شعر و ادب کی دنیا سے کنارہ کش ہوگئے تھے لیکن بقول کسی کے کہ اندر کا شاعر کبھی نہیں مرتا برسوں کی خاموشی کے بعد جی.ایس. جین صاحب اپنے بھرپور اعتماد کے ساتھ پھر ادبی دنیا میں آئے ہیں لیکن ان کی شاعری خاص طور پر نظمیں ایسی پائے کی ہیں کہ ایک سال کے اندر ہی اندر پوری ادبی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا یہی نہیں اپنے پہلے شعری انتخاب کو کتابی شکل میں پیش کرکے ایک ہنگامہ کردیا ہے اس لئے کہ آج کل نثری نظموں کا اتنا پھیلاؤ ہوگیا ہے کہ پابند شاعری دور دور تک نظر نہیں آتی ایسے میں ایک پابند نظم کے شاعر نے ترانۂ بیداری پیش کرکے ساری دنیا کو بیدار کردیا ہے بلاشبہ ایسی نظمیں اب نہ پڑھنے کو ملتی ہیں نہ دیکھنے کو جن میں اتنی روانی تازگی اور دلوں پہ اثر کرنے والی تاثیر ہے کہ جو پڑھتا ہے پڑھتا ہی رہ جاتا ہے۔

وفا کی دیوی

ستارے جھلملائے چاند کی کرنیں پڑیں پھیکی
گگن کے آنسوؤں سے رات کی ساری جٹا بھیگی
تڑپ اٹھا فضائے حسن میں احساس بیداری
ستاروں نے حضور شوق میں ہنس کر پلک ماری
ثریا نے تو آنکھیں موند لیں کیف تصور میں
مگر اک کہکشاں ڈوبی ہوئی سی ہے تفکر میں
وہ اک چادر سا جو چھایا ہوا تھا بزم امکاں پر
فسونِ نور وظلمت جو مسلط تھا شبستاں پر
وہ اب تحلیل ہوتا جارہا ہے صبح کی ضو سے
ابھی ہیں عارضِ گلشن پہ تاباں رات کے بو سے
سمندر کے کنارے ہے شبابِ نور کا پرتو
یہ ڈھلتی چھاؤں ہے تاروں کی یا اک حور کا پرتو
افق سے یوں اجالا سا ہویدا ہو رہا ہے کیوں
کہ جیسے کوثر و تسنیم کی موجیں مہکتی ہوں

جی.ایس.جین صاحب کی یہ صرف ایک نظم کے چند بند پیش کئے گئے ہیں جنہیں پڑھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے قلم میں کتنی روانی ہے زبان و بیان پر قدرت ہے کونسا لفظ کہاں کتنا فصیح ہے وہ خوب سمجھتے ہیں اس لئے لفظوں کے انتخاب میں اپنی پوری توجہ صرف کرتے ہیں اور شعروں میں ایک تازگی پیدا کردیتے ہیں ان کی نظموں کے موضوعات خواہ کچھ بھی ہوں وہ بالکل سیدھے سادے انداز میں اپنی بات کہنے کے ہنر سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ انداز بیان کی دلکشی سے اور بھی تاثیر پیدا کردیتے ہیں ان کے یہاں لفظوں کے ساتھ کھلواڑ نہیں ہے جو کہ آج جدیدیت کے نام پر کیا جاتا ہے بلکہ ان کا کلام استادانہ ہے جس میں پختگی نمایاں ہے یہی ان کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ بہت سلیقے سے دلوں میں اثر والی شاعری کے ذریعے انسانیت کا درس بھی دیتے ہیں اور قومی یکجہتی کے گیت بھی گاتے ہیں دراصل ان کی شاعری پیار محبت ایثار وفا خلوص کے جذبات سے لبریز ہے یہاں چند نظموں کے اقتباس پیش کرتا ہوں:-

مذہب

مذہب کے ترانے کیا چھیڑوں مذہب کے ترانے بیت گئے
اب ایٹم بم کے دن آئے مرکب کے زمانے بیت گئے
ہر چیز پہ جدت چھائی ہے ہر چیز ہے اپ ٹو ڈیٹ یہاں
لیڈر کی پجاری ہے دنیا مذہب کے زمانے بیت گئے
مذہب کے ترانے کیا چھیڑوں مذہب کے زمانے بیت گئے

اس نظم میں شاعر نے دنیا کے ظلم وستم سیاست کے اتار چڑھاؤ اور انسانیت محبت مذہب کو یاد کرتے ہوئے خون کے آنسو بہائے ہیں کہ کس طرح آج ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم کررہا ہے کہ خون انسان اتنا سستا ہوگیا ہے کہ اس کی کوئی قیمت ہی نہیں رہی۔ ترانہ بیداری میں اس طرح کی کئی نظمیں ہیں جن میں انسانیت کے جذبات کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فطرت کے پجاری، درس آدمیت الوداع اے وطن، برہ کا گیت، معذرت، پیام شوق، بہت خوبصورت نظمیں ہیں۔ جہاں ایک طرف ان کی بہترین نظمیں ہیں وہیں ان کی منتخب غزلیں بھی شامل ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ترانہ بیداری، ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں ہے جس سے ان کی شاعری دونوں حلقوں میں نہ صرف پڑھی جائے گی بلکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے گی۔ اس کتاب کا دیباچہ بی ایس جین جوہر صاحب کے دوست مشہور شاعر رفعت سروش نے لکھا ہے جس میں ان کی شاعری پر کھل کر گفتگو کی گئی ہے۔ ☆

نام کتاب : روح کے نغمے
مصنفہ : کملا داس ثریا
مترجم : علی اصغر
مبصر : سیفی سرونجی

کملا داس ثریا ہندوستان کی ایک ایسی شاعرہ ہیں جنہوں نے انگریزی اور ملیالم میں یعنی دونوں زبانوں میں اپنی منفرد شاعری سے ایک اعلیٰ مقام حاصل کرلیا ہے وہ ایک طرف تو ملیالم کی افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں تو دوسری طرف وہ انگریزی کی ایک ایسی شاعرہ کے روپ میں اپنے فن کے جوہر دکھا چکی ہیں کہ بڑے بڑے انگریزی کے شاعر اس مقام ومرتبہ کو نہیں پہنچ پائے ان کی خوبصورت اور معیاری شاعری کا ترجمہ اردو کے مشہور ادیب علی اصغر صاحب نے کیا ہے ترجمے کا فن ایک مشکل فن ہوتا ہے جس میں کوئی معمولی ترجمہ نگار مصنف کے اعلیٰ تخلیقی رویوں کی تہہ تک پہنچنے میں کہیں نہ کہیں مات کھا جاتا ہے لیکن علی اصغر کا کمال یہ ہے کہ علی اصغر نے کملا داس ثریا کی تخلیقی جہتوں

تک نہ صرف رسائی حاصل کی ہے بلکہ ان کی شاعری کی روح تک پہنچ کر معنی کا ایک خزانہ حاصل کر لیا ہے اور اردو کے قاری تک پہنچانے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کملاداس ثریا کی یہ شاعری ان کی روح میں رچی بسی شاعری ہے اس سے پہلے کہ کملا داس ثریا کی شاعری پر آگے گفتگو کی جائے کتاب کی پشت پر جو ان کا تعارف ہے وہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اردو قارئین ان کی شاعری اور ان کے مقام و مرتبہ کو سمجھ سکیں۔

''سرسوتی سمان اور ساہتیہ اکاڈمی کی انعام یافتہ ممتاز شاعرہ پدم بھوشن بالنی کی دختر ہیں۔ تعلیم گھر ہی پر ہوئی مادھوری کٹی کے نام سے ملیالم میں کتابیں لکھیں انگریزی میں شاعری کی، آسٹریلیا، جرمنی، امریکہ اور کینیڈا کی جامعات کا دورہ کیا اور وہاں شاعری پر لیکچر دیے، چلڈرنس فلم سوسائٹی کی صدر ہیں، جنگلات بورڈ کیرالا کے صدر نشیں کی ذمہ داری نبھائی، دسمبر 1999 میں اسلام قبول کیا، گزشتہ تین برسوں سے لوک سیوا ٹرسٹ کی صدر ہیں، یہ ادارہ پچھڑے ہوئے طبقات و افراد کے مفادات کی نگہداشت کرتا ہے، ان ہی کے بقول زندگی میں امن چین اور سکونِ قلب میسر ہے، آپ کے تین صاحبزادے ہیں، ہندوستان کی معروف ترین انگریزی شاعرہ ہونے کے علاوہ کملاداس ثریا ملیالم کی نامور افسانہ نگار، مضمون نگار اور شاعرہ ہیں۔ انہوں نے کئی بیرونی ممالک کے دورے کیے اور لندن کے ساؤتھ بینک سینٹر پوئٹری فیسٹول میں انہیں بطور خاص مدعو کیا گیا۔ ان کی نظموں کے تین مجموعے ہندوستان میں شائع ہوئے اور ان کی نظموں اور نثری نگارشات پر مبنی ایک کتاب آسٹریلیا سے چھپی ہے، یوروپ میں ان کی نظموں کے فرانسیسی، جرمن، سویڈش اور سربوکراوٹ ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ کملاداس ثریا کا نام مارگریٹ یوانتا ڈورس لینگ اور نارین گارڈیمر کے ناموں کے ساتھ 1984 میں شامل تھا۔ 1985 میں انہیں ایشین ورلڈ پرائز فار لٹریچر عطا کیا گیا اور اس سال انہیں ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ بھی دیا گیا۔''

ایسی مقبول اور معتبر شاعرہ کی شاعری کا ترجمہ مشہور ادیب علی اصغر نے بہت خوبصورت اور اس احتیاط اور اہتمام سے کیا ہے ان کی پوری شاعری کی روح میں جھانک کر اصل شاعری کی روح کو سمو دیا ہے یہ کام صرف وہی کر سکتا ہے جو علمی قابلیت کے علاوہ شاعری کے وصف اور تمام تر خوبیوں

سے واقف ہو یا شبہ علی اصغر صاحب نے کملا داس ثریا کی اصل شاعری سے آشنا کرایا ہے ملاحظہ فرمائیں چند نظموں کے اقتباس:

بگلے

میرے شوہر کہتے ہیں
سکون بخش دواؤں کے زیر اثر
میں اور زیادہ قابل محبت ہو جاتی ہوں
میری بات چیت ..... میں لپٹا ہوا ایک خطۂ زمین بن جاتی ہے
الفاظ ابھر آتے ہیں نیند کی چاشنی سے
وہ طلوع ہوتے ہی خوابوں کی چپ چاپ کھاڑیوں سے
نجات سے عاری اڑان میں بگلوں کی طرح
اور میرے چند کی ثریا جیسے اعضاء بہتر طور پر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں
ان کی ناپائیدار سے
اگر وہ گا سکتے لوریاں
اپنی بیوی کے خوابیدہ روح کے لئے
تو ضرور گاتے
اس کی بے ہوشی کو ختم کر دینے والی میٹھی لوریاں
میرے شوہر کہتے ہیں
سکون بخش دواؤں کے زیر اثر
میں زیادہ قابل محبت ہو جاتی ہوں۔

☆

اس طرح کی کئی خوبصورت نظمیں ہیں جن میں ایک عورت کے جذبات کی بہترین عکاسی کی گئی ہے جن میں فکر بھی ہے انفرادیت بھی ہے اور ان کا اپنا منفرد لہجہ بھی ہے اور ترجمہ نگار کا کمال ہے کہ ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم کسی اور زبان کی شاعری پڑھ رہے ہیں۔

اس کتاب کا پیش لفظ پدم بھوشن پروفیسر ... نے تحریر کیا ہے، پروفیسر مغنی تبسم نے تعارف، کچھ کملا داس ثریا کے ترجم کے بارے میں پروفیسر تقی علی مرزا نے اظہار خیال کیا ہے۔ عرضِ مترجم کے عنوان سے علی اصغر صاحب نے بتایا ہے کہ کملا داس ثریا کی شاعری ... جسم سے روح کی

طرف ہے اور یہی بات اس مترجم نے دوران ترجمہ شدت سے محسوس کی ہے۔ باشبہ علی اصغر صاحب نے ترجمہ کے دوران خود بھی جسم سے روح تک کا سفر طے کرلیا ہے۔ اس کتاب کو مکتبہ شعر و حکمت نے خوبصورت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ علی اصغر صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے لاکھوں اردو والوں کو کملا داس ثریا کی بہترین شاعری سے روشناس کرایا۔☆

نام کتاب : اعتبار۔ رہبر جونپوری کی شخصیت اور شاعری

مرتبہ : ڈاکٹر رضیہ حامد

مبصر : سیفی سرونجی

رہبر جونپوری ایک مشہور نظم نگار کی حیثیت سے دنیا کے ادب میں نہ صرف ایک جانا پہچانا نام ہے بلکہ انہوں نے اردو پابند نظم میں اپنی ایک منفرد پہچان قائم کی ہے اعتبار ان کی شخصیت اور شاعری پر لکھے گئے مضامین کا ایک ایسا انتخاب ہے جس میں ہندوستان کے تمام معتبر قلم کاروں نے ان کی شخصیت اور شاعری کا بھرپور جائزہ لیا ہے جسے بہت سلیقے سے معتبر ادیبہ ڈاکٹر رضیہ حامد نے اپنے ادارے سے نہ صرف شائع کیا ہے بلکہ مرتب بھی وہی ہیں۔ اس کتاب میں جو کہ 196 صفحات پر مشتمل ہے جس میں 16 بہترین تصویریں بھی شامل ہیں رہبر جونپوری اس لحاظ سے بھی خوش نصیب شاعر ہیں کہ ان پر تمام بڑے اہم قلمکاروں نے بہترین مضامین لکھے ہیں مثلاً مرزا متین سروش، عنوان چشتی، رفعت سروش، ڈاکٹر بشیر بدر، مظفر حنفی، خلیل الرحمٰن، ملک زادہ منظور احمد، گلزار دہلوی، بیکل اتساہی، کوثر صدیقی، ڈاکٹر عزیز اندوری، ڈاکٹر اخلاق اثر کے علاوہ ۳۷ قلم کاروں نے مضامین تحریر کئے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ رہبر جونپوری ایک ہر دل عزیز شاعر ہیں۔ ڈاکٹر بشیر بدر لکھتے ہیں:

> ''رہبر جونپوری صاحب دل اور صاحب نظر شاعر ہیں وہ عشق خدا اور محبت رسول میں اس طرح رچے بسے ہیں کہ خدا اور رسول کی یاد میں جس لفظ کو چھو دیتے ہیں وہ لفظ مہکنے لگتا ہے رہبر جونپوری کی نظموں پر اقبال اور جوش کی دعاؤں کا سایہ ہے رہبر جونپوری کو اپنے وطن ہندوستان سے جو نسبت اور محبت ہے اس کا زندہ ثبوت ان کی نظمیں کشور ہند اور میرا دیش ہیں۔''

سچ بات تو یہ ہے کہ رہبر جونپوری نے اقبال اور جوش کی روایت کو آگے بڑھانے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے ہندوستان میں جو چند پابند نظم کے شعراء ہیں ان میں ایک نمایاں نام رہبر جونپوری کا ہے۔ اس تیور کی نظمیں کہنے والے شاعر ہندوستان میں دور دور تک دکھائی نہیں دیتے اس بات کا

اظہار ''اعتبار'' میں بہت سے قلم کاروں نے کیا ہے۔ ڈھیر سارے مضامین اس بات کا ثبوت ہیں کہ رہبر جونپوری کی شاعری میں خاص طور پر ان کی نظم نگاری میں ایک جان، ہے انفرادیت ہے تہہ داری ہے اس کتاب کی مبارکباد کی مستحق ڈاکٹر رضیہ حامد بھی ہیں جنہوں نے اپنے پبلی کیشنز سے نہ صرف اہتمام سے مرتب کر کے شائع کی ہے بلکہ اتنے اہم قلمکاروں کے مضامین حاصل کرنے میں بھی ان کا ہاتھ رہا ہے یہ رہبر جونپوری کی چالیس سالہ شاعرانہ ادبی خدمات کا ایک سچا اعتراف ہے۔ ☆

نام کتاب : کتنی حقیقت کتنا خواب

شاعر : سید شکیل دسنوی

ناشر : ایڈشاٹ پبلی کیشنز، ممبئی

قیمت : 150 روپے، صفحات 176

سید شکیل دسنوی اردو غزل کا ایک ایسا نام ہے جس نے چاروں طرف سے غزل پر حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ صرف اپنی غزل سے کیا ہے یعنی جب غزل کے نام پر لوگ غیر مانوس اور اوٹ پٹانگ لفظوں کے استعمال سے غزل کا حلیہ بگاڑ رہے تھے اور جدیدیت کے نام پر مہمل شاعری کے دفتر تیار کر رہے تھے تب بھی سید شکیل دسنوی اپنی بہترین غنائیت سے بھرپور اعتماد کے ساتھ کہہ رہے تھے۔ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ نہ وہ جدیدیت کے قافلے میں شریک نہ مابعد جدیدیت سے انہیں کچھ تعلق وہ صرف ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے اپنی پہچان بنانے میں کوشاں تھے اور یہی اچھی شاعری جو روح کو تازگی عطا کرنے والی تھی سید شکیل دسنوی کی مقبولیت میں دن بدن اضافہ کرتی جارہی تھی اور آج سید شکیل دسنوی کا نام معتبر غزل گویوں کی فہرست میں نمایاں بن کر نام چمک رہا ہے کتنی حقیقت کتنا خواب ان کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ سرکاری ملازمت کی مصروفیات کی وجہ سے دس پندرہ سال کے گیپ نے انہیں بہت نقصان پہنچایا۔ ویسے ایک اچھے شاعر کے لئے دوبارہ سے اپنے آپ کو اسٹیبلش کرنا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ یقیناً ان کا یہ شعری مجموعہ اس کی تلافی کردیگا۔ اس لئے کہ ایسے خوبصورت شعر کہنے والے سے امیدیں وابستہ کرنا غلط نہیں ہوگا۔

ٹوٹے پھوٹے ارمانوں میں رہتے ہیں
ہم تو دل کے ویرانوں میں رہتے ہیں
جب سے حال کی تاریکی نے گھیرا ہے
مستقبل کے امکانوں میں رہتے ہیں

☆

اسے خبر نہ ہو اک قیس مجھ میں جیتا ہے
اس احتیاط سے رسم وفا نبھاؤں میں

☆

آج بھی جانے کیوں لگتا ہے اتنا ہی انجان سا کچھ
جس نے سارے دکھ سکھ بانٹے ساتھ رہا ہے میرے اندر

☆

وہ زخم جسے تو نے بڑے پیار سے بخشا
وہ زخم تو سینے سے لگانے کے لئے ہے

☆

شعر کہنے میں سیّد یوں اکثر لگا
جیسے لفظوں میں خود کو بولتا تھا وہی

☆

ہر ایک باب میں آتا ہے تذکرہ اس کا
فسانہ اپنا کہاں سے اسے سناؤں میں

☆

ان اشعار کو پڑھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سید شکیل دسنوی کے یہاں کتنی تازگی، کتنی روانی ہے اور کتنی حقیقت کتنے خواب ہیں جو ان کی شاعری میں نہاں ہیں۔ 176 صفحات کی اس کتاب میں ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے پیش لفظ لکھا ہے اور ایک اہم مضمون ان کی شاعری سے متعلق شمیم طارق کا لکھا ہوا ہے۔ شمیم طارق لکھتے ہیں:

"حقیقت تو یہ ہے کہ اس شعری مجموعے میں ان کی وہ خواب آگیں کیفیات سمٹ آئی ہیں جو پڑھنے والوں کو بھی مسرت آمیز لمحات سے دو چار کرتی ہیں تو کبھی کیفیت و انبساط کی وادی سے نکال کر اشکوں کی رہگزر تک لے جاتی ہیں، سید شکیل دسنوی کی اس کتاب کا ادبی دنیا میں یقیناً بھرپور استقبال کیا جائے گا اطہر عزیز صاحب نے ہمیشہ کی طرح اسے اپنے ایڈشاٹ پبلی کیشنز سے بہت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔

☆

نام کتاب : **کربلا ایک یادگار انقلاب**

مصنف : سید عادل اختر

ناشر : ایمن پبلیکشنز، بادشاہ بلڈنگ، A-2، گراؤنڈ فلور،

کوہِ فضا، بھوپال (M.P.)

کربلا ایک یادگار انقلاب سید عادل اختر صاحب کی ایک ایسی کتاب ہے کہ اس موضوع پر لکھنے کے لئے ہمت بھی چاہئے دل بھی چاہئے اور علمی معلومات کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ کا گہرا مطالعہ بھی چاہئے اور یہ تمام خصوصیات سید عادل اختر صاحب میں بدرجہ اتم موجود ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بہت مستند تاریخی حوالوں سے ایک ایسے حساس نازک موضوع پر بہت ذمہ داری کے ساتھ نہ صرف روشنی ڈالی ہے بلکہ امام حسین کی شہادت سے متعلق پورا سیاسی تاریخی پس منظر بھی پیش کیا ہے کہ کس طرح امام حسینؑ کو کوفہ بلایا گیا اور کس طرح ان کے اپنے چاہنے والوں نے انہیں اور ان کے خاندان کو کس طرح اپنے ظلم کا شکار بنایا۔ واقعات کربلا کے ایک ایک منظر کو پیش کرنے میں انہوں نے احتیاط سے کام لیا ہے اور کڑی سے کڑی ملا کر تفصیل سے وہ تاریخی واقعات پیش کئے ہیں جو کہ امام حسین کے خلاف ماحول بنانے اور پھر انہیں پر الزام لگانے یہاں تک کہ انہیں شہید کرنے کے لئے یزید کے ان تمام افسران کے راز بھی فاش کر دیئے ہیں جنہیں تاریخ میں ہم بہت احترام سے دیکھتے آتے ہیں۔ خاص طور پر حضرت امیر معاویہ کے بارے میں کہ کس طرح انہوں نے اپنے چہیتے اور نافرمان بیٹے کی محبت میں جمہوریت کو بادشاہت ہی تبدیل کر کے ہر جائز کو ناجائز قرار دیتے رہے اور اس کے ولی عہد بنانے میں کیا رول ادا کیا ایک اچھی خاصی اسلامی جمہوریت کو بادشاہت میں تبدیل کر کے ایک ایسی بنیاد ڈالی جس کا تاریخ میں اسلام کے نام پر ایک بدنما داغ بن گیا ان تمام باتوں کو سید عادل اختر نے پیش کیا ہے اس لئے اس کتاب کی اہمیت اور زیادہ ہو جاتی ہے کہ ایسے مستند حوالوں سے اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے بلاشبہ سید عادل اختر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس تاریخی اور نازک موضوع پر بہت احتیاط اور تاریخی حوالوں سے کتاب کو بہت اہم بنا دیا ہے۔ اس کتاب کو فاس کمپیوٹر کے مالک ادریس مونس صاحب نے بہت خوبصورت اچھے گیٹ اپ کے ساتھ سلیقے سے چھاپا ہے۔☆

نام کتاب : رقص شرر

مصنف : ملک زادہ منظور احمد

مبصر : سیفی سرونجی

رقص شرر مشہور شاعر ادیب ملک زادہ منظور احمد کی ایک ایسی خوش نوشت ہے جس میں ان کی زندگی کے واقعات میں نہیں بلکہ آزادی سے پہلے اور بعد کے وہ تمام حالات بھی ہیں جو ہندوستان جیسے عظیم ملک کی تقسیم کا باعث بنے، یعنی یہ ایک خودنوشت ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی سیاسی سماجی پس منظر کی ایک تاریخ بھی ہے جسے ملک زادہ منظور احمد نے بہت ہی دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس لئے کہ سیاست سے بھی ان کا تعلق رہا ہے، ادب سے بھی جڑے ہوئے رہے اور دینی اور اسلامی تہذیب کے اعلیٰ خاندان میں ان کی تربیت ہوئی۔ یہ خودنوشت پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پورا سیاسی سماجی اور ادبی پس منظر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، کہیں اس میں پنڈت جواہر لال نہرو کی شخصیت کے کئی پہلو دکھائی دیتے ہیں تو کبھی جگر مرادآبادی کا ترنم، شاعروں چشمکیں، ادبی مناظر، سیاسی گروپ بندیاں، سب کچھ دکھائی دیتا ہے۔ یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ آپ بیتی لکھنے کا حق صرف اسے زیادہ ہوتا ہے جس کی زندگی میں بے شمار اتار چڑھاؤ ہوں، جس نے دنیا بھر کے سفر کئے ہوں، جو شہر شہر گاؤں گاؤں گھوما ہو کہ وہ جب اپنے تجربات بیان کرے تو نہ صرف قاری کی دلچسپی برقرار رہے بلکہ اسے دنیا بھر کی معلومات بھی حاصل ہوتی رہے۔ بلاشبہ ملک زادہ منظور ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جنہوں بچپن ہی سے عجیب عجیب تجربے کئے بلکہ ہوش سنبھالتے ہی اسٹیج پر آگئے اور اپنی تقریروں تحریروں سے ایک نئے انقلاب کی تاریخ لکھتے رہے۔ ان کی پہلی تقریر پنڈت جواہر لال نہرو کی شرکت والے اسٹیج سے ہوئی ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے تعلقات کیسے کیسے لوگوں سے تھے جو بڑی سے بڑی شخصیت کو اپنی جادوئی تقریر سے اپنا گرویدہ بنانے کے ہنر سے نہ صرف واقف تھے بلکہ دلوں پر اثر کرتے تھے۔ آگے چل کر یہی پریکٹس انہیں مشاعروں کے سب سے بڑے ناظم کی حیثیت سے کھینچ لائی۔ ایک ایسی شخصیت کی آپ بیتی پڑھنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے جو عام قاری؛ شاعروں ادیبوں کے لئے بھی معلومات کا ایک خزانہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ 65 صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب ملک زادہ منظور احمد کی ہی آپ بیتی نہیں بلکہ شعر و ادب کی شخصیات کی آپ بیتی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی ادبی تہذیبی داستان بھی ہے۔ ☆☆

نام کتاب : سنگم

شاعرہ : رشیدہ عیاں

قیمت : 250 روپے

مبصر : سیفی سرونجی

رشیدہ عیاں امریکہ میں مقیم مشہور شاعرہ ادیبہ کی حیثیت سے اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہیں

اب تک ان کی آدھا درجن کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں کئی ایوارڈ انہیں مل چکے ہیں سنگم ان کا تازہ شعری مجموعہ ہے جو ہندی اور اردو میں دہلی سے شائع ہوا ہے۔ یہ مجموعہ ان کے گیتوں پر مشتمل ہے گیت ہندوستانی تہذیب کا سب سے اہم اور طاقتور عکاس اور آئینہ دار ہے جو یہاں کی تہذیب سے اس طرح جڑا ہوا ہے کہ بغیر گیت کے ہندی شاعری کی روح کو سمویا ہی نہیں جا سکتا رشیدہ عیاں چونکہ ہندوستان میں پیدا ہوئیں ان کی روح میں ہندوستانی تہذیب یہاں کے گاؤں کی کھیتوں کی مٹی کی خوشبو ان کے ذہن میں بسی ہوئی اپنی تمام زندگی امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں گزارنے کے بعد بھی انہیں اپنے وطن کی یادیں بے چین کرتی رہتی ہیں انہیں یہاں کے بچپن میں بتائے وہ لمحے یاد آتے ہیں جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ گاؤں کے پنگھٹ پر گاؤں کے باغوں میں، کھیتوں میں گھومتی پھرتی تھیں، یہی یادیں ہیں، تڑپ اور بے چینی ان کے گیتوں میں نمایاں ہے۔ یہاں کچھ گیتوں کے اقتباس پیش کرتا ہوں جن میں ان کے ذہن اور دلی کیفیات کی عکاسی نظر آئے گی۔

من میت

چل درپگ میرے ساتھ سکھی
سن میرے من کی بات سکھی
من بھارت ہے من میت سکھی
میرے پہلے پیار کا گیت سکھی
تو کیسے جانے جان سکھی
ہے پیا یہ مجھ کو مان سکھی
آکاش کا پونم چاند سکھی
ہے پیار کے آگے ماند سکھی
جیسے برکھا کی پھوار سکھی
وہ سوندھا جیسے پیار سکھی
وہ کھیتوں کی ہریالی سا
لہکے گیہوں کی بالی سا
جب جب میرا تن میں ترسا
وہ پیار کی برکھا بن برسا

پراتھنا

بکل منوا تڑپے تو آنند کی بھکتی دیدے ربا اللہ سائیں
جگ والے......سارے
من پر چل گئے دکھ کے آرے
......ہوگئے اپنے پیارے
سوکھے پیار کے شیتل دھارے
خون خرابہ نگر نگر ہے پیار کی شکشا دیدے ربا اللہ سائیں
ہم سب پنچھی ایک ڈال کے
ہنس تھے ہم سب ایک تال کے
خوش تھے پیار کا دیپک ہال کے
......میں نفرت کے جال کے
پیار کی جیوتی دیدے پر بھو دیش کی ......دیدے

☆

رشیدہ عیاں کے ان دو گیتوں کے اقتباس دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ گیت کے فن میں کتنی مہارت رکھتی ہیں گیت کے لئے جس نرم لہجے نرم نازک الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے وہ رشیدہ عیاں کے گیتوں میں اس خوبصورتی کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں کہ گیتوں میں ایک زبردست غنائیت اور تازگی پیدا ہوگئی ہے مثلاً برکھا، سکھی، شکشا، بھکشا، پربھو، چاند، بکل، شیتل، دھارے، پنچھی، ہریالی، پھوار، آکاش، وغیرہ سینکڑوں ایسے خوبصورت ہندی کے الفاظ ہیں جو صرف گیتوں میں ہی اپنی پوری جگمگاہٹ اور آب و تاب کے ساتھ کھلتے ہیں۔ کیا کوئی اس بات پر یقین کر سکتا ہے کہ امریکہ میں اپنی زندگی گزارنے والا کوئی شاعر ایسے خوبصورت گیت تخلیق کر سکتا ہے؟ گیت دراصل وطن سے محبت کے ایک ایسے اٹوٹ رشتے سے تعلق رکھتا ہے کہ بغیر گیت من کوئی جان ہی پیدا نہیں ہوتی اور یہ تمام خوبیاں اور تمام خصوصیات رشیدہ عیاں کے گیتوں میں نمایاں ہیں۔ سنگم کی ایک خوبی اور یہ بھی ہے کہ یہ کتاب ہندی اردو کے ساتھ ساتھ رومن میں بھی ہے جس سے ہندی اردو اور انگریزی پڑھنے والے تمام لوگ بآسانی نہ صرف پڑھ سکتے ہیں بلکہ اپنے ذہن و دل کے گوشوں کو منور کر سکتے ہیں۔ ☆

نام کتاب : سلاٹر ہاؤس
افسانہ نگار : لیٰسین احمد

صفحات : ۱۶۸
قیمت : ۱۵۰ روپے
ناشر : استعارہ پبلی کیشنز ۵۳-اے، ذاکر باغ، اوکھلا، نئی دہلی
مبصر : محمد متین ندوی

میں جس سلاٹر ہاؤس کے متعلق اظہار خیال کا ارادہ رکھتا ہوں وہ جانوروں کا نہیں بلکہ انسانوں کا سلاٹر ہاؤس ہے آج ہمارے پیارے ملک ہندوستان میں انسانی سلاٹر ہاؤسوں کی کمی نہیں بلکہ افراط ہے تبھی تو یسین احمد نے اپنے افسانوی مجموعہ کا نام سلاٹر ہاؤس رکھا ہے۔ کتاب میں ایک افسانہ "سلاٹر ہاؤس" کے عنوان سے موجود ہے جس میں افسانہ نگار نے ایک بہت ہی حساس اور اہم ادارے کو سلاٹر ہاؤس کا نام دیا ہے اس میں انہوں نے کوئی غلطی نہیں کی اور نہ ہی ان سے کوئی چوک ہوئی ہے بلکہ انہوں نے بہت ہی حقیقت پسندی اور بے باکی کا ثبوت دیا ہے اس کو افسانہ نگار کی روشن ضمیری اور حساسیت ہی کہا جائے گا مذکورہ افسانہ میں ایک ایسے غریب شخص کا ذکر ہے جس نے بڑی جدوجہد کر کے افلاس و نادار ی کے باوجود اپنے لڑکے کو میڈیکل کالج کی تعلیم دلوانے کا خواب دیکھا لڑکے نے بھی اپنے باپ کے خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لئے پوری کوشش کی لیکن جب کالج میں داخلے کی باری آئی تو راشد حسین اور اس کے بیٹے ریاض کے حواس باختہ ہو گئے کیونکہ ڈونیشن کے نام پر لاکھوں روپے میڈیکل کالجوں میں لئے جارہے تھے اب میں مزید درمیان میں حائل نہ ہوتے ہوئے مذکورہ افسانہ سے چند اقتباسات پیش کرنا چاہوں گا تاکہ آپ خود افسانہ کا لطف لے سکیں اور یہ دیکھ سکیں یہ "سلاٹر ہاؤس" انسانوں کو خوشحالی اور سکون دیں گے یا بدامنی اور جرائم کو فروغ؟ ڈاکٹر کا پیشہ خدمت خلق کا ایک وسیلہ تھا لیکن آج انسانوں کا خون چوس کر ذخیرہ اندوزی اور اظہار شان و شوکت کا ذریعہ بنا ہوا ہے ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص ڈونیشن کے نام پر لاکھوں روپے دیکر ڈاکٹری سیکھے گا تو ڈاکٹر بنتے ہی جائز و ناجائز طریقہ سے جلد از جلد نوٹوں کی گڈیوں پر سونا چاہے گا یہ صرف کالجوں کا حال نہیں ہے بلکہ ہر جگہ اور تقریباً ہر ملک میں ایسے ہی حالات آپ کو نظر آئیں گے مذکورہ افسانہ سے چند اقتباسات پیش ہیں۔

ایک خاتون جو اپنی بیٹی کو میڈیکل کالج میں داخلہ دلانے کے لئے آئی ہوئی ہیں وہ راشد حسین سے یوں مخاطب ہوتی ہیں:

"بھائی صاحب! میری بیٹی کا رینک بہت کم ہے، پتہ نہیں کالج والے کتنے ڈونیشن کا مطالبہ کریں گے۔ مجھ سے تو صرف چھ لاکھ روپے کا انتظام ہو سکا

ہے۔ فرطِ حیرت سے راشد حسین کا منہ کھل گیا۔ عائشہ خانم چھ لاکھ روپے کو معمولی رقم سمجھ رہی تھی جب وہ مقررہ فیس سے ایک روپیہ بھی اضافہ کر دینے کے موقف میں نہیں تھے ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ عائشہ کو کیا جواب دیں"۔

راشد حسین کے قریب ہی واگھرے نامی ایک بزنس مین بیٹھا ہوا تھا جب مذکورہ خاتون عائشہ خانم کا نمبر آیا تو وہ اپنی لڑکی اور اپنا بھاری بھرکم بیگ سنبھالے ہوئے اندر گئیں ان کے جاتے ہی واگھرے نے راشد حسین سے پوچھا:

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اسی نشست میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے؟

راشد حسین نے آہستگی سے جواب دیا" وہ چھ لاکھ تک دینے کو تیار ہیں"

"ان کا آفر لیکر خوبصورتی سے ٹرخا دیا جائیگا اور پھر کسی اور سے بات ہوگی۔ لمحہ آخر تک اسی طرح سودے بازی چلتی رہے گی فیصلہ اسی کے حق میں ہوگا جو زیادہ سے زیادہ ڈونیشن دینے کے لئے تیار ہو۔ اگر آپ NRI ہیں اور اگر ریال ڈالر اور یورو کماتے ہیں تو داخلہ منٹوں میں مل جائے گا"۔

راشد حسین کی جب باری آئی تو وہ بھی اپنے لڑکے کے ساتھ اندر گئے ان سے مختلف سوالات کر کے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی گئی کہ وہ کتنی رقم دے سکتے ہیں جب سکریٹری کو معلوم ہوا کہ راشد حسین انڈوں کا کاروبار کرتے ہیں تو سکریٹری نے ریاض کی فائل اٹھا کر چیئرمین کی طرف بڑھا دی چیئرمین صاحب کو غصہ آیا انہوں نے اپنے غصہ کا اظہار یوں کیا:

"اتنی دیر سے ہمارا وقت برباد کرنے کی کیا ضرورت تھی ڈاکٹر بننا اتنا آسان نہیں ہے انڈے بیچنے والے کیلئے یا سبزی بیچنے والوں کے بس کی بات نہیں وہ کہتے کہتے ایک پل کے لئے رکا، جائیے فیس کی رقم دکان میں لگائے اپنے باپ کا ہاتھ بٹائیے اور انڈوں کا کاروبار پھیلا ئیے۔

اس نے ریاض کی فائل نیچے پھینک دی"

راشد حسین کو بڑا غصہ آیا لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا اس نے اپنے لڑکے ریاض کا ہاتھ پکڑا اور غصہ سے بے قابو ہوتے ہوئے باہر نکل گیا جب وہ باہر نکلا تو واگھرے باہر ہی بیٹھا ہوا تھا اس نے راشد حسین سے پوچھا" کچھ بات بنی؟"

راشد حسین نے جواب دیا۔ آپ جانتے ہیں سلاٹر ہاؤس میں وہی جانور ذبح کئے جاتے ہیں جو تندرست اور توانا ہوتے ہیں ہم تو کمزور اور ناتواں ہیں"۔

لیسین احمد کا یہ افسانہ زبان و بیان اور کہانی پن کے اعتبار سے موجودہ دور کے اچھے افسانوں کے انتخاب میں شامل کئے جانے کے قابل ہے لیکن اگر نہ بھی شامل ہو تو کوئی تعجب کی بات

نہیں کیونکہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہمارے معاشرے میں ہر مستحق کو اس کا حق مل ہی جائے۔

یٰسین احمد کا نام موجودہ دور کے افسانہ نگاروں میں بڑی اہمیت کا حامل ہے ہندوستانی کے اچھے اور معیاری رسائل میں تو ان کے افسانے چھپتے ہی ہیں پاکستان میں بھی ان کے افسانے چھپتے رہتے ہیں ان کا نام پوری اردو دنیا میں جانا جاتا ہے انہیں افسانہ نویسی کا فن آتا ہے زبان پر قدرت ہونے کے ساتھ ساتھ انداز بیان میں بھی دلکشی پائی جاتی ہے ان کے افسانوں میں روایت کا احترام اور جدید تقاضوں کی تکمیل، ہندوستان کے حالات یہاں کے ماحول و معاشرہ میں پھیلی ہوئی برائیوں کی منظر کشی بڑے اچھے انداز میں موجود ہے ان کے افسانوں کے سلسلہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے حقائق کو افسانوں کے نام سے پیش کیا ہے۔

''سلاٹر ہاؤس'' میں چھبیس افسانے ہیں جو مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں ان کے موضوعات ہماری اسی دنیا سے ماخوذ ہیں جس میں ہم آپ زندگی بسر کر رہے ہیں چند افسانوں کے عناوین یہ ہیں: انسانوں کا جنگل، انارکلی کی موت، ضمیر کا بوجھ، ریکھائیں پڑھنے والا، طوطے کا خال، سوئی اور دھاگہ، اس گلی کی کہانی، ماسٹر جی، جادوگر کی جادوگری وغیرہ۔

یٰسین احمد کے افسانوں میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے عریانیت کے ذریعہ افسانوں کو دلکش بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ صرف اشارے کنایے سے کام لیا ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھ کر ہندوستان سے دور بیٹھا ہوا شخص بھی یہاں کے حالات سے کافی حد تک واقف ہوسکتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ ''سلاٹر ہاؤس'' ادبی حلقوں میں پسند کیا جائیگا۔☆

نام کتاب : دیکھا کہیں کبیر

شاعر : بھگوان داس اعجاز

صفحات : ۱۴۴

قیمت : ۱۰۰

تقسیم کار : انجمن ترقی اردو ہند دہلی

مبصر : محمد متین ندوی

بھگوان داس اعجاز کے دوہوں پر جب ہم ایک نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دوہوں کے موضوعات متعین نہیں ہیں کیونکہ وہ ہر چیز کو جسے وہ دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں بڑی چابکدستی سے دوہے کے پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر کے اہم دوہا نگاروں میں اعجاز صاحب کا نام اپنی اہمیت رکھتا ہے ان میں خاص بات یہ ہے کہ وہ دوہا سوچتے ہیں دوہا کہتے

ہیں اور ڈوب کر کہتے ہیں اعجاز صاحب دوہے کے تعلق سے کہتے ہیں

دوہے کی دو پنکتیاں ایسی کہہ اعجاز
پرت پرت کھلتی چلے، بات بجاتی ساز

نئے دور نے انسان کو اتنا خود پرست اور مطلب پرست بنا کر رکھ دیا ہے کہ آج مادہ پرست انسان ہر چیز کو سود و زیاں ہی کے پیمانے میں تولتا ہے بس اس کے پاس ہر چیز کو ناپنے کا ایک ہی آلہ ہے یہی وجہ ہے ہے کہ قریبی رشتہ دار بھی پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں اگر کوئی غربت سے دوچار ہے اور اگر اس کے گھر میں امیری کا شجر لگ جائے تو لوگ کہیں نہ کہیں سے اس سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر ایک سے کہتے پھرتے ہیں کہ فلاں میرا بھائی ہے، چچا ہے، بھانجا ہے، یا کچھ بھی کہہ دیتے ہیں خیر دوہے دیکھیے

بچہ مرے غریب کا کوئی نہ کرتا ہائے
کتا مرے امیر کا سب جگ دوڑا جائے

☆

دفتر تھانہ کورٹ ہو یا کوئی فٹ پاتھ
تم دیکھو گے ہر جگہ بھیک مانگتے ہاتھ

☆

دو گواہ کافی رہے بدل گئی تصویر
کرشن محمد بن گئے غالب بنا کبیر

☆

بنیا بیٹھا تولنے گنے سات کو چار
مال فالتو لے گیا چھلیا ڈنڈی مار

☆

میں نے تو بطور نمونہ کے چند دوہے پیش کئے ہیں ورنہ تو جب آپ اعجاز صاحب کے دوہوں کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو موضوعات میں بہت وسعت نظر آئے گی فی الحال میرے سامنے ان کا شعری مجموعہ ''دیکھا کہیں کبیر'' ہے اس میں دوہے ہی دوہے ہیں جو بہت اچھے اور دلکش ہیں اس سے پہلے بھی ان کے کئی مجموعے شائع ہو کر مشاہیر سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر محبوب راہی

''اردو نثر ایک مطالعہ'' کا تجزیاتی مطالعہ

قاضی مشتاق احمد اردو ادب کے ایک باکمال اور بے مثال قلم کار ہیں۔ موصوف کی باکمالی اور بے مثالی کا جواز محض ان کا کثیر التصانیف ہونا ہرگز نہیں ان کی کثیر التعداد تصانیف اور مختلف الاصناف نگارشات کی رنگارنگی، گوناگونی اور بوقلمونی ہے جو ایک باکمال اور بے مثال قلم کار کی حیثیت سے ان کی شناخت مستحکم کرنے کا وسیلہ ہے۔ قاضی مشتاق احمد بنیادی طور پر فکشن کے آدمی ہیں۔ ادب اطفال سے انہوں نے اپنے تخلیقی سفر کی شروعات کی اس کے بعد فلمی صحافت میں رہتے ہوئے فلمی نگار خاتوں کی رنگینیوں سے اپنے تخیل کو خوش رنگ کیا اور افسانہ نگاری کی خوابناک طلسماتی وادیوں اور حقائق کے سنگلاخ جزیروں میں اپنے تخیل کو مہمیز کرتے ہوئے اپنی شہرت و ناموری کے خزانوں کو بیش بہا تخلیقی لعل و گہر سے مالا مال کرتے رہے جس کا مثبت نتیجہ طفلی ادب کے پانچ مجموعوں، اردو افسانے کے پانچ اور ہندی کے دو مجموعوں، انسانچہ اور رپورتاژ ایک ایک کتاب، سات سماجی اور آٹھ مہماتی ناول، ڈرامہ، سفر نامہ اور کیریئر گائیڈنس پر دو دو اس طرح مختلف الموضوعات کم و بیش تین درجن قابل قدر تصانیف کی شکل میں ظاہر ہوا جو قاضی مشتاق احمد کو اردو کے چند مشاہیر تخلیق کاروں میں شمار کئے جانے کا جواز ثابت ہوا۔ قاضی مشتاق احمد مہاراشٹر کے اعلیٰ و ارفع ترین سرکاری عہدوں پر فائز رہتے ہوئے ہندوستان بھر کی خاک چھاننے کے علاوہ سرکاری یا نجی دوروں کے تحت برطانیہ، سوئزرلینڈ، جرمنی، فرانس، ہالینڈ، بروسلز، روم، سعودی عرب، تھائی لینڈ اور سنگاپور وغیرہ کی سیاحت کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں طول طویل تخلیقی سفر نیز وسیع، عمیق، بسیط اور کثیر مطالعہ۔ ان تمام رنگا رنگ تجربات نے ان کے ذہن و فکر کو وسعت و کشادگی کے ساتھ پرواز تخیل کو کچھ ایسی توانائی عطا کی کہ وہ عمر کی اس منزل میں جب بالعموم تخلیقی سوتے یا تو خشک ہو جایا کرتے ہیں یا ان کی روانی میں قدرے ٹھہراؤ آ جایا کرتا ہے وہ نوع بنوع تجربات کی خاطر ان دیکھی دنیاؤں کی جستجو میں نئی نئی سمتوں کی جانب اڑانیں بھر رہے ہیں لہٰذا اپنی عام تخلیقی روش سے ہٹ کر پچھلے چند برسوں میں اردو شاعری پر تحقیقی و تنقیدی نوعیت کی ان کی دو قابل قدر کتابیں ''اردو شاعری میر سے پروین شاکر تک'' اور اردو شاعری کل آج اور ہمیشہ منظر عام پر آ کر ان کی نگاہ نقد و بصیرت کی مکمل گرفت اور گہرائی و گیرائی کے دستاویزی ثبوت فراہم کر چکی ہیں جن میں اول الذکر کو نارتھ یونیورسٹی مہاراشٹر نے اپنے نصاب میں شامل کر لیا ہے۔

مجھے قاضی مشتاق احمد کی جس زیر تبصرہ کتاب کا تجزیہ کرتے ہوئے خلاف روایت اتنی لمبی چوڑی

تمہید ناعرض بڑی ہے۔ بلا مبالغہ موصوف کا سب سے اہم اور افادیت بخش تحقیقی کارنامہ اور تمام ارباب اردو کے لئے ایک بیش بہا سوغات ان کی حوالہ جاتی کتاب ''اردو نثر ایک مطالعہ ہے'' افسانوں اور ناولوں کے طلسماتی چمن زاروں میں اپنی تمام تر ادبی زندگی گزار دینے کے بعد شاعری پر قاضی صاحب کی متذکرہ بالا دو کتابیں پہلے ہی ارباب فکر ونظر کو متاثر اور متحیر کر چکی ہیں اس کامیاب تجربے کے بعد لگتا ہے قاضی صاحب کو چونکا دینے کا چسکہ سا لگ گیا ہے جس کے لئے وہ اردو نثر ایک مطالعہ جیسی تحیر المیز اور متاثر کن کتاب منظر عام پر لا چکے ہیں۔ اس کتاب کو تکمیل کے مراحل تک پہنچانے کے لئے موصوف کس قدر جانفشانی سے تلاش وجستجو کے ریگزاروں کو عبور کر کے کتنی نایاب اور کمیاب کتابوں تک رسائی حاصل کرنی پڑی ان کی ورق گردانی کے لئے کس درجہ عرق ریزی کرنی پڑی تحقیق وترتیب کے کیسے کیسے خارزاروں سے گزر کر اپنی فکر کے تلووں کو لہو ریز کرنا پڑا اس کا اندازہ کتاب کی فہرست پر سرسری نظر ڈالتے ہی ہو جاتا ہے۔ صفحات پلٹے ہیں تو ہر صفحہ کی ہر سطر قاری کو غرق حیرت کرنے کا جواز اپنے اندر رکھتی ہے۔ قاضی صاحب نے محض اردو نثر کی تاریخ رسمی طور پر مرتب کر دینے پر اکتفا نہیں کیا کہ اس موضوع پر تو پہلے سے ضخیم ضخیم کتابیں موجود ہیں بلکہ موصوف نے یہ کیا ہے کہ از اول تا حال اردو نثر کی تمام مروّجہ اور متروکہ اصناف پر کم وبیش تمام قابل ذکر نثر نگاروں کی شاہکار تصانیف اور تحریروں کے حسب ضرورت طویل ومختصر اقتباسات پیش کر کے ان پر مدلل اور متوازن ناقدانہ انداز میں اپنی تجزیاتی رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ قاضی مشتاق احمد نے اردو نثر کی پہلی مسلم تصنیف خواجہ گیسو دراز کی معراج العاشقین سے اپنی کتاب کا آغاز کر کے مکتوب نگاری، ناول، افسانہ، سوانح، سیرت، ڈرامہ، تنقید، تراجم، طنز ومزاح، صحافت وغیرہ اصناف نثر پر روشنی ڈالتے ہوئے غالب، میر امن، حالی، مسرور، سرسید، مولانا آزاد، شبلی، نذیر احمد، کشن پرشاد، کول، حسن نظامی، عبدالماجد دریابادی، سجاد حیدر یلدرم، سلیمان ندوی، ظفر علی خاں، فرحت اللہ بیگ، پطرس، آغا حشر، رتن ناتھ سرشار، مرزا رسوا، امتیاز علی تاج، پریم چند، کرشن چندر، عصمت، منٹو، بیدی، عباس حسینی، مقبل، خواجہ احمد عباس، رئیس مرزا، کنھیا لال کپور، شمس الرحمٰن فاروقی، وزیر آغا، ظفر اقبال، ن م راشد، جے اکبر، ظ-انصاری، عابد سہیل، رفیع انصاری، فصیل جعفری، اے جی نورانی، سلطانہ مہر، کبیر احمد جائسی، مولانا علی میاں، انیس چشتی، سعید احمد، حامد کاشمیری اور فرمان فتحپوری گویا یہ کہ اردو نثر کی تمام تر اصناف کا تقریباً سبھی قابل ذکر قلمکاروں کی نگارشات سے اقتباسات شامل کئے ہیں، علاوہ ازیں اس کتاب کی ایک اہم اور قابل قدر خصوصیت چند ایسی کتابوں سے ماخوذ اقتباسات کی شمولیت ہے جن تک عوام تو کجا بیشتر خواص ...... مشکل ہے۔ اس کتاب کی ایک اور اہم بلکہ سب سے اہم خوبی

..........اختصار ہے ہزار ہا ہزار صفحات پر محیط بلا مبالغہ ہزار بارہ سو صفحات کے متقاضی اس عظیم القدر، وسیع ......اور......مواد کو محض ایک سو چھبیس صفحات میں سمیٹ لینا بجائے خود کوزے میں سمندر کو سمیٹ لینے یا چاول پر قل ہواللہ لکھنے کے محاوروں کی معنویت کو اجاگر کرتا ہے۔ اپنے اس شہ۔ ۔ن طلسمی عمل کا اعتراف قاضی صاحب نے اپنے پیش لفظ کے اختتام پر جذبی کے اس شعر کے حوالے سے کیا ہے۔

یہاں ہے طول کلامیٔ نثر کا سکہ
یہاں مرے سخنِ مختصر کی قیمت کیا

اور موقع کی مناسبت سے مجھے بیساختہ شاد عارفی کا یہ برجستہ شعر یاد آ گیا۔

جس ادا سے اس نے میری داستانِ غم سنی
مجھ کو اس نسبت سے فنِ اختصار آتا گیا

قاضی مشتاق احمد کو جہاں طول طویل ناول لکھنے پر عبور حاصل ہے، طویل افسانے، مختصر افسانچے اور مختصر ترین منی افسانے تخلیق کرنے میں بھی وہ خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ ان سابقہ تخلیقی تجربات نے انہیں اس بات کی مشق و مہارت بہم پہنچائی ہے کہ کس بات کو کسقدر طول دیا جائے اور کس کو کتنا اور کہاں مختصر کیا جلائے۔ اس فن پر انہیں خوب دسترس حاصل ہے۔ ان کی مہارت اس کتاب کی ترتیب میں ان کے خوب کام آئی ہے۔ ہر صفحہ کی ہر سطر میں ان کی یہ خوبی جھلکتی ہے ورنہ اردو نثر کے چار سو سالہ کثیر اور خطیر سرمائے کو چند صفحات میں اس فنکاری کے ساتھ سمو لینا کہ کہیں کسی کمی، کجی یا تشنگی کا احساس تک نہ ہونے پائے، ہر کس و ناکس کی بات ہر گز نہیں۔ ''اردو نثر ایک مطالعہ'' کی صورت میں منظر عام پر آنے والے اور منفرد اور شاہکار کارنامے پر قاضی مشتاق احمد کو مبارکباد دیتے ہوئے موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی - ۲، 'نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز' کہتے ہوئے محض ستر (۷۰) روپئے بھیج کر اس کتاب کے ہاتھوں ہاتھ لیئے جانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی توقع رکھتا ہوں کہ ملک کی کئی یونیورسٹیاں اس مفید خاص و عام کتاب کو شامل نصاب کر لیں گی۔

نوٹ:- یہ مضمون فوٹو کاپی کی صورت میں موصول ہوا ہے، جو اکثر جگہ سے نا قابل قرأت (Illegible) ہے۔ صحیح کمپوزنگ نہ ہونے کے لئے ادارہ انتساب معذرت خواہ ہے۔

☆☆☆☆

اردو اور ہندی کے درمیان ادبی پل بنانے کی ضرورت:
اندر کمار گجرال

نئی دہلی 27 اگست :- ہندوستان میں اردو کے حق میں حالات اب اتنے سنگین نہیں رہے جتنے بیس پچیس برس پہلے تھے۔ اردو اور ہندی کی آمیزش سے جس ہندوستانی زبان کو سامنے لانے کی سیاسی کوششیں ناکام رہیں، وہ زبان بالی ووڈ کی ثقافت اور گلوبلائزیشن کے نتیجے میں سامنے آ رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار انتہائی تذکرے میں رہنے والے فروغ اردو کی سفارشات کے مرتب سابق وزیر اعظم اندر کمار گجرال اور شاعر و نغمہ نگار گلزار نے کل شام یہاں ممتاز اردو نقاد و دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تازہ ہندی کتاب ''اردو پر کھلتا دریچہ'' کی تقریب رونمائی میں کیا۔ اس موقع پر ہندی، اردو، انگریزی کے ممتاز ادباء و شعراء موجود تھے۔ مسٹر گجرال نے 'اردو پر کھلتا دریچہ' کو پروفیسر گوپی چند نارنگ کی جستجو پسندانہ طبیعت کا آئینہ قرار دیا۔

گلزار نے اردو ہندی لہجے کے ملاپ سے پیدا ہونے والی تبدیلی کا خیر مقدم کرتے ہوئے زیر بحث کتاب کو افسانوں اور شاعری کے بعد تنقید کی سطح پر اردو اور ہندی میں قربت پیدا کرنے کا مستحسن قدم بتایا اور کہا کہ اس کوشش میں پروفیسر نارنگ کو خاطر خواہ کامیابی اس لئے ملی ہے کہ ان کی تنقید تخلیق پر حاوی نہیں ہوتی۔ اردو تنقیدی تحریروں کی یہ پہلی باضابطہ کتاب ہے جو ہندی میں شائع ہوئی ہے۔ ممتاز ہندی ادیب ہریش ترویدی نے کہا کہ ہم ہندی والوں کے لئے پروفیسر نارنگ نے اردو کا ایک دروازہ کھول دیا ہے۔ اردو کے مایہ ناز نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ پروفیسر نارنگ اردو کے زبردست حامی بھی ہیں۔ انہوں نے پروفیسر نارنگ کو میرؔ، پریم چند اور فراقؔ کی روایت کا آدمی قرار دیا۔ پروفیسر منیجر پانڈے نے کہا کہ پروفیسر نارنگ کی یہ کتاب اردو کے بارے میں بہت ساری غلط فہمیوں کو بھی دور کرے گی۔ اپنے اپنے زمانے میں ابوالفضل اور داراشکوہ نے بھی بہت ساری غلط فہمیاں دور کرنے کا تاریخی کام انجام دیا تھا۔ اسی لئے میں پروفیسر نارنگ کو ابوالفضل اور داراشکوہ کی روایت کا آدمی مانتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میر اور کبیر وسیع معنوں میں سیکولر ہیں اور ان دونوں کا بھی مطالعہ پروفیسر نارنگ نے گہرائی سے کیا ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے کہا کہ بحیثیت ناقد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کبھی کسی تحریک یا دبستان کی ذہنی غلامی قبول نہیں کی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں فیض جیسا شاعر بھی اپنی اسٹیریو ٹائپ پہچان سے الگ نظر آتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پروفیسر نارنگ کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ وہ

اپنے پچاس سالہ ادبی سفر میں کہیں رکے نہیں۔ تنقید و دانشوری کے میدان میں ان کا Contribution بے مثال ہے۔

ترقی پسند ادیب کملیشور نے کہا کہ ڈاکٹر نارنگ کی کتاب ان کے نزدیک نہ صرف اردو پر بلکہ ملی جلی ہندوستانی تہذیب پر کھلتا دریچہ ہے۔ پروفیسر نرملا جین نے ادب میں پروفیسر نارنگ کی اس رہنمائی کی ستائش کی کہ ''کیا چیز کیسے نہ پڑھی جائے'' اور کہا کہ یہی بات انہیں ہم عصروں میں ممتاز بناتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس اہم کتاب پر یونیورسٹیوں میں سمپوزیم منعقد ہونا چاہئیں۔

پروفیسر مشیر الحسن نے یہ کہتے ہوئے کہ پروفیسر نارنگ ان لوگوں میں ہیں جو اردو کے کاروان کو مہمیز لگانے میں پیش پیش ہیں، اس کتاب کا اجرا جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہونا چاہئے تھا۔

آخر میں پروفیسر نارنگ نے کہا کہ اردو اور ہندی کی کشمکش دراصل نفرت کی سیاست کا حصہ ہے اور ان کی زندگی کا مشن اس نفرت کی سیاست کے خلاف لڑنا ہے۔ آج جنوبی ایشیا کی تقریباً 70 کروڑ آبادی اردو اور ہندی بولتی ہے۔ زبانوں کے رشتوں کو کمیونلائز کرنے کی مساعی ہمیشہ کامیاب نہیں ہوسکتی۔ انہوں نے کہا کہ ادیب کا فرض نامساعد حالات میں ہمت نہ ہارنا اور اپنا کام کئے جانا ہے۔ میں نے اس کتاب کے ذریعے نفرت کی سیاہ خلیج کے کنارے روشنی کا ایک ننھا سا چراغ روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ (۷۰۰) صفحات پر مبسوط اس کتاب میں عہد بہ عہد اردو شاعری و فکشن کے ساتھ ساتھ تنقید کے سفر کا جامع احاطہ کیا گیا ہے۔ ہندی میں اسے ارون مہیشوری (وانی پرکاشن) نے شائع کیا ہے۔

بزم اردو قطر کے زیر اہتمام محمد ممتاز راشد کے مزاحیہ شعری مجموعہ کی رونمائی

دوحہ کی قدیم ترین ادبی تنظیم ''بزم اردو قطر'' کے زیر اہتمام 20 ستمبر 2005ء کو میٹروپولٹی ہوٹل شارع کہربا (دوحہ) میں خلیج کے نامور شاعر محمد ممتاز راشد کی مزاحیہ شاعری کے مجموعہ ''مذاق مذاق میں'' کی تقریب رونمائی باوقار انداز میں ہوئی۔ اس کی صدارت ابوظہبی سے آئے ہوئے مہمان شاعر اور ناول نگار میر تنہا یوسفی نے کی۔ مہمان خصوصی انڈ قطر اردو مرکز کے بانی و صدر محمد سلیمان دہلوی تھے۔ نظامت کے فرائض بزم کے جنرل سکریٹری اور معروف شاعر شوکت علی ناز نے ادا کئے۔ تلاوت کلام اللہ کی سعادت طاہر تنویر چوہان کے حصے میں آئی۔ صدر بزم امجد علی سرور نے استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ بزم کو یہاں سب سے زیادہ کتابوں کی رونمائی کی تقریبات منعقد کرنے کا اعزاز حاصل ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ آج ہم بزم کے چیئرمین کی مزاحیہ کتاب کی رسم اجراء کر رہے ہیں۔ انہوں نے صدر تقریب میر تنہا یوسفی کا خصوصی شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے وقت

عنایت کیا۔ پھر جناب یوسفی کے ہاتھوں کتاب کی رسم اجراء تالیوں کی گونج میں عمل میں آئی اور مضامین کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلا مضمون پاک شمع اسکول و کالج کے اردو لیکچرر ظفر اقبال ظفر نے پڑھا۔ عنوان تھا ''محمد ممتاز راشد کے نمکین قطعات'' انہوں نے محمد ممتاز راشد کے ظریفانہ ادبی سفر کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا کہ برسوں سے ان کا کلام رسالوں میں شائع ہو رہا ہے۔ نیز ''رابطہ'' کراچی کے گوشہ ''سخن ظریف'' میں ان کا مزاحیہ کلام بیس سے زیادہ بار چھپ چکا ہے جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ نیز وہ سہ ماہی ''ظرافت'' کراچی کے نمائندہ قطر بھی ہیں۔ مزاحیہ نثر بھی لکھتے ہیں اور 2000ء میں عالمی مزاحیہ کانفرنس کراچی میں قطر کی نمائندگی بھی کر چکے ہیں۔ شہر زندہ دلاں لاہور کے ہیں۔ میرا ان سے آٹھ سال کا دوستانہ ہے اور میں نے انہیں خوب زندہ دل پایا ہے۔ ظفر اقبال نے ان کے سات آٹھ مزاحیہ قطعات بھی پیش کیے۔ ان میں ایک یہ بھی تھا۔

بکری بن کر اک عورت ممیائی تھی
مقصد یہ تھا بچہ خوش ہوجائے گا
اس کو کیا معلوم تھا یوں ممیانے سے
اس کے پیچھے بکرا دوڑا آئے گا

امجد علی سرور نے اپنے اظہار خیال میں کہا کہ میں 1990 سے بزم کی سرگرمیوں میں ان کے ساتھ شانہ بشانہ رہا ہوں۔ ہفتے میں دو تین بار ان سے ملاقات رہتی ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے ادبی معاملوں میں گفت و شنید رہتی ہے۔ ہم نے ان سے انتظامی امور میں بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ بزم کے بانی رکن ہیں پھر بزم کے پریس سکریٹری، معتمد عمومی، صدر اور چیئرمین کی حیثیت سے بزم کی خدمت کرتے آئے ہیں۔ ان میں شعری صلاحیتیں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کی خوبی یہ نہیں کہ کئی اصناف سخن میں شاعری کرتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ حمد و نعت کہیں تو لگتا ہے اسی میدان کے شاعر ہیں۔ غزل کہیں تو لگتا ہے کہ غزل ہی کے باکمال شاعر ہیں۔ قطعہ نگاری تو ان کا خاص میدان ہے۔ مزاحیہ شاعری کریں تو اسی میدان کے شاعر نظر آتے ہیں۔ جس محفل میں ہوں اسے زعفران زار بنائے رکھتے ہیں۔ ان کی یہ کتاب بھی دیگر کتابوں کی طرح کامیاب اور مستند ثابت ہوگی۔

پاک شمع اسکول و کالج کے لیکچرر شفیق اختر نے اپنے مضمون میں کہا کہ دھیمے مزاج کے مالک محمد ممتاز راشد ہی نے مجھے 1995 میں دوحہ کی ادبی محفلوں سے متعارف کرایا۔ سنجیدگی کے ساتھ ظرافت طبع کی خوبی بھی رکھتے ہیں جس کی بناء پر انہیں ''درویش ظریف'' کہا جا سکتا ہے۔ انہیں بے شمار ادبی واقعات اور تاریخ اور تفصیلات صحت کے ساتھ یاد ہیں۔ بلکہ ان میں ایک یہی خامی ہے کہ وہ کچھ

بھولتے نہیں۔ان کی کتاب میں انور مسعود، ساغر خیامی، ڈاکٹر انور سدید اور سرفراز شاہد جیسے بڑے اہل قلم کے دیباچے شامل ہیں اور ہمارے پاک شمع کے ساتھی ظفر اقبال ظفر کا ایک زبردست مضمون بھی شامل ہے جس سے ان کی مزاحیہ شاعری کے کئی جوہر نمایاں ہوئے ہیں۔شفیق اختر نے احمد فراز کی زمین میں کہی گئی محمد ممتاز راشد کی ایک نمکین غزل کے چار پانچ اشعار بھی سنائے جن میں ایک یہ تھا:

مل جل کے مسمات کو چھیڑا تھا جو ہم نے
مل جل کے حوالات میں جانے کے لئے آ

پاک کلچرل فورم قطر کے صدر اور معروف شاعر رشید نیاز محمد ممتاز راشد کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ میرا ان سے تعارف ستمبر 1980 میں ہوا تھا اور اب ستمبر 2005 میں اس دوستی کو 25 سال ہوگئے ہیں اس دوران ہم چند سال ایک ہی گھر میں بھی رہے۔وہ شروع ہی سے شاعری میں میری حوصلہ افزائی اور رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ہمارے باہم اختلافات بھی رہے مگر دوستی اب بھی جاری ہے۔دوستوں نے ان کی بہت سی خوبیاں بتائی ہیں۔جن کی میں تائید کرتا ہوں بلکہ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ دونمبر شاعر نہیں ہیں۔ان کی خوش مزاجی مسلمہ ہے اور اس معاملے میں ان کے خالہ زاد بھائی سعید، خلیل اور جمیل ساتھ ہوں تو لطف اور بڑھ جاتا ہے۔میرا یہ مقام نہیں کہ میں ان کی شاعری اور اس کتاب پر تبصرہ کروں لیکن یہ ہے کہ ان کا مقام سبھی تسلیم کرتے ہیں۔مہمان خصوصی محمد سلیمان دہلوی نے کہا کہ اگرچہ کتاب دیر سے ملنے کی وجہ سے اس کا زیادہ مطالعہ نہیں کرسکا مگر میں ان کا مزاحیہ کلام مشاعروں میں سنتا رہا ہوں اور ان کی ہمہ جہت خوبیوں کا پوری طرح معترف ہوں۔صدرِ تقریب میر تنہا یوسفی نے کہا کہ اکثر دوستوں نے محمد ممتاز راشد کے کئی اصناف میں جوہر دکھانے کا تذکرہ کیا ہے تو اصل بات یہ ہے کہ انہیں لفظوں کو برتنے کا ہنر آتا ہے اور اس کے لئے وہ کوئی بھی صنف منتخب کر لیتے ہیں اور اس کا حق ادا کر دیتے ہیں اور اس معاملے میں خلیج بھر میں وہ سب سے نمایاں ہیں۔خصوصاً 526 صفحات کی ضخیم نثری کتاب ''لاہور کے نئے پرانے رنگ'' لکھ کر تو انہوں نے کمال ہی کر دکھایا ہے۔جو انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ان کی مزاحیہ کتاب ''مذاق مذاق میں'' مجھے تاخیر سے ملی تاہم ایک تہائی پڑھی ہے یہ الگ بات کہ اس کتاب میں دو کتابوں کے برابر مواد ہے۔انہوں نے ہر موضوع پر طنز و مزاح کے شعر کہے ہیں۔دو جگہ انہوں نے محاورہ ''گھر کی مرغی دال برابر'' کو بھی باندھا ہے۔آپ انہیں اکثر سنتے ہیں آپ کی نظر میں وہ ایسے ہوں گے مگر ہم تو ان کے فنی کمالات کے بہت معترف ہیں۔ان کی کتب کا جائزہ لیں تو وہ اب تک پانچ ہزار اشعار کہہ چکے ہیں جو بڑی اہم بات ہے کیونکہ ہم جیسے شاعروں کو ایک شعر کہنا پہاڑ کاٹنے کے جیسا لگتا ہے۔وہ نسیم سحر

(جدہ) کی طرح ہندو پاک کے کئی رسالوں میں شائع ہوتے ہیں اور آپ سب کو ان کی اس معاملے میں پیروی کرنی چاہئے تا کہ آپ کا کلام لوگوں تک پہنچے۔ ان کی صلاحیتیں حیران کن ہیں حالانکہ بظاہر ایک عام سے فرد نظر آتے ہیں۔

صدر تقریب اور مہمان خصوصی سے قبل صاحب تقریب محمد ممتاز راشد نے اظہار خیال کیا اور ارکان بزم کی اس خوبی کو بے حد سراہا کہ انہوں نے ایک دن کی تیاری کے ساتھ یہ بھر پور تقریب منعقد کر ڈالی ہے۔ ارکان بزم کے علاوہ انہوں نے میر تنہا یوسفی اور محمد سلیمان دہلوی اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا کہ اس عزت افزائی سے نوازا۔ انہوں نے کتاب کے ناشر محمد شعیب مرزا کا خصوصی شکریہ ادا کیا جنہوں نے ان کی ایک ماہ کی سالانہ چھٹی کے دوران بھر پور توجہ دی اور کتاب تیار کر کے ان کے ہمراہ کر دی۔ اس تقریب سے متصل بزم کا سالانہ طرحی مزاحیہ مشاعرہ بھی ہوا جس کے لئے محمد ممتاز راشد کا یہ مصرع دیا گیا تھا۔ ع لگائی بجھائی نہیں چھوڑ سکتے - لگائی، لڑائی، پرائی وغیرہ قوافی اور نہیں چھوڑ سکتے ردیف تھی۔ حمد و نعت کے معروف شاعر امجد علی سرور نے اس مصرع طرح میں نعت کہی جسے اپنی مترنم آواز میں سنا کر مشاعرے کا خوبصورت آغاز کیا۔ مزاحیہ کلام سنانے والوں میں محمد یوسف یوسف (کلام - جمشید انصاری نیپال) سعادت علی سعادت، حبیب حیدر آباد، محبوب قاضی، افتخار راغب، عادل مظفر پوری (کراچی) شوکت علی ناز، ارشاد اعظمی، شفیق اختر، امجد علی سرور اور محمد ممتاز راشد شامل تھے۔ جنہوں نے اپنے کلام سے محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ پورا ہال دورانِ مشاعرہ قہقہوں سے گونجتا رہا۔ اور سامعین محظوظ ہوتے رہے۔ منتخب اشعار قارئین کی نذر ہیں:

منتخب اشعار قارئین کی نذر

امجد علی سرور:
نہ بھٹکاؤ ہم کو جو راہِ ہدایت
نبیؐ نے دکھائی نہیں چھوڑ سکتے

سعادت علی سعادت:
بناتے رہیں گے مریدوں کو اندھا
وہ اندھی کمائی نہیں چھوڑ سکتے

محبوب قاضی:
تمہاری ذرا سی محبت کی خاطر
یہاں کی کمائی نہیں چھوڑ سکتے

عادل مظفر پوری:
اسی سے تو بیگم ہوئی اپنی تابع
میاں ہم دوائی نہیں چھوڑ سکتے

ارشاد اعظمی: جسے چھوتے ہی گدگدی ہو بدن میں
ہم ایسی کلائی نہیں چھوڑ سکتے

امجد علی سرور: وہ کیا چھوڑ سکتے ہیں دو چار ڈالر
جو دو چار پائی نہیں چھوڑ سکتے

عزیز رشیدی: مٹاپے سے ہیں شیخ صاحب پریشاں
مگر گھی ملائی نہیں چھوڑ سکتے

جمشید انصاری: بھلے اس میں ہو کھٹملوں کا بسیرا
مگر چار پائی نہیں چھوڑ سکتے

حبیب حیدر آباد: ہیں کچھ لوگ مجبور عادت سے اپنی
لگائی بجھائی نہیں چھوڑ سکتے

افتخار راغب: ہلاتے رہو دم مگر یاد رکھنا
تمہیں یہ قصائی نہیں چھوڑ سکتے

شوکت علی ناز: بھلائی کا ناز ہم نہ چھوڑیں گے پلہ
برے گر برائی نہیں چھوڑ سکتے

شفیق اختر: فرنگی کے جب تک نہ ہوں دانت کھٹے
وہ ہم پہ چڑھائی نہیں کر سکتے

محمد ممتاز راشد: کسی کی اڑائی ہوئی پر ہی خوش ہیں
جو اپنی ہوائی نہیں چھوڑ سکتے

آخر میں تنہا یوسفی نے اپنی کئی غزلیں سنائیں۔ انہوں نے بطور صدر تقریب اس پر خوشگوار حیرت کا اظہار کیا کہ بزم اردو قطر برسوں سے سالانہ طرحی مزاحیہ مشاعرہ بھی منعقد کرتی چلی آرہی ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔

نمایاں شرکاء میں: سید عبدالحئی (نائب صدر، انڈو قطر اردو مرکز)، حیدر علی (صدر - حلقہ ادب اسلامی قطر)، ابراہیم خان کمال (بانی انجمن محبان اردو ہند)، خالد داد خان (صدر انجمن محبان اردو ہند)، محمد غوث (سرپرست بزم اردو قطر)، شاداں کولوی (معتمد عمومی حلقہ ادب اسلامی قطر)، خالد امین بٹ (معتمد عمومی پاک کلچرل فورم) عدیل اکبر (معتمد عمومی پاکستان آرٹس سوسائٹی) محمد اکرم (ٹائم ویڈیو) طارق چغتائی، سید عاصم جاوید، محمد ابرار حسین، عبداللطیف انور، طاہر تنویر، زوار حسین

ذاکر اور فرحت انصاری شامل تھے جبکہ بزم کے دو سرپرست عزیز رشیدی آنکھ کے آپریشن اور عبدالخالق مونس ہنگامی ڈیوٹی کی وجہ سے شامل تقریب نہ ہو سکے۔

آخر میں صدر بزم امجد علی سرور کے اظہار تشکر کے بعد تقریب کے اختتام کا اعلان ہوا۔ اس طرح یہ خوبصورت تقریب ساڑھے نو بجے شب شروع ہو کر ساڑھے گیارہ بجے شب اختتام پذیر ہوئی۔

رپورٹ: عبدالرحمٰن فرید ندوی

معتمد نشر و اشاعت (بزم اردو قطر)

قطر کی چند ادبی خبریں

☆ پاک یوتھ سوسائٹی قطر نے ایک کثیر اللسانی مشاعرے کا اہتمام کیا مہمان خصوصی لاہور سے آئے ہوئے مہمان کالم نگار اور شاعر عطاء الحق قاسمی تھے۔ دیگر مہمان شعراء میں شعیب بن عزیز، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، عائشہ مسعود ملک، مشتاق شباب اور میر تنہا یوسفی (ابوظہبی) تھے۔ قطر کی نمائندگی محمد ممتاز راشد، رشید نیاز، شوکت علی ناز، فیروز آفریدی (پشتو)، فرزانہ صفدر (سندھی) اور نعیم وفا (بلوچی) نے کی۔ صدر تنظیم قاضی محمد اصغر نے استقبالیہ کلمات اور مہمان شعراء کا تعارف کرایا۔ دو سو سے زائد خواتین و حضرات نے شرکت کی۔ نظامت اختر انور صدیقی اور رشید نیاز نے کی۔ صدر مشاعرہ ڈاکٹر امتیاز احمد قاضی تھے۔

☆ ''ادارہ خیال و فن قطر'' نے ابوظہبی سے آئے ہوئے مہمان شاعر اور ناول نگار میر تنہا یوسفی کے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کیا جس کی صدارت ادارہ کے چیئرمین طاہر تنویر چوہان نے کی۔ صدر ادارہ محمد ممتاز راشد نے استقبالیہ کلمات اور مہمان شاعر کا تعارف پیش کیا۔ شعری دور میں حصہ لینے والوں میں فیصل ضیاء، محمد شہباز، ظفر اقبال ظفر، شوکت علی ناز، محمد ممتاز راشد، میر تنہا یوسفی اور صدر نشست شامل تھے۔

☆ ''دبستانِ ادب قطر'' کے زیر اہتمام ممبئی کے شاعر نذیر فتحی کے مزاحیہ قطعات کے مجموعہ ''لاٹھی چارج'' کی رسم اجراء نامور شاعر محمد ممتاز راشد کی صدارت میں ہوئی۔ مہمان خصوصی میاں فضل رحیم کاکاخیل تھے۔ ان کے علاوہ بانی دبستان امجد علی سرور، صدر دبستان فرید ندوی، اشفاق قلق اور افتخار راغب نے اظہار خیال کیا۔ متصل مشاعرہ میں پندرہ شعراء نے مزاحیہ کلام سنایا۔ مشاعرہ کی صدارت ابوظہبی سے آمدہ شاعر میر تنہا یوسفی نے کی۔ آخر میں ان سے تادیر ان کا کلام سنا گیا۔

ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام پریم چند پر چار روزہ انٹرنیشنل سمینار کا افتتاح

نئی دہلی، ۲۷ اکتوبر:- منشی پریم چند جدید ہندوستان کے عظیم ترین ادیبوں میں سے ایک ہیں جنہیں ساری دنیا جانتی اور مانتی ہے۔ انہوں نے ہندی اور اردو زبانوں میں لکھا اور دونوں ہی زبانوں میں ناول نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے اعلیٰ ترین مقام حاصل کیا۔ پریم چند سے قبل ہندی اور اردو میں دراصل افسانہ تھا ہی نہیں۔ یہ الفاظ ساہتیہ اکادمی کے صدر اور عالمی شہرت یافتہ مفکر اور ادیب پروفیسر گوپی چند نارنگ نے منشی پریم چند کی ۱۲۵ویں سالگرہ کے موقع پر ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام چار روزہ عالمی سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے کہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مزید کہا کہ ہندی ادب کی دنیا میں پریم چند کو جتنی عزت ملنی چاہئے تھی اتنی ان کی زندگی میں نہیں مل سکی۔ ایک طرف تو انہیں "اپنیاس سمراٹ" کا خطاب دیا جاتا تو دوسری طرف انہیں تاش کے بادشاہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ ان کی موت کے بعد ہی لوگوں نے ان کی طرف خاطر خواہ توجہ دی۔ خوشی کی بات ہے کہ وہی پریم چند جو ہماری یادوں میں سویا ہوا تھا، اب اچانک جاگ گیا ہے۔ اس کے باوجود آج بھی ہندی اردو میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کی نگاہ صرف پریم چند کی کمزوریوں پر رہتی ہے۔ ابتدائی دور میں ضرور ان میں کمزوریاں رہی ہوں گی لیکن زندگی کے آخری برسوں میں ان کا فن اس درجہ کمال پر ملتا ہے جس کی کوئی دوسری نظیر اس زمانے کی ہندی اردو میں نہیں ہے۔ پریم چند کی یہی دین کیا کم ہے کہ وہ ہندی اردو افسانہ کے جنم داتا ہیں۔

پروفیسر نارنگ نے اپنی تقریر میں آگے کہا کہ بلاشبہ منشی پریم چند نے حق وانصاف اور سماجی خدمات کے آدرش بھی تراشے تھے۔ ان کے کئی کردار گاندھی وادی فکر سے بھی آراستہ ہیں۔ بنگلہ ادیب شرت بابو کی طرح حقیقت نگاری پریم چند کو وراثت میں نہیں ملی۔ اس کے لئے انہوں نے خود زمین صاف کی، خود بیج ڈالا اور خود فصل اُگائی۔ پروفیسر نارنگ نے اپنے صدارتی خطبے کے آخر میں کہا کہ جن بنیادوں پر ہندی اردو کہانی اور ناول کا محل سجایا گیا ہے وہ بنیادیں پریم چند کی ہی رکھی ہوئی ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو کرشن چندر، منٹو، بیدی اور عصمت کو کرشن چند، منٹو، بیدی اور عصمت بننے کے لئے شائد ایک جنم اور انتظار کرنا پڑتا۔

اپنے تعارفی خطبے میں ساہتیہ اکادمی اکزیکیٹو بورڈ کے رکن گری راج کشور نے کہا کہ پریم چند کا وارث ہر مزدور، ہر کسان اور ہر غریب انسان ہے۔ دراصل ان کی تخلیقات ایسی چراگاہ ہے جہاں قاری سے لے کر ادیب تک ہر کوئی اپنی ادبی بھوک شانت کرسکتا ہے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ پریم چند کی وراثت کو مندر مسجد کی طرح نہ بنائیں کیونکہ پریم چند نے جو کیا ہے وہی ان کا پیغام ہے۔

معروف وممتاز افسانہ نگار راجندر یادو نے اس موقع پر افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

آج پریم چند کو متنازعہ ادیب بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ان کی تخلیقات پر کئی الزامات بھی لگائے جارہے ہیں۔ان کی زبان اور سوچ کو سطحی کہا جارہا ہے۔پریم چند کو سامنت یعنی راج شاہی کا منشی بھی کہا جارہا ہے۔ان تمام باتوں کے پیش نظر انہیں جاننا اور سمجھنا اور ضروری ہوگیا ہے۔اس کے لئے ہمیں گہرائی میں اترنا ہوگا۔ بلاشبہ وہ عظیم ہیں لیکن اس عظمت کو سمجھنا بھی لازم ہے۔راجندر یادو کے مطابق ناانصافی اور مظالم کے خلاف جدوجہد کا نام پریم چند ہے۔پریم چند کو ایک نئی نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔اگر ہم پریم چند کے پاس جاتے ہیں تو وہ ہماری عقیدت اور شردھا ہے اور اگر وہ ہمارے پاس آتے ہیں تو وہ ہمارے سنسکار کا حصہ بنتے ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم انہیں اپنے سنسکار کا حصہ بنائیں۔

اپنے کلیدی خطبے میں شری کملیشور نے کہا کہ اگر ہم پریم چند کو ان کی ۱۲۵ ویں سالگرہ کے موقع پر یاد کررہے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ عظیم فنکار تھے۔پریم چند نے جاگیردارانہ ماحول میں غریبوں کی بات کی۔اور لوگوں کے نزدیک وہ کتھا سمراٹ ہوں گے مگر میرے نزدیک وہ کہانی کے فقیر تھے جو گاندھی جی کے ساتھ پیدا ہوئے جنہوں نے لوگوں کی سوچ کو بدل دیا۔ذہن و مزاج کے جغرافیہ میں اتھل پتھل مچادی اور اجتماعی بیداری پیدا کی جس کے نتیجے میں حق و انصاف اور سماجی برابری کے لئے جدوجہد کرنے والوں کی ایک فوج کھڑی ہوگئی ہے۔اس لئے پریم چند کی وراثت کبھی کمزور نہیں پڑسکتی۔

اپنی تقریر میں پریم چند کے پوتے پروفیسر آلوک رائے نے پریم چند کے اردو متن اور ہندی متن کے تقابلی جائزے کی ضرورت کا احساس دلایا۔ اس موقع پر کرشنا سوبتی اور کیلیفورنیا (امریکہ) سے تشریف لائے کرسٹوفر کنگ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اس سیمینار کے پہلے اجلاس کا موضوع 'پریم چند اور ہم عصر سیاست' تھا جس کی صدارت ہندی کے معروف نقاد و ادیب پروفیسر منیجر پانڈے نے کی۔رام وچن رائے، ہریش تریدی اور وینو گوپال نے اپنے مقالوں کے ذریعہ پریم چند کے عہد کی سیاست، معاشرے پر اس کے اثرات پر روشنی ڈالی۔دوسرے اجلاس میں 'دلت ڈسکورس اور پریم چند' کے موضوع پر چمن لال، موہن داس نیمی شرائے اور سورج پال چوہان نے مقالات پیش کئے۔صدارت نتیانند تیواری نے کی۔شام کو سات بجے شری رام سنٹر میں وبھا مشرا کی ہدایت میں پریم چند کے ناول ''غبن'' پر مبنی ڈرامہ پیش کیا۔☆

اصل پریم چند کو ابھی تک تلاش نہیں کیا جاسکا ہے: قمر رئیس

ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام پریم چند پر انٹر نیشنل سمینار کا دوسرا دن

نئی دہلی، ۲۸/ اکتوبر :- آریہ سماج اور وویکانند کے اثرات نے پریم چند کے ذہن و دل میں سیاسی اور سماجی بیداری کے جذبات اور خیالات کو شدت بخشی ہے لیکن وہ فرقہ وارانہ فکر و شعور اور تنگ نظری کی لعنت سے بہت دور تھے۔ بلاشبہ وہ اردو کے قلم کار ہیں اور انہوں نے ہندی میں بھی خوب لکھا۔ ہندی اردو کا جھگڑا انہیں اکثر پریشان کرتا تھا۔ ان کے نزدیک 'ہندوستانی' کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور وہ اس زبان کو ملک کے مستقبل کی زبان سمجھتے تھے۔ لوگوں کو یہ غلط فہمی بھی دور کر لینا چاہئے کہ پریم چند کو پاکستان میں کوئی نہیں پوچھتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان کے تعلیمی نظام میں پریم چند کو بلند مقام حاصل ہے۔ پرائمری سے یونیورسٹی کی سطح تک پریم چند کو وہاں پڑھایا جارہا ہے۔ پریم چند کی ۱۲۵ویں سالگرہ پر ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام انٹرنیشنل سیمینار کے دوسرے دن آج ممتاز اردو اسکالر ڈاکٹر قمر رئیس نے ان خیالات کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے "اردو ادیب کے روپ میں پریم چند" پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ پریم چند کو مختلف زاویوں سے جاننے اور سمجھنے کی کوشش ضرور ہوتی رہی ہے لیکن 'اصل' پریم چند کو ہم آج بھی تلاش نہیں کر سکے ہیں۔ سماجی ناانصافی، معاشرے میں پھیلے برائیوں اور مظالم کے خلاف ان کا ردعمل بیحد شدید تھا۔ وہ حساس تو تھے ہی اس کے ساتھ ان کا مشاہدہ انتہائی غیر معمولی تھا۔ پریم چند فکر و عمل کے ایسے مجاہد کا نام ہے جو رومانی تخیل سے دور حقیقت کی سخت زمین پر کھڑا رہا۔ ان کی اردو دانی اور نثر نگاری کی تعریف اور اعتراف اردو کے تقریباً سبھی عالموں اور ادیبوں نے کیا ہے۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے اپنے مقالے میں کہا کہ پریم چند نے قدیم روایت کے گھیرے میں گھرے اردو ماحول کو بدل کر اسے حقیقت نگاری سے آشنا کیا ہے۔ انہوں نے گل و بلبل کی دنیاؤں سے الگ حقیقت آشنا، الجھی ہوئی دنیا کی گرہ کھولنے کی کوشش کی ہے۔ پریم چند نے کھیت کھلیان، گائے بیل، گوبر، مزدور، کسان، ظلم و استحصال، بھوک، غریبی اور معاش کی پیچیدگیوں کو اپنے افسانوں میں اجاگر کیا ہے۔ پریم چند نے ادب کو سیاست سے آگے رکھ کر معاشرے میں نئی روشنی کی تمنا کی ہے۔

ماہر پریم چند اور بزرگ صحافی جناب مدن گوپال نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ 'اصل' پریم چند اردو میں ہی دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۲۴ کے بعد ہندی میں لکھنا شروع کیا۔ پریم چند کا پہلا ناول 'شیاما' تھا۔ ان کی پہلی بیوی کا نام شیاما تھا۔ شروع میں وہ نواب رائے کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ ممبئی سے آئے جی کے مانک ٹالا نے پریم چند کو اردو کا سدابہار تخلیق کار بتاتے ہوئے کہا

کہ انہوں نے اردو اور ہندی فکشن کو طلسماتی داستانوں کی غیر فطری فضاؤں کی بلندیوں سے دھرتی پر اتار کر زندگی کی سنگین سچائیوں سے نہایت ہی فنکارانہ طریقے سے روشناس کرایا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ پریم چند نے اردو اور ہندی فکشن کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔ بلاشبہ انہیں ہندی اور اردو فکشن کے نئے اسلوب اور نئی ڈگر کا بانی اور پیش رو کہا جاسکتا ہے۔

'خواتین ڈسکورس' اور پریم چند کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے ہندی کے نقاد و ادیب سدلیش پچوری نے پریم چند کو ایک درسگاہ قرار دیا جہاں زندگی کا سبق حاصل کیا جاسکتا ہے۔ میترےئی پشپا نے پریم چند کو خواتین کے حقوق کا طرفدار بتاتے ہوئے کہا کہ انہوں نے ہندوستانی معاشرے میں مظالم، استحصال، ناخواندگی اور بے بسی کی چٹانوں کے نیچے چھٹپٹاتی عورت کے کرب و احتجاج کو نہایت پرکاری اور ہنرمندی کے ساتھ اپنے افسانوں اور ناولوں میں اجاگر کیا ہے۔ بسواس چندر نے بتایا کہ پریم چند عورت اور مرد کو ایک دوسرے کی تکمیل تصور کرتے تھے۔ وہ ہندوستانی تہذیب و روایت کے علمبردار اور خواتین کی تعلیم و ترقی کے خواہاں تھے۔

سیمینار کے پانچویں اور چھٹے اجلاس میں بھی پریم چند کی تخلیقات کی مختلف جہتوں پر مختلف دانشوروں نے اظہار خیال کیا۔ اس اجلاس میں شنکر لال پروہت، چندرکانت باندیوڈیکر، کے ایم مالتی، سومابندھوپادھیائے، کرسٹوفر رولینڈ کنگ، لدملا واسی لیوا اور ڈاگمار مارکوا نے مقالات پیش کئے۔ ان اجلاسوں کی صدارت بال شوری ریڈی اور تھامس ڈی بروجن نے کی۔

چند اہل اردو کے منفی رویہ سے پریم چند خوش نہیں تھے: گوئنکا
پریم چند کے نام پر دہلی میں سڑک کا نام رکھنے کا مطالبہ

نئی دہلی ۲۹/اکتوبر:- پریم چند نے اپنے پہلے ناول 'اسرارِ معبد' سے 'رنگ بھومی' تک کی تمام تخلیقات اردو میں تحریر کی تھیں۔ ان تخلیقات کو بعد میں ہندی میں کیا گیا۔ ان ناولوں کی اردو اور ہندی مسودوں میں سے کسے اصل اور کسے ترجمہ سمجھا جائے۔ اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کن بات سامنے نہیں آسکی ہے۔ پریم چند سیمنار کے تیسرے دن آج ساتویں اجلاس میں پریم چند معاملوں کے ماہر ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا نے انکشاف کیا کہ پریم چند اپنے ناول، افسانہ یا مضمون کا ابتدائی خاکہ انگریزی میں تیار کرتے تھے۔ ان خاکوں کے بعد ہی وہ ہندی یا اردو میں ناول یا تخلیق تحریر کرتے تھے۔ اس طرح پریم چند غالباً ہندی کے پہلے ایسے ناول نگار ہیں جن کے تخلیقی عمل کا تعلق تین زبانوں انگریزی، ہندی اور اردو سے تھا۔

ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا نے مزید کہا کہ پریم چند کے اردو سے ہندی کی طرف راغب ہونے

کی ایک وجہ مالی ضرورت بھی تھی لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ ہندی کے ذریعہ انہیں قومی سطح کا منچ مل رہا تھا۔ ڈاکٹر گوئنکا کے مطابق پریم چند کے تئیں چند اہل اردو کا منفی رویہ بھی اسی حد تک اس کے لئے ذمہ دار ہے۔ انہوں نے کہا کہ پریم چند کی ہندی زبان کی تشکیل بھی اردو اور فارسی کی حصہ داری کو ابھی تک دیکھا اور پرکھا نہیں جاسکا ہے۔ اہل اردو نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ پریم چند جیسی ار.. کوئی مسلم قلم کار بھی نہیں لکھ پایا لیکن وہ بھی ان کی اردو زبان میں ہندی کے اثرات دیکھنے کو تیار نہیں۔

پریم چند کے ناولوں اور ان کی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے پریم پال شرما نے سوال کیا کہ کسی انعام، اعزاز یا غیر ملکی سفر کے لئے کسی بھی سمجھوتے کے لئے ہماری ہم عصر نسل کیا پریم چند کو یاد کرنے کی حقدار ہے؟ پریم چند ایک ایسے اصول پسند تھے جنہوں نے تمام عمر ایک گوشے میں بیٹھ کر مشقت کی لیکن کبھی بھی ادھر ادھر نہیں ہوئے۔ پریم چند کے بعد ہندی میں جن ادیبوں نے بیباکی اور خودداری کو آگے بڑھایا ہے ان میں رینو، ہری شنکر پرسائی اور اگیے سرفہرست ہیں۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ پریم چند پر مہاتما گاندھی کے اثرات بھی جانتے ہیں۔ لہٰذا کیوں نہ راج گھاٹ کو جوڑنے والی سڑک کا نام پریم چند مارگ رکھ دیا جائے۔ اے. اروندا کشم نے کہا کہ پریم چند نے اپنے تمام ناولوں میں زندگی کے حقائق کی چھوٹی سے چھوٹی اکائیوں کو ہی خلق کیا ہے۔ ہماری روزمرہ کی زندگی کے حقائق کی کچھ ایسی صورتیں جن سے باہر کی دنیا کا کوئی مطلب نہیں ان کے ناولوں کے کینوس کو بامعنی بناتے ہیں۔ اس اجلاس کا موضوع تھا ''پریم چند ناول نگار کے روپ میں'' صدارت کمل کشور گوئنکا نے کی۔

آٹھویں اجلاس میں پولینڈ کی دانوتا استاشک نے کہا کہ پولینڈ میں پریم چند کی حاضری کم نہیں ہے۔ انہیں نہ صرف ہندوستانی ادب کے نمائندے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ بلکہ کلاسیکی عالمی ادب کا بھی اہم ترین نمائندہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ پولش زبان میں ان کی چند منتخب کہانیاں ہی دستیاب ہیں جو پریم چند کی پوری تخلیقی دنیا کو پیش نہیں کر پاتی۔ اٹلی کی فرانسسکا آرسینی نے کہا کہ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر کے ناولوں کو ذوق وشوق سے پڑھنے والے پریم چند نے ہندی میں جو اسلوب وضع کیا وہ سماجی حقیقت پسندی ہی کہا جائے گا۔ انہوں نے اپنے ہر ناول میں کوئی نہ کوئی سماجی مسئلہ اٹھایا ہے۔ ان کے ہر کردار کا ذکر ان کے پیچھے ان کے سماجی پس منظر سے شروع ہوتا ہے لیکن ان سب کے باوجود پریم چند کے افسانوی ادب میں میلوڈرامہ بھرا پڑا ہے۔ اس اجلاس کی صدر ماریہ اوفریدی نے گودان کے حوالہ سے پریم چند کے افکار کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی۔ ان کے مطابق پریم چند کی نگاہ میں دانشوروں کا فرض ہے کہ وہ جذباتی نہ ہوں بلکہ دنیا میں پھیلے مظالم، ناانصافی، اندھ وشواس اور مفاد پرستی کے خلاف جدوجہد کریں۔

پریم چند کے ادب میں علاقائیت اور گلوبلائزیشن کے موضوع پر اپنے مقالے میں پریم سنگھ نے کہا کہ 'رنگ بھومی' پریم چند کی قابل ذکر اور اہم ترین تخلیق ہے جس میں علاقائیت اور گلوبلائزیشن کے درمیان کشمکش کو دکھایا گیا ہے۔ اس تخلیق پر گاندھی وادی خیالات کا اثر واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ بزوجی نے اپنے پرچے میں کہا کہ پریم چند کو پڑھے بغیر انیسویں اور بیسویں صدی کے بھارت کو نہیں جانا جاسکتا۔ نہ صرف ہندی میں بلکہ تمام ہندوستانی افسانوی ادب میں فن اور احساس کی سطح پر دیگر ہندوستانی زبانوں میں ان سے بڑے افسانہ نگار دکھائی دے سکتے ہیں؛ ہندی میں ہی ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں ایسے لوگوں کی نشان دہی کی جاسکتی ہے لیکن بیسویں صدی کی بھارت کی مکمل تصویر ان کے سوا دنیا کی کسی دیگر زبان میں موجود نہیں۔

دسویں اجلاس کی صدارت شیو کمار مشرا نے کی جس کا موضوع "گاندھی واد تحریک آزادی اور پریم چند" تھا۔ اس میں وشوناتھ ترپاٹھی، نند کشور آچاریہ، اور مدھوریش نے مقالات پیش کئے۔☆

سامراجیت، فرقہ واریت اور برادری واد کے مخالف تھے پریم چند

پریم چند پر ساہتیہ اکادمی کا چار روزہ بین الاقوامی سیمنار اختتام پذیر

نئی دہلی ۳۰ اکتوبر:- پریم چند سامراجیت، فرقہ واریت اور برادری واد کے زبردست مخالف تھے۔ ملک میں بڑھتی فرقہ پرستی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج سے وہ بے حد تشویش میں مبتلا رہتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ غریبوں کی حمایت کی۔ انگریز حکمرانوں کے تلوے چاٹ کر اقتدار سے فیض یاب ہونے کے آرزومند ملک کے درمیانہ طبقے کے رویے کی انہوں نے ہمیشہ مخالفت کی۔ پریم چند کے بارے میں ممتاز کمیونسٹ لیڈر بی ٹی رنی دوے کے ان خیالات کو پریم چند بین الاقوامی سیمینار کے چوتھے دن آج بنگلہ زبان کے ادیب وصحافی انل آچاریہ نے اپنے مقالے میں پیش کیا۔ انل آچاریہ نے بتایا کہ کانگریس کے کچھ ہندو لیڈروں کے فرقہ وارانہ رویے کے پریم چند خلاف تھے اور وہ یہ بھی بخوبی جانتے تھے کہ ملک کی ملی جلی تہذیب کی پاسداری کس طرح ہوسکتی ہے۔ انہوں نے زرعی انقلاب کا خواب دیکھا تھا تا کہ ہندوستانی معاشرے میں زمین داری اور اس کے ظلم وستم کا خاتمہ ہو۔

ہندی ادیب ارون کمل نے اپنے مقالے میں کہا کہ پریم چند کے ادب کا رقبہ اس قدر وسیع ہے کہ اس میں شمالی ہند کی زندگی اپنی تمام وسعت اور حقائق کے ساتھ سمائی ہوئی ہے۔ گاؤں، قصبوں کے کسانوں، مزدوروں اور نچلے متوسط طبقے کے بارے میں لکھتے ہوئے بھی پریم چند کی تخلیقات سب

کے بارے میں ہیں۔ ہندی میں اتنا بڑا رقبہ کسی دوسرے ادیب کا نہیں۔ انہوں نے آگے کہا کہ پریم چند کی ضرورت آج پہلے سے زیادہ ہے۔ ان کے کردار آج بھی ہمارے معاشرے میں زندہ ہیں لیکن اب وہ مختلف حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سواس کمار کے مطابق پریم چند کی پہلی حقیقت پسندی مغربی روایت سے الگ ہٹ کر ہے۔ ہندی ادب میں حقیقت پسندی اور ترقی پسند ادب کو فروغ دینے میں پریم چند کے افسانوں ادب کا تعاون سب سے زیادہ ہے۔ پریم چند کا یقین تھا کہ ادیب یا تو دیکھا ہوا لکھتا ہے یا پھر جو لکھ رہا ہے اسے کبھی ضرور دیکھے گا۔

کنور پال سنگھ نے بارہویں اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ پریم چند ایک عظیم تخلیق کار ہیں اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی تخلیقات کو سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ درحقیقت پریم چند کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ بھودیو پانڈے نے افسانوں سے الگ پریم چند کی نثر کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کے مضامین، تبصرے، تنقید، دیباچے اور خطوط وغیرہ کی اہمیت بھی کم نہیں۔ ان کے تحریر کردہ اداریوں کو بھی نظر انداز کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ افسانوں سے الگ ان کے نثر پاروں کی جانچ پرکھ کا وقت اب آ گیا ہے۔

اس بین الاقوامی سیمینار کا آخری اجلاس مختصر افسانوں کے لئے وقف تھا جس کی صدارت ہندی کے مشہور و معروف ادیب گری راج کشور نے کی۔ شیکھر جوشی، چترا مدگل، پریم ود، سارا رائے، ارون پرکاش اور ادے پرکاش نے یہاں اپنے مختصر افسانے پڑھے۔ ان چار دنوں کے دوران پریم چند کی زندگی، ان کے کارناموں اور تخلیقات پر بھرپور طویل گفتگو اور بحث سے یہی ثابت ہوا کہ ہندی میں ان جیسا افسانہ نگار اور ناول نگار کوئی دوسرا نہیں۔ ان کی عظمت کا اعتراف سبھی کرتے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری کے سچیدانندن نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی اختتامیہ تقریر میں پریم چند کے ادب، ان کے نظریات و افکار کو وسیع عوامی حلقوں تک پہونچانے پر زور دیا۔ پریم چند کی ۱۲۵ ویں سالگرہ کے موقع پر ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام یہ چار روزہ بین الاقوامی سیمینار ہندی اور اردو کے ادبی حلقوں میں ایک طویل عرصہ تک یاد کیا جائیگا۔

رپورٹ: محمد موسیٰ رضا،
اسسٹنٹ ساہتیہ اکادمی

سیفی سرونجی کی شخصیت اور فن پر گفتگو

چھبڑہ، راجستھان میں محمد توفیق خاں کی مرتبہ کتاب ”سیفی سرونجی کی شخصیت اور فن“ کا اجراء بدست ڈاکٹر ضیاء الدین ٹونکی، راجستھان اردو اکیڈمی کے ایکزیکیٹو ممبر ہوا۔ اس عظیم الشان

تقریب کی صدارت استادالشعراء شاداں سرونجی نے کی اور نظامت کے فرائض سہ ماہی انتساب کے خصوصی معاون ڈاکٹر صغیر شاد نے انجام دیے، اس موقع پر کثیر تعداد میں اہل ذوق حضرات نے تقریب میں شرکت کی۔ ڈاکٹر صغیر شاد نے اس موقع پر سیفی سرونجی کے تعلق سے کہا کہ عالم ادب میں سیفی کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔

محمد توفیق خاں کی مرتب کردہ کتاب ''سیفی سرونجی شخصیت اور فن'' ایک دستاویزی کتاب ہے۔ 504 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں عالم ادب کے اردو کے مشہور و معروف ایک سو آٹھ ادیبوں، نقادوں، مفکرین کے مضامین و تاثرات شامل ہیں۔ یہ کتاب مستقبل میں پی. ایچ. ڈی. کے اردو اسکالر کے لئے راہ نما ثابت ہوگی۔ محمد توفیق خاں صاحب خراجِ تحسین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کوزہ میں سمندر سمودیا ہے۔

مہمانِ خصوصی ڈاکٹر ضیاء ٹونکی نے کہا کہ آج ادبی دنیا میں سرونج کی پہچان سیفی کے نام سے ہے۔ خطبہ صدارت میں شاداں سرونجی نے فرمایا کہ ان ناگفتہ بہ حالات میں سہ ماہی انتساب کی اشاعت نے ادب میں سرونج کو وہ مقام بخشا ہے کہ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

رپورٹ :۔ ڈاکٹر صغیر شاد

مشاہیر کے خطوط محمد ایوب واقف کے نام

ڈاکٹر خلیق انجم کے نام

۸ر نومبر ۲۰۰۱ء

واقف صاحب! السلام علیکم

ممبئی حاضر ہوا تو آپ سے ملاقات ہی نہ ہو سکی لیکن آپ کی محبت کا دل سے قائل ہو کر آیا۔ آپ کے صاحبزادے مجھے لینے آئے تھے تا کہ میں آپ کے ساتھ قیام کر سکوں لیکن مجھے لگا کہ آپ کو بھی زحمت ہوگی اور سیمینار [1] کے منتظمین کو بھی۔ آئندہ جب کبھی ممبئی حاضر ہوں گا تو آپ ہی کے یہاں قیام کروں گا۔ آپ کی محبت اور کرم فرمائی کا دل سے معتقد ہوں، خدا آپ کو سلامت رکھے۔

میں نے سردار جعفری مرحوم پر ایک چھوٹی سی کتاب [2] لکھی ہے۔ چاہتا ہوں کہ ان کی بیماری اور آخری دنوں کے حالات بھی شامل کرلوں، کیا آپ اس میں میری مدد کر سکتے ہیں، کتاب بالکل تیار ہے، اس لئے ازراہِ کرم جعفری صاحب کی وفات کے بارے میں معلومات جلد سے جلد فراہم کر دیجئے۔ معلومات کچھ ایسی ہوں گی:

۱- کیا بیماری ہوئی تھی

۲- کون سے اسپتال میں داخل کئے گئے

۳- ان کی علالت کے دوران کے واقعات۔ کون کون لوگ ان سے ملنے آئے تھے وغیرہ۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

نیاز کیش

خلیق انجم

---

[1] مذکورہ سیمینار مولانا عبدالسلام ندوی جانشین علامہ شبلی نعمانی پر منعقد کیا گیا تھا۔ اس سیمینار میں ہندوستان کے مشہور محققین اور ناقدین نے شرکت کی تھی۔ (مرتب)

[2] یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوسکی ہے، علی سردار جعفری کے خطوط بھی ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے ترتیب دیئے ہیں جسے انجمن ترقی اردو نے بڑی خوبصورتی سے شائع کیا ہے۔ (مرتب)

واثق جونپوری کا خط

لال کوٹھی،
پوسٹ آفس: کجگاؤں
ضلع جونپور (یو.پی.)
۲۷ر نومبر ۱۹۸۸

عزیزی واقف صاحب سلمہٗ،

دعائیں،

مجھ کو احساس ہے کہ "ذکر رفتگاں" [۱] پر تبصرہ تاخیر سے بھیج رہا ہوں اور شرمسار بھی۔ مگر مجبور تھا۔ یہ بھی ہے کہ میں چلتا ہوا کام کرنے کا عادی نہیں۔ اس لئے دوسروں سے زیادہ وقت لیتا ہوں۔ ورنہ کتابوں پر تبصرے چار پانچ سطروں میں بھی آتے رہتے ہیں۔ انگریزی میں بھی چند جملوں میں رائیں آتی ہیں۔ مگر کیا کہنا اس زبان کا۔ کوئی ایک جملہ کتاب کا عطر ہوتا ہے۔ مگر وہ Provision اجمال جمیل ابھی اُردو کو نصیب نہیں۔ ہمارے یہاں Jargons اصطلاحوں کی بھی کمی ہے۔

تبصرہ منسلک ہے، آپ اس کو چاہیں جس جریدے میں شائع کرواسکتے ہیں۔ آپ کو پورا اختیار ہے۔ شرط یہ ہے کہ بے کم و کاست شائع کیا جائے۔

میں بفضلہٖ مع الخیر ہوں اور امید ہے کہ آپ بھی مع جملہ متعلقین کے خیر و عافیت سے ہوں گے۔ والدّعا۔

خیراندیش
واثق جونپوری

---

۱ محمد ایوب واقف کے خاکوں کی مشہور کتاب۔ اس کتاب پر واثق جونپوری کا طویل تبصرہ سہ ماہی انتساب کے ایوب واقف نمبر میں شامل ہے، واثق صاحب کی حیات میں روزنامہ انقلاب میں اسے تین قسطوں میں شائع کیا گیا تھا۔ (مرتب)

ملک زادہ منظور احمد کا خط

Department of Urdu
Lucknow University

Lucknow

۲۱/ مارچ ۱۹۹۰ء

برادرم ایوب واقف صاحب،

ریل میں فرصت اور فراغت کے لمحات میسر آئے اور میں نے آپ کی کتاب (یادِرفتگاں)[1] پڑھ ڈالی۔ کتاب اگر دلچسپ اور فکر انگیز نہ ہوتی تو شاید اکتا کر میں رکھ دیتا۔ مگر یہ صورت حال پیدا نہ ہوئی۔ حفظ مراتب اور احترام کے واجبات کا حق ادا کرتے ہوئے آپ نے جس طرح محاسن کو ابھارا اور معائب کی نشاندہی کی ہے اس کی داد نہ دینا، آپ کے ساتھ ظلم ہوگا۔

کسی مضمون میں آپ نے حاشیہ پر شبلی کالج کے استاد حفیظ بینائی[2] کا ذکر کیا ہے کہ وہ اعظم گڈھ سے علی گڈھ چلے گئے۔ میرے خیال میں یہاں پر آپ سے سہو ہوا ہے۔ وہ اعظم گڈھ سے ملٹری کالج کھڑک واسلہ گئے تھے۔ اور اب بھی وہیں ہیں۔ سفر زندگی کے معمولات میں شامل ہوگیا ہے۔ مئوناتھ بھنجن، غازی پور اور چتارا (اعظم گڈھ) کے لئے پابہ رکاب ہوں۔ رمضان ہم جیسے آوارگانِ شعر و ادب کے لئے اپنی تمامتر رحمتوں کے ساتھ، فرصت اور گھر پر قیام کا مہینہ ہوتا ہے اس وقت تفصیلات میں نہ جا کر اپنے تاثرات قلم بند کروں گا۔

کیا آپ کی نگاہ سے میری کتاب ''شہرِ سخن'' جو میں نے اعظم گڈھ کے دورانِ قیام میں لکھی تھی گذری ہے اس میں بھی اسی طرح کے مضامین ہیں۔ کتاب کی نیاز فتح پوری نے اپنے رسالے میں بڑی تعریف کی تھی۔ مرزا احسان بیگ، سلام مچھلی شہری، روش صدیقی وغیرہ پر اس میں مختصر مضامین ہیں۔ کتاب کی کوئی جلد میرے پاس نہیں ہے۔ اور اب تو وہ کمیاب کیا نایاب ہو چلی ہے۔ اس کی کتابت اور طباعت بھی شبلی منزل میں ہوئی تھی۔ مگر ناشر میں خود تھا۔ اگر کہیں مل جائے تو ضرور دیکھئے گا۔ کالج گرل (ناول) اور ''اردو کا مسئلہ'' (کتابچہ) کے بعد یہ میری تیسری تصنیف تھی جسے پسندیدگی سے دیکھا گیا۔

---

[1] ذکرِ رفتگاں کو غلطی سے یادِ رفتگاں لکھا گیا ہے۔ (مرتب)

[2] شبلی کالج کے میرے جغرافیہ کے استاد پروفیسر حفیظ صدیقی۔ انھیں ملک زادہ منظور احمد نے سہواً حفیظ بینائی لکھا ہے، وہ اعظم گڈھ سے پہلے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی ہی گئے تھے بعد ازاں ملٹری کالج کھڑک واسلہ گئے تھے۔ یہ وہی حفیظ صدیقی ہیں جنھوں نے علی گڑھ میگزین کا مجاز نمبر مرتب کیا تھا اور وہ بھی طالب علمی کے زمانے میں (مرتب)

خدا کرے آپ بخیر ہوں، کبھی کبھی خط لکھ دیا کیجئے۔ یہ بات تعلق خاطر کی بنیاد پر لکھ رہا ہوں۔ پتہ زیریں حاشیہ پر طبع ہے۔

خیر اندیش

ملک زادہ منظور احمد

ندا فاضلی کا خط

201, Sunrise.

Aram Nagar.

Versova

Mumbai 400061

ایوب واقف صاحب! آداب

آپ آئے اور چلے گئے لیکن آپ کے جانے کے بعد بھی کئی گھنٹے آپ کا ساتھ رہا۔ آپ کی کتابوں کے ساتھ جو وقت گذرا وہ بھی آپ کی شخصیت کی طرح کافی معیاری اور اعتباری تھا۔ آپ کی ادبی تحریروں سے تو شروع سے ہی واقف ہوں، آپ کے ذوق وشوق نے بار بار انسپائر کیا ہے۔ ''تعبیر وتشریح''[1] اور سہ ماہی انتساب میں شامل اکثر تحریروں کو میں پہلے بھی پڑھ چکا تھا پھر بھی ان کو ایک ساتھ (کتابی شکل) پڑھ کر اور اچھا لگا۔

آپ کے قلم کی تیز رفتاری اور ادبی زرخیزی قابل ستائش ہے۔ جس انہماک اور کشادہ مطالعہ سے آپ نے جو مسلسل کام کیا ہے وہ خاطر خواہ پذیرائی کا مستحق ہے۔ انتساب کا ایوب واقف نمبر خوب ہے۔ آپ کے مداحوں میں ادب کے بڑے بڑے ناموں کو دیکھ کر اچھا بھی لگا اور اس بات پر اعتبار بھی آیا کہ اچھا کام کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ آج کی پبلسٹی کے دور میں بھلے ہی مصلحت پسندیاں ابھر آئی ہوں لیکن سچا لفظ اور کھرا حرف بہت دیر تک نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ اس کا ثبوت آپ کی کتابیں اور یہ نمبر ہے۔

خدا آپ کو یوں ہی فعال رکھے۔

خیر طلب

ندا فاضلی

---

[1] محمد ایوب واقف کے تنقیدی وتحقیقی مضامین کا مجموعہ۔ (مرتب)

دیگر مکتوبات

بھائی سیفی سرونجی-آداب

انتساب کے دو شمارے نمبر54اور55 ملے۔ بے حد شکریہ۔ دونوں میں مضامین والے حصہ پسند آئے۔ میں نے بہت دلچسپی سے پڑھے۔اردو کی نئی بستیوں کے سیمینار میں آپ کا مقالہ بھی پڑھا۔ دریا کو کوزے میں بند کرنا بے حد مشکل کام ہے۔مگر جتنا بھی آپ نے Cover کیا اس سے زیادہ مختصر وقت اور صرف ایک مقالے میں نہیں ہوسکتا تھا۔یہاں ایک بہت بڑی تعداد اچھے شعراء کی فوت ہو چکی ہے نئے لکھنے والوں کا فقدان ہے۔مگر غنیمت ہے کہ ابھی اردو کا چراغ روشن ہے۔

نہ کام دیں گی یہ دم توڑتی ہوئی شمعیں
نئے چراغ جلاؤ کہ روشنی کم ہے

(شاہد صدیقی)

آپ بڑی محنت سے ایک اچھا اردو رسالہ نکالنے میں کوشاں ہیں رسالہ شب خون ختم ہوگیا۔اس میں لکھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ کریں۔

آپ کا

خاکسار مصطفیٰ شہاب

مکرمی ڈاکٹر سیفی سرونجی صاحب، تسلیمات،

امید کہ آپ مع الخیر ہونگے۔ میں بھی بحمد للہ ہر حال میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی شکر گزار ہوں۔انتساب کا شمارہ نمبر 56 نظر نواز ہوا۔آپ کے خاصہ معجز نما نے مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا فرما کے نہ صرف احسان کیا بلکہ دل باغ باغ ہوگیا۔ بھائی میں تو کوئی ڈاکٹر واکٹر نہیں ''مریض'' ہوں اب آپ کے قلم سے نکل گیا ہے تو اللہ آپ کے قلم کی لاج رکھے،اعزاز کے طور پر ممکن بھی ہے میری ایک کتاب ''سنگم'' جو دہلی سے شائع ہوئی ہے انہیں آپ کا پتہ دیا تھا اور ان کا کہنا ہے کہ کتاب ارسال کی گئی ہے لیکن آپ کی طرف سے رسید نہیں ملی۔خدا جانے آپ کو ملی بھی ہے یا نہیں۔

یہ جو انتساب میں ایک صفحہ پر پانچ اشتہار آتے ہیں فی اشتہار کیا قیمت ہے؟ لکھئے گا۔میں نے جو کتابیں برائے تبصرہ ارسال کی تھیں وہ بھی نہ جانے کیا ہوئیں اگر نہیں ملیں تو دو لائن لکھئے۔ دوبارہ کوشش کروں۔

ابھی تو میں ۹ نومبر کو کراچی-پاکستان جارہی ہوں۔ ڈھائی ماہ کے بعد واپسی ہوگی میں

اکثر باتیں، چیزیں بھول جاتی ہوں (سوائے اپنی تخلیقات کے) اس لئے عرض ہے کہ انتساب کا سال جب پورا ہوا کرے تو مجھے اشارہ کردیا کیجئے تا کہ اس کا زر سالانہ ارسال کرسکوں۔ بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔ ہندوپاک کے کئی رسالوں نے میری کتابوں پر تبصرے شائع کئے ہیں۔ میں چاہتی تھی کہ میری کتابوں پر بھی آپ تبصرہ فرمائیں۔ لیکن کتابیں آپ کو ملتی نہیں۔ کوشش کئے جاؤں گی، کبھی تو ملیں گی۔ اب پاکستان سے بھی بھیجنے کی کوشش کروں گی۔ غضب خدا کا بارہ کتابیں عالم وجود میں آگئیں اور آپ کو نہیں ملیں پھر ان کی اشاعت کا فائدہ ہی کیا۔ جب کسی مبصر کی نگاہ سے نہ گزرے۔ کچھ دن قبل آپ کو کچھ کلام ارسال کیا تھا انتساب کے لئے مل گیا ہوگا۔ اس خط کے ساتھ کچھ اور تازہ کلام بھیج رہی ہوں۔ پسند آئے تو شائع فرمادیں۔ میرے دو پتے ہیں۔ ایک خط پر۔ دوسرا لفافہ پر۔ آپ جس پر بھی لکھیں گے مجھے مل جائیگا۔ یہ نعت جو آپ کو بھیج رہی ہو مجموعہ نعت" نانو میں ہفت رنگ" میں چھپ چکی ہے لیکن کسی رسالہ میں شائع نہیں ہوئی۔ انتساب میرا پسندیدہ رسالہ ہے چاہتی ہوں کہ اس میں ضرور چھپ جائے اور یہ غزل بھی ابھی کہیں شائع نہیں ہوئی تازہ ترین ہے۔

میں رسائل میں کلام بھیجنے میں بہت ست ہوں لیکن لکھنے میں چست ہوں بس لکھے جاتی ہوں۔ ایک بار ابھی کچھ عرصہ قبل پاؤں میں فریکچر ہوگیا کاسٹ لگا تو بچے فیشن کے مطابق اس پر سائن کرنے اور کچھ لکھنے لگے۔ ایک بھانجی نے پوچھا خالہ جان اپنا کوئی شعر بتائے وہ لکھوں۔ میں نے فی البدیہہ ایک شعر کہہ دیا کہ

قدم چلیں نہ چلیں زندگی کی راہوں پر
یہی بہت ہے ابھی تک قلم تو چلتا ہے
(اب اس پر پوری غزل کہہ لی ہے)

تو بھائی۔ جب تک قلم چلتا ہے سانس چلتی ہے سانس کے ساتھ قلم کا سب سے بڑا تعلق ہے ہاتھوں میں آرتھرائٹس ہے دعا کرو کہ ہاتھ لکھنے سے اور دماغ شعر کہنے سے معذور نہ ہو کہ یہی تو بس زندگی ہے ورنہ پھر کیا رکھا ہے۔ اگر میں اپنی کتابوں کی رونمائی کی تصاویر بھیجوں تو کیا انہیں انتساب میں جگہ ملے گی؟ اور بہت سے مشاہیر نے جو مضامین لکھے ہیں وہ.......؟؟؟

اچھا بھئی اب رخصت۔ والسلام

رشیدہ عیاں

حبیب مکرم سیفی سرونجی صاحب، سلام ورحمت

"انتساب" کا خوبصورت شمارہ 56 ملا۔ دلی شکریہ قبول کیجئے۔ نظم کی اشاعت کے لئے بھی

تہہ دل سے ممنون ہوں۔ فارسی کا ایک مقولہ ہے "عطر آں است کہ خود بوید نہ کہ عطار گوید" سہ ماہی "انتساب" کے علمی وادبی کوائف بھی محتاج بیان نہیں ہیں۔ البتہ آپ یہ جریدہ جس جوش وجذبہ، ذوق وشوق بلکہ محنت اور لگن سے زیور طبع سے آراستہ کرتے ہیں، اس کی تحسین نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ میں نے جب پہلی مرتبہ "انتساب" کے اوراق پر نظر ڈالی تھی تو مشمولات کے تنوع پر عش عش کر اٹھا تھا۔ ایک ادبی پرچے میں کم وبیش تمام اصناف ادب کو نمائندگی دینا ایک مشکل کام ہے، مگر آپ یہ مشکل کام پابندی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ زیر نظر شمارہ 56 ہی کو لے لیجئے۔ حمد، نعت، مضامین، افسانے، غزلیں، نظمیں، ماہیے، قطعات، کہہ مکرنیاں، تبصرے، رپورٹیں، مکتوبات غرض کیا کچھ اس میں نہیں ہے۔ بلاشبہ "انتساب" ایسے معدودے چند جرائد میں سے ایک ہے جو مشمولات کی رنگارنگی اور تنوع کے سبب ایک الگ پہچان رکھتے ہیں آپ کا اپنا تخلیقی کام بھی سراہے جانے کے لائق ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کی توفیقات میں اضافہ کرے۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

نیاز مند

قیصر نجفی

محترمی ڈاکٹر صاحب، سلام ورحمت،

بڑی سے بڑی تفصیل کو غزل کے ایک مصرعے میں آمد کی روانی کے ساتھ کس طرح بیان کیا جاسکتا ہے یہ محترم رفعت سروش کی غزل کے مطلع کے اس مصرعے میں بڑی وضاحت سے نظر آتا ہے۔ "نئی جنتوں کی تلاش میں میں جہنموں سے گزر گیا"۔ "فریب خوردہ آگہی" "واہموں کے حصار" "قلم کا سفیر" اور "سفر نصیب" جیسے فقروں اور ترکیبوں سے مزین رفعت صاحب کی غزل بڑی ہی خوبصورت ہے۔ قیصر نجفی کی "ساجھے قہقہوں اور ساجھے آنسوؤں" کی نظم میں زندہ رہنے کا ایک نیا طور، ایک نیا شعار بڑے خلوص اور بڑی اپنائیت سے آواز دے رہا ہے۔ اظہر جاوید کی ایک غزل کا یہ شعر بھی بہت کچھ کہتا ہے:

اس طرح توڑو تعلق اس طرح چھوڑو مجھے
ہم اگر بچھڑیں تو پھر بھی دوستی باقی رہے

تضاد کس طرح شعر کو حسن عطا کرتا ہے یہ محمد ممتاز راشد کی گیارہ اشعار کی غزل کے ہر شعر سے عیاں ہے۔ اس بار آپ نے بہت ہی طاقتور غزلوں کا انتخاب کیا ہے۔ فرداً فرداً ہر غزل پر تبصرہ ممکن نہیں، صرف اتنا ہی کہوں گا کہ رفعت سروش، اظہر جاوید، محمد ممتاز راشد کی غزلوں کے علاوہ سوہن راہی،

حنیف ترین اور دشان بھارتی کی غزلیں خاص طور سے متاثر کرتی ہیں۔ مضامین میں " مابعد جدیدیت اور گوپی چند نارنگ" اور ارشد اقبال آرش کا " تیسری بڑی اور رابطے کی زبان بہت اچھے ہیں۔

اللہ آپ کو اچھا رکھے

خیر اندیش

اقبال انصاری

ڈاکٹر سیفی صاحب، السلام علیکم

آپ کی محبتوں سے مجھے الگ مت رکھئے گا۔ آج " انتساب" ملا تو گویا آپ سے گلے ملنے کا لطف آیا۔ آپ نے برطانیہ میں اردو غزل کے حوالے سے خوب جائزہ لیا ہے بھئی آپ نے ان لوگوں کو قریب سے دیکھا ہے۔ شخصی ملاقاتیں رہی ہیں برطانیہ کے دورے آپ نے کئے ہیں۔ بہر حال اچھا جائزہ ہے۔

ڈاکٹر بشیر بدر کا خط بھی مزے کی چیز ہے۔ بقول خیر معاملہ یہ ہے کہ

سوائے میرے اگر سب دکھائی دیتا ہے

تو آئینہ ہے غلط کار زاویے سے مرے

ان کے اشعار اچھے ضرور ہیں مگر اچھے اشعار تو آپ ہم بھی کہتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ ان کی تشہیر جیسی وہ کرتے ہیں، ہم نہیں کر پاتے۔ مجتبیٰ حسین پر آج کل بہت لکھا جا رہا ہے لکھا بھی جانا چاہئے انہوں نے اپنے آپ کو منوایا ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے عالمی سیمنار کی روداد آپ کے قلم سے پڑھ کر ایسا لگا جیسے ہم بھی اس سیمنار میں شریک رہے ہیں۔

یہ آپ نے سید جعفر امیر کو خوب ڈھونڈ نکالا! کیسے کیسے قد آور کیسی خاموش خدمت کئے جا رہے ہیں۔ تبصرے " انتساب" کی جان ہوا کرتے ہیں کتاب پڑھنے کی ترغیب ہوتی ہے۔ میں اپنی تازہ کتاب " دکن کے رتن اور ارباب فن" کی دو جلدیں آپ کی نذر کر رہا ہوں۔ تبصرہ فرما کر ممنون فرمائیے گا۔

آپ کا

رؤف خیر

پیارے بھائی سیفی سرونجی، سلام و رحمت

انتساب کا شمارہ 53 نظر نواز ہوا۔ بشیر بدر کی غزلوں کا انتخاب عمدہ کیا۔ سیدہ نسرین نقاش کی دونوں غزلیں اچھی لگیں۔" اطلاعاتی تنقید نئے تقاضے" عالمانہ تحریر ہے اور اس میں تسطیر کے اداریے کا حوالہ بھی برمحل ہے۔ لندن کے سفر میں نوٹنگھم کے شعراء کا ذکر جس محبت سے کیا ہے اس کے لئے شکریہ۔

عرعر سعودی عربیہ میں یوم سرسید کی رپورٹ کا یہ جملہ شاید آپ کی نظر سے نہیں گزرا۔
''ڈاکٹر حنیف ترین نے اپنی تازہ تخلیق 'باغی بچے' ہوتے ہیں پیش کر کے محفل کو زعفران زار کر دیا۔''
ڈاکٹر حامدی کاشمیری غزل بھی اچھی کہتے ہیں اور تنقید میں بھی بلاشبہ بلند مقام رکھتے ہیں موصوف کی نئی کتاب ''تجربہ اور معنی'' پر آپ کا تبصرہ پڑھ کر اب کتاب پڑھنا بھی لازم ہو گیا ہے۔
فرزانہ نیناں کے شعری مجموعہ ''درد کی نیلی رگیں'' کی تقریب رونمائی میں پڑھا گیا مختصر سا مضمون ارسال خدمت ہے۔ میرا تازہ کلام اور پوسٹل آرڈرز بھی۔ والسلام

نیاز مند
احمد مسعود

محبِ من سیفی صاحب، سلام وخلوص
خدا کرے آپ معہ فیملی بخیر ہوں، غزل شائع کی اس کے لئے صمیم قلب سے مشکور ہوں یار گزشتہ چند شماروں میں بعنوان گوشہ جو ایک تخلیق کار کا کلام پڑھنے کو مل رہا ہے اس سے بڑا محظوظ ہوتا ہوں اور تخلیق کار کے کلام کا رنگ و آہنگ بھی پتہ چل جاتا ہے بڑا معلوماتی و مفید حصہ ہوتا ہے شمارے کا اسے جاری رکھئے۔
''انتساب'' میں ویسے تو سارا مواد میری مراد بھی مشمولات فکر انگیز معنی خیز اور وقیع ہوتے ہیں لیکن زیر نظر شمارہ میں ''سید معراج جامی کی غزل گوئی'' اور ''منور ہاشمی کی غزلوں میں جہاں تو'' نے زیادہ متاثر کیا۔ کیفی سنبھلی کا تیسرا اور عبدالحنان تبسم کی غزل کا چھٹا شعر پسند آئے ویسے دیگر شعراء کی غزلیں بھی اچھی ہیں۔
ایم پی اردو اکیڈمی بھوپال کے پرچے سہ ماہی ''تمثیل'' کے شمارے اکتوبر تا دسمبر 2004 میں میرا ایک مضمون بھوپال کے منفرد شاعر مقصود عرفان مرحوم پر چھپا ہے ان کی یاد میں پروگرام ہونے کی بات ہوئی تھی لیکن نہ ہو سکا۔ مرحوم کی غزل کے شعر

جنونِ شوق نے تیری طرف بانہیں تو پھیلا دیں
خرد بڑھ کر زمانے کی خبر لائی تو کیا ہوگا

کے مصرع ثانی کو طرح مان کر میں نے غزل کہی ہے پروگرام ہوتا تو پڑھنے کی تمنا پوری ہو جاتی اب یہ غزل آپ کو ارسال کر رہا ہوں امید ہے کہ آگے کسی شمارے میں چھپ جائیگی۔ آپ نے سرونج میں بشیر بدر صاحب کا استقبال کرا ہی دیا مصلحتاً بہر حال ٹھیک ہے وقت کے ساتھ چلنے میں ہی فائدہ ہے۔ باقی پھر بھوپال میں ملاقات پر۔ فقط

خلوص کیش

سید ابرار نغمی

محترمی سیفی سرونجی صاحب، السلام علیکم

"انتساب" کا شمارہ نمبر 55 موصول ہوا۔ جس میں سید جعفر امیر صاحب کا گوشہ ہے۔ خوبصورت سرِ ورق کے ساتھ دل پذیر تحریریں بھی ہیں امیر صاحب سے فون پر بھی بات ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے آپ کو مزید رقم بھیج دی ہے۔ امید ہے آپ نے انہیں پرچے ارسال کر دیئے ہوں گے۔

سیفی صاحب! اپنے قارئین کے ساتھ روابط اچھے رکھئے بزنس کا اور صحافت کا دونوں کا اصول ہے یہ خوشگوار تعلقات ایک پرچے کی کامیابی کے لئے بہت ضروری ہیں۔ آپ کے لئے اپنے دو تذکرے۔ سخن حد پنجم اور گفتنی دوم محفوظ رکھے ہیں کسی ہندوستان آنے والے سے بھجوادوں گی۔ آپ کا برطانیہ آنے کا پروگرام کب ہے؟

'انتساب' کے لئے ایک غزل اور ایک نظم ارسال ہے۔ پسند آئے تو شریکِ اشاعت کرلیں۔ تعاون کے لئے شکریہ۔ ایک نظم جاوید صاحب کی بھی منسلک ہے۔

والسلام

سلطانہ مہر

پیارے سیفی بھائی! السلام علیکم

"انتساب" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس کرم فرمائی کے لئے تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ پرچہ بہت خوبصورت ہے اور سبھی مشمولات عمدہ اور معیاری ہیں۔ جیسا کہ میں نے آپ کو فون پر بتایا تھا۔ میں قریب ایک ماہ سے علیل ہوں مجھے ذیابیطس کے ساتھ ساتھ Prostrate یعنی پیشاب کی مشکل نے آدبوچا ہے۔ اس کا علاج صرف آپریشن ہے جو نومبر کے آخری ہفتہ میں ہوگا۔ پیشاب کی ایک نالی اور بیگ لگنے کی وجہ سے زیادہ چل پھر نہیں سکتا اور نہ ہی کوئی ادبی و تخلیقی کام ہو رہا ہے۔ اللہ سے دعا کریں کہ میں جلد صحتیاب ہو جاؤں۔

آج آپ کو فون پر سب باتیں بتانے کی کوشش تو کی تھی مگر موسم کی خرابی کے باعث فون کٹ جاتا تھا اس لئے بذریعہ خط سب اطلاع دے رہا ہوں۔ میرے افسانوں کا تیسرا مجموعہ تیار ہے۔ اگر آپ اسے شائع کرنا چاہیں تو میں مسودہ بھیج دوں گا۔ اس میں قریب پندرہ افسانے ہوں گے اور چند نامور ادباء کے مضامین بھی اس میں شامل کئے جائیں گے۔ آپ سے بھی گزارش ہے کہ آپ میرے افسانوں کو پڑھ کر ایک جامع مضمون ضرور تحریر کرلیں تاکہ کتاب میں شامل کیا جائے۔

ساحر شیوی صاحب نے مجھ پر ایک بڑا عمدہ مضمون قلم بند کیا ہے جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اگر ممکن ہو تو کتاب میں شامل کرنے سے پہلے آپ اسے ''انتساب'' کے آنے والے کسی شمارے میں شامل کرلیں ممنون ہوں گا۔ اس کے ساتھ ہی ایک افسانہ اور ایک غزل ارسال کر رہا ہوں۔ جب بھی دل چاہے آپ انہیں شاملِ اشاعت کرلیں۔ میرے آنے والے تیسرے افسانوی مجموعے کی ضخامت ڈیڑھ سو سے ۲۰۰ صفحات تک ہوگی اور قریب تین سو کتابیں شائع ہونی چاہئیں۔ آپ تحریر کریں کہ اس پر کتنی لاگت آئے گی سوہن راہی پر جو کتاب آپ نے شائع کی ہے اس کا ایک نسخہ بھیج دیں تو زیر باراحسان ہوں گا۔ آسیہ بھابی کو ہم دونوں کا آداب اور بچوں کو بہت بہت پیار دیں۔ لندن سے کسی چیز کی ضرورت ہو تو ضرور لکھیں۔

نیا مند
گلشن کھنہ

محترم ڈاکٹر سیفی، السلام علیکم

امید ہے بخیر ہوں گے کچھ عرصہ قبل انتساب کا شمارہ 55 موصول ہوا تھا۔ میرا افسانہ ''بوڑھا اور تنہائی'' شامل کرنے پر ممنون ہوں۔ میری کتاب کا اشتہار شائع کرنے کا بھی شکریہ اب میری کتاب کی اطلاع وسیع حلقے تک پہنچ چکی ہوگی۔

زیر نظر شمارے میں خاص طور پر افسانے (میرے افسانے کے علاوہ) تخلیقی فن پارے ہیں مضامین میں تفہیم شعر غالب اور ذکر خیر مجتبیٰ حسین دلچسپ مواد کی وجہ سے اپنے آپ کو پڑھوا لیتے ہیں۔ اتفاق سے میں صاحب گوشہ سے واقف نہیں ہوں۔ اس میں خود میری نااہلی ہے کتابوں پر تبصروں کا حصہ بھی مضبوط ہے۔ ہر کتاب پر سیر حاصل گفتگو ہے۔

میرا ایک اور افسانہ ''سایہ'' آپ کے پاس موجود ہے۔ اس کے متعلق آپ نے مطلع کیا تھا کہ قریبی اشاعت میں شامل کرلیا جائیگا۔ پتہ نہیں وہ شائع ہوا یا نہیں اگر چھپ چکا ہے تو مذکورہ شمارہ بھجوایئے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمایئے۔

نیازمند
طاہر نقوی

محب مکرم ڈاکٹر سیفی سرونجی صاحب، سلام ورحمت

''انتساب'' کا شمارہ 56 ڈاک سے ملا شکر گزار ہوں۔ شمارہ معیاری اور دیدہ زیب ہے گٹ اپ بھی بہت دلکش ہے کاغذ عمدہ ہے اور کمپیوٹر سے طباعت کے باعث اغلاط بھی بہت کم ہیں۔

رسالے کا معیار پہلے سے زیادہ بلند ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے حوصلے بلند رکھے۔ سرونج جیسے چھوٹے سے اور دور افتادہ شہر سے شائع ہونے والے اس رسالے کی شہرت برصغیر ہندو پاک کے علاوہ مغربی ممالک میں بھی پھیل گئی ہے۔ آپ نے انتساب کے خصوصی شمارے بھی شائع کئے ہیں جو معیار کے اعتبار سے بہت وقیع اور اہم ہیں بشیر بدر نمبر، ندا فاضلی نمبر، انور شیخ نمبر وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ رسالے کے ساتھ ساتھ آپ نے ادبی حلقوں میں اپنا بھی مقام پیدا کیا ہے۔ زیر نظر شمارے میں مابعد جدیدیت اور پروفیسر نارنگ (سیفی سرونجی) اور کلاسیکیت ترقی پسند اور جدیدیت (پروفیسر عتیق اللہ) بہت اہم اور قابلِ مطالعہ مضامین ہیں۔ رسالے کی درازیِ عمر کے لئے دعا گو۔ آپ کے لئے یہ بات بھی قابل تعریف ہے کہ رسالے کو صفِ اول کے قلم کاروں کا تعاون حاصل ہے۔

امید ہے آپ شاد اور شگفتہ ہوں گے۔

نیاز مند

احتشام اختر

برادرم سیفی جی، آداب

مشکور ہوں کہ آپنے مجھے ''سیفی سرونجی شخصیت اور فن'' کتاب سے نوازا۔ قریب قریب پوری کتاب پڑھ گیا ہوں۔ اس بات کو لیکر میں حاسد ہوں کہ اتنے زیادہ لوگ آپ کو کیوں پیار کرتے ہیں خدا کرے میری (میرا) حسد اور بڑھے۔

محترم توفیق صاحب کو خدا نے یہ توفیق دی کہ انہوں نے اس کتاب کو مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ میری نظر میں یہ کتاب سیفی کے بہانے ہم عصر اردو ادب کا ایک اچھا مطالعہ بن گئی ہے۔ کتاب میں ۱۰۰ سے زیادہ تحریریں شامل ہیں اور (میری سطریں چھوڑ کر) یہ تحریر سیفی کی تخلیقی صلاحیت کو لیکر ایک نیا اینگل پیش کرتی ہے۔ پورا یقین ہے کہ یہ کتاب قارئین کے بیچ سراہی جائے گی۔ توفیق صاحب نے خاکسار کو لیکر جو کچھ لکھا ہے اس سے میری حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ یہ فوٹو کاپی محفوظ رکھوں گا۔ معلوم ہوا کہ اب آپ منظر بھوپالی پر ''انتساب'' کا خاص نمبر پلان کر رہے ہیں۔ امید کہ آپ خیریت سے ہیں۔

مخلص

آپ کا

جانکی پرشاد شرما

محترمی سیفی سرونجی صاحب، سلام علیکم،

میں معذرت خواہ ہوں، انڈیا سے واپس ہونے کے بعد مجھے "انتساب" کے تین شمارے وصول ہوئے۔ مجھے بہت پہلے آپ کو شکریہ کا خط بھیجنا چاہیے تھا۔ آپ سے دہلی میں شرف ملاقات نصیب ہوا تھا۔ سیمینار کے بعد میں بھوپال (اور پھر لکھنؤ، علی گڑھ، رام پور) گیا۔ میرے کرم فرما پروفیسر آفاق احمد کے "گل کدہ" میں ان کی اور ڈاکٹر بلقیس احمد کی مہمان نوازی کی مہکوں سے محظوظ ہوتا رہا۔ لیکن وہاں آپ سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ آفاق صاحب نے بھوپال اور سرونج کی خیریت سے مجھے آگاہ کیا تھا۔ میں نے حال میں اپنی نئی تصنیف مکمل کی ہے۔ "گر برا نہ مانیں" دہلی میں زیر اشاعت ہے، یہ تحریر ایک سفرنامہ، رپورتاژ، مشاہدات اور تاثرات کا مجموعہ ہے۔ نفس مضمون ہندوستان اور اس کی تاریخی زمینیں ہیں۔ آپ کا "انتساب" مجھے بے حد پسند آیا، میری نظر میں وہ انتہائی معیاری، مبسوط اور مربوط مجلہ ہے۔ مضامین کا تنوع اور ان کی ہمہ گیریت یقیناً قابل ستائش ہے۔ مضامین، خصوصاً آپ کی نارنگ صاحب کے کاموں سے متعلق نگارشات نہایت موثر ہیں۔ اگر میں کہہ سکوں، کہانیوں یا فکشن کا حصہ شعری ادب کے مقابلے میں نسبتاً کمزور ہے۔ ایک آدھ اور بات، آپ نے ایک شمارہ میں "اردو کی نئی بستیاں" کی روداد فراہم کی ہے، میری کتاب میں بھی اس کا تفصیلی ذکر ہے لیکن وہ آپ کے جائزے سے قدرے مختلف ہے۔ آپ، ایسا لگتا ہے، بشیر بدر صاحب کے .P.R کے ذمہ دار ہیں۔ یا تو وہ آپ کے پروٹے زے (Protege) ہیں یا آپ ان کے بہت بڑے مداح۔

بھائی یہ "مٹھی بھر غزلیں" کیا شے ہوتی ہے؟ ان کے فراہم کیے ہوئے 'شہ پارے' کبھی بے معنی کہیں بے تکے اور کہیں مہمل نظر آتے ہیں۔ "اس کے چاروں طرف سمندر ہے"، "دل بڑی خوشنما عمارت ہے (یا ریاست) ہے۔ میں کونسا شعری حسن چھپا ہوا ہے جس کی گہرائی تک پہنچنے سے میں قاصر رہا۔

روٹیاں کچی پکیں، کپڑے بہت گندے دُھلے
مجھ کو پاکستان کی اس میں شرارت سی لگی

اس احمقانہ شعر کی "انتساب" میں اشاعت نے اس کے معیار کو مجروح کیا ہے۔ تاہم دوسرے شمارے میں آپ نے شاہد عزیز کا خط چھاپ کر اس نادانستہ چوک کا ازالہ کیا ہے۔ آپ "انتساب" میں دنیا جہاں کی ادبی خبروں کو چھاپ کر ایک احسن خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں، بر سبیل تذکرہ، میں مطلع کرنا چاہوں گا کہ مجھ ناچیز کے "غالب کدہ" میں گزشتہ ۲۰ سالوں سے ایک بیادِ غالب سالانہ طرحی مشاعرہ ہوتا ہے جو ساری اردو دنیا میں صرف غالب اکیڈیمی کینیڈا کرواتی ہے۔ ان مشاعروں میں مقامی شعرا کے علاوہ برصغیر کے تقریباً تمام ممتاز شعرا نے گاہے بگاہے شمولیت کی ہے۔

ہمارے شہر (جسے میں نے "شہر اردو" کے نام سے جگہ جگہ متعارف کروایا ہے) ٹورانٹو کی اہم اور بزرگ ترین شخصیت (جو دراصل اور تہذیب کی آخری نشانی تھے) شان الحق حقی صاحب کی رحلت پر یہاں ایک تعزیتی جلسہ ہوا تھا۔ ساتھ ہی ان کی ایک غزل کی زمین پر طرح مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ ان کا مصرع تھا "چاندنی رات میں دریا کا سماں ہو جیسے" اس پر میں نے طبع آزمائی کی تھی، وہ میں "انتساب" کے لئے بھیج رہا ہوں۔

اپنی کتاب کو حاصل کرنے اور اسے مختلف ادبی اداروں اور شخصیات تک پہنچانے کے لیے میں انشاء اللہ دسمبر کے آخر میں ہندوستان آرہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ بعافیت اور صحت ہوں گے۔

اطہر رضوی، کینیڈا

محترمی سیفی سرونجی صاحب،

تسلیمات

آپ کا نوازش نامہ اور ساتھ میں ایوب واقف نمبر ملا۔ شکریہ۔ یہ نمبر بہت سے جامع مقتدر اور معلومات افزا مضامین سے مزین ہے۔ آپ نے اسے نہایت مہارت سے محنت اور کاوش کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ اتنے سارے نامور ناقدین اور مصنفین کے ایسے ایسے گراں قدر مضامین حاصل کر کے انہیں ایسے سلیقے سے ترتیب دے کر یکجا کیا ہے کہ وہ ایک تاریخی دستاویز بن گیا ہے۔ بلاشبہ یہ آپ کا بے مثال کارنامہ ہے۔

اس خاص نمبر میں محمد ایوب واقف کی گراں مایہ ادبی خدمات کے علاوہ ان کی حیات اور شخصیت پر بھی وافر اور مستند مواد ہے۔ اس سلسلے میں "ایک کامیاب زندگی کی سرگزشت" آپ کا تحریر کردہ بایو ڈیٹا اور ساتھ میں خود ایوب واقف کے قلم سے اُن کا نسب نامہ اُن کی حیات کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں۔

آپ کا مضمون "میرے کرم فرما ایوب واقف" اُن کی شخصیت کے حسین پہلوؤں کو روشن کرتا ہے۔ اسی طرح ایوب واقف کا انٹرویو اُن کے نظریہ حیات اور ادب میں اُن کے زاویہ نگاہ کی وضاحت کرتا ہے۔ اُن کی اہلیہ محترمہ صفیہ ایوب کا مضمون "میرے شوہر ایوب واقف" بے حد پُر اثر اور جذباتیت سے بھرپور ہے جس سے ایوب واقف کی شخصیت کے خوبصورت اور دلفریب پہلو تو روشن ہوئے ہی ہیں محترمہ کے پُر خلوص اظہار پر آنکھیں چھلک اٹھیں۔ اس کے علاوہ کیفی اعظمی، عبدالستار دلوی، محمد متین ندوی، محمد توفیق خاں، ڈاکٹر تاراچند رستوگی، مولانا مستقیم احسن اعظمی، ڈاکٹر رفعت اختر کے تاثراتی مضامین بھی ایوب واقف کی شخصیت اور فطرت کی جاذبیت، سادگی اور خلوص سے واقف کرواتے ہیں۔

جہاں تک اُن کی علمی و ادبی خدمات کا تعلق ہے، اس نمبر میں اُن کی سبھی اہم تصانیف پر بھرپور تبصرے شامل اشاعت ہیں۔

اُن کی ایک اہم کتاب ''ذکر رفتگاں'' پر جگن ناتھ آزاد مرحوم کے دو مضامین علی سردار جعفری، وامق جونپوری، رفعت سروش، اعجاز مدنی وغیرہ جیسے نامور ناقدین کے بے حد جامع اور سیر حاصل مضامین اس نمبر میں موجود ہیں۔ جن میں ایوب واقف کی بے لاگ تنقید اور کتاب میں شامل قابل قدر تحریروں پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ ناقدین کی نگاہ میں اس کتاب کی قدر و قیمت اور اہمیت سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کی کتاب ''تعبیر و تشریح'' پر بھی کئی معیاری تبصرے شامل اشاعت ہیں۔ اس میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کا مقالہ ''محمد ایوب واقف تعبیر و تشریح کے دریچے سے'' خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں کتاب کے تقریباً تمام مضامین کے مواد ان کی تحقیقی و تنقیدی اہمیت حوالوں کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ قوی صاحب نے ایوب واقف کے مدلل طرز بیان کی سادگی صدق گوئی اور تنقید کے اعلیٰ معیار پر بھرپور تبصرہ کیا ہے۔ اور اس کتاب کی افادیت کو واضح کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب پر اعجاز مدنی، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر عبدالوہاب، پروفیسر خورشید نعمانی، پروفیسر عبدالحی رضا اور ڈاکٹر سیفی سرونجی کے بے حد گراں قدر مضامین شامل ہیں جو اس کتاب کے کسی نہ کسی اہم پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اسی طرح ان کی تیسری تحقیقی و تنقیدی کاوش ''شعور و ادراک'' پر بھی کئی اہم تبصرے شامل ہیں۔

بحیثیت مجموعی اس نمبر میں ''محمد ایوب واقف'' کے فن اور شخصیت کے ساتھ پورا انصاف کیا گیا ہے۔ حالانکہ اُن کی قد آور شخصیت جو بیک وقت محقق، ناقد ہی نہیں ایک صاحب کردار استاد کی بھی بیش بہا خوبیوں سے معمور ہے مزید ضخامت کا تقاضا کرتی تھی لیکن اس نمبر کے مضامین باوجود اختصار کے اپنے اعلیٰ معیار جامعیت، متوازن اور بے لاگ تنقید کے سبب تشنگی کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ ایسے گراں قدر مضامین کے حصول اور ان کی بہترین ترتیب و تزئین نیز کافی تعداد میں دلآویز تصاویر کی اشاعت کے لئے آپ ایک بار پھر مبارکباد قبول کریں۔

امید ہے کہ منظر بھوپالی پر انتساب کا نمبر بھی ایسا ہی گراں مایہ ہوگا۔ آپ کے حکم کی تعمیل میں منظر بھوپالی پر مضمون جلد سے جلد بھیجنے کی کوشش کروں گی۔

آپ کی بہن

ارجمند بانو افشاں

شعبہ اردو حمیدیہ کالج، بھوپال

لندن میں مقیم اردو کے منفرد شاعر اور نامور افسانہ نگار

گلشن کھنہ

کے شاہکار افسانوں کا تیسرا مجموعہ

کھوئی ہوئی جنت

طباعت کے زیور سے آراستہ ہوکر عنقریب منظر عام پر آرہا ہے، مایوسی سے بچنے کے لیے اپنی کاپی آج ہی محفوظ کرالیں

ناشر: انتساب پبلی کیشنز، سیفی لائبریری، سرونج (ایم. پی.)

سالنامہ بیباک 2006

مدیر: ہارون بی. اے.

اجراء جشن بیباک کی تقریبات جنوری 2006 میں۔ ملک کے ممتاز ادباء و شعراء کی تخلیقات سے مزین اس سالنامے کی کاپیاں محفوظ کرلیں۔ ملک بھر کے ایجنٹ و بک سیلرس رابطہ قائم کریں۔

صفحات: 250، خوبصورت طباعت، رنگین ملٹی کلر ٹائٹل، قیمت صرف 50 روپے

زر سالانہ 100 روپے بھیجنے پر سالنامہ مفت پیش کیا جائے گا

پتہ: منیجر "بیباک ویکلی" 18/6/12، آگرہ روڈ، مالیگاؤں-423203

انور شیخ کی مطبوعہ کتابیں

فلسفہ ازدواج، رازِ حیات، جہاد بالسیف، رب اسلام، اقبال ایک اسلام شکن شاعر، اقبال اور تضحیک وطن، اقبال غارت گر ملت، اقبال کا نظریہ عقل و عشق، فکر اقبال پر ایک تنقیدی نظر، فتنہ قادیانی، غزالہ، منظومہ، نبض جہاں، آگ اور پانی، راز و نیاز، سوز و ساز، نوائے دل، غبار دل، شریہ دل، خارِ دل، قرارِ دل، اسرارِ دل

Taxation and Liberty, Externity, Faith And Deception, Islam The Arab Nationalism, Islam Sex And Vio l lence, The Tale of Two Gujrati Saints, Islam and Human Rights, Is Islamic Law A Factor Fiction. This is Jehad, Sexual Conflict, Mother India and The Vedic Principle of Power, The Vedic Civilisation,

The Principality Publishers, Post Box No.918,
Penarth Road, Post Office CARDIFF CF5 2NL (U.K.)

سیفیؔ سرونجی کی کتابیں

۱- روشن الاؤ شعری مجموعہ Rs.100/-

۲- ایک لمحہ ایک خواب ۔ Rs.100/-

۳- ناؤ سمندر موجیں ۔ Rs.150/-

۴- ہم رہ گئے اکیلے، کہانیاں

۵- ہم بھی ایڈیٹر بن گئے، انشائیے

۶- سیفی سرونجی، ایک مطالعہ مرتب انیس دہلوی

۷- سرونج سے لندن تک سفرنامہ Rs.100/-

۸- جنگل کا نئے دھوپ، دیوناگری Rs.100/-

۹- رنگ اور خوشبو، دیوناگری Rs.50/-

۱۰- رنگوں کا امتزاج، مضامین Rs.100/-

۱۱- گنبد خضرا- نعتیہ کلام Rs.50/-

۱۲- سیفی سرونجی شخصیت اور فن
مرتبہ محمد توفیق محمد خاں Rs.500

۱۳- گاؤں کا مسافر

۱۴- انور شیخ اور انکے کارنامے Rs.100/-

۱۵- عاصی کاشمیری اور انکی شاعری Rs.100/-

۱۶- انور شیخ ایک مقبول شاعر Rs.100/-

۱۷- گلشن کھنہ، شخصیت اور فن Rs.100/-

۱۸- سیفی سرونجی- ایک تنقیدی نظر Rs.150/-

۱۹- فن اور فنکار ابراہیم اشک

۲۰- منفرد گیتوں کا خالق- سوہن راہی

۲۱- لندن کا تیسرا سفر (ہندی)

غیر مطبوعہ

گوپی چند نارنگ اور اردو تنقید

ساحر شیوی کے ادبی کارنامے

خالد محمود مشاہیر کی نظر میں

نئی غزل نئے امکانات

اردو کی نئی بستیاں

صلاح الدین پرویز بحیثیت نظم نگار

سہ ماہی انتساب کے خصوصی نمبر

بشیر بدر نمبر	Rs.500/-
خالد محمود نمبر	Rs.500/-
ظفر گورکھپوری نمبر	Rs.250/-
ابراہیم اشک نمبر	Rs.100/-
ندا فاضلی نمبر	Rs.200/-
وقار فاطمی نمبر	Rs.100/-
محمد ایوب واقف نمبر	Rs.200/-
محمد ممتاز راشد نمبر	Rs.50/-
قاضی مشتاق احمد نمبر	Rs.200/-
انور شیخ نمبر	Rs.200/-

رابطہ: سہ ماہی 'انتساب'، سیفی لائبریری، سرونج (ایم. پی.) 484224
فون:07591-253819



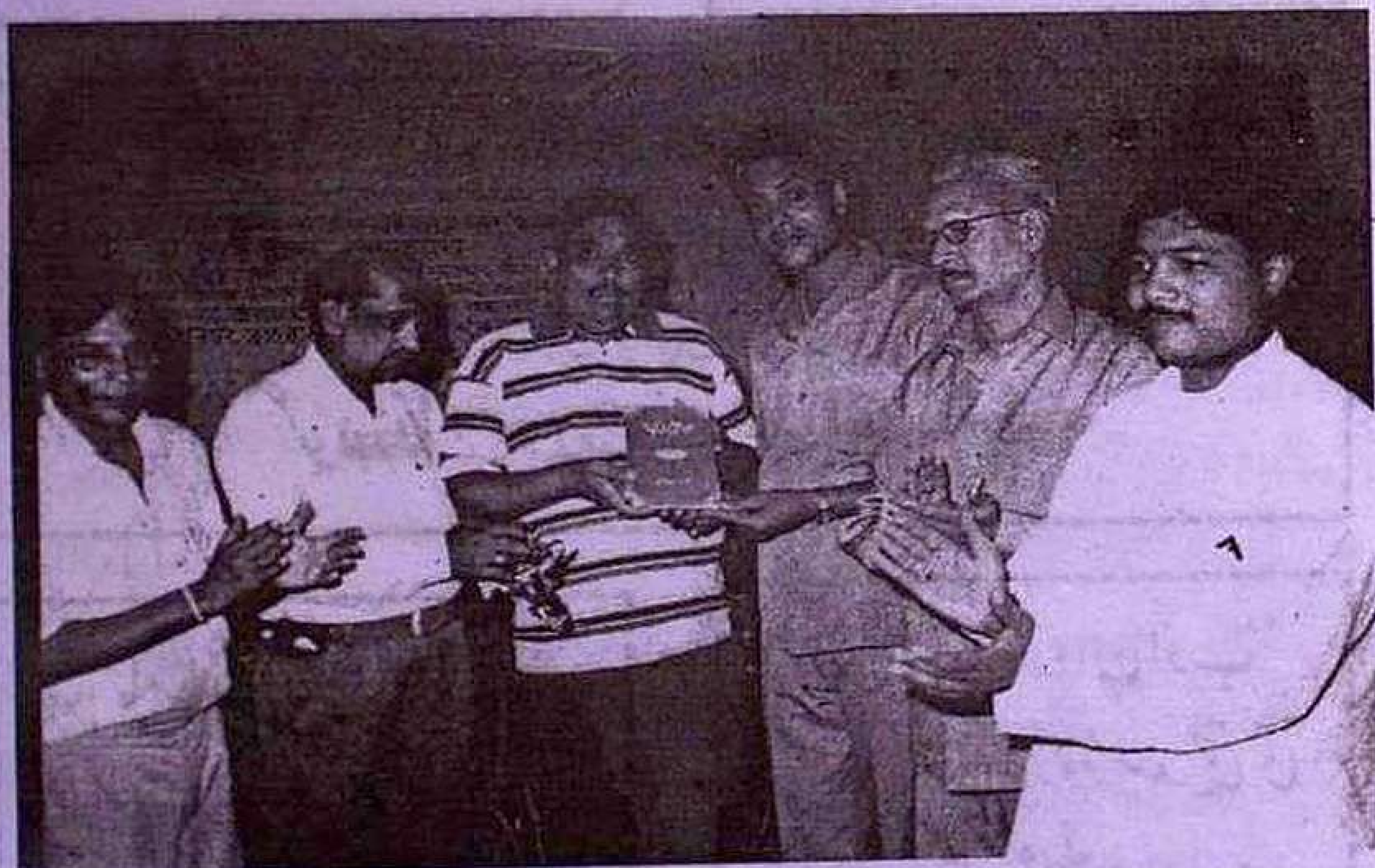
سابق گورنر حکومت مدھیہ پردیش جناب محمد شفیع قریشی صاحب کے ساتھ محو گفتگو مختار شمیم اور ان کی اہلیہ
مرحومہ کشور سلطان



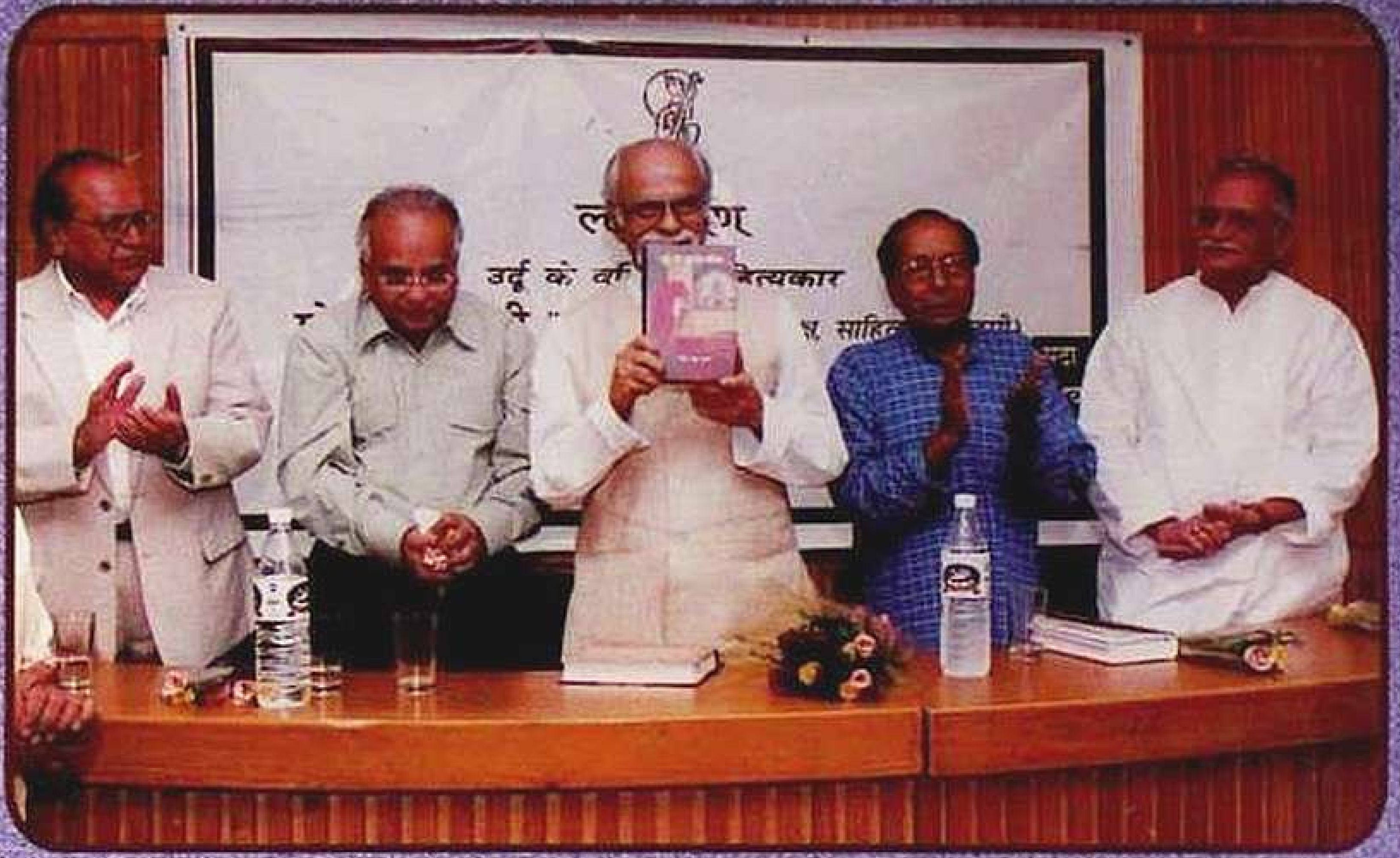
مختار شمیم اور شمیم حنفی



دائیں سے بائیں: محمد ممتاز راشدؔ، صدر تقریب میر تنہاؔ یوسفی آف ابوظہبی، مہمانِ خصوصی محمد سلیمان دہلوی اور شوکت علی ناز



''خیال رکھنا'' کے اجرا کے موقع پر دائیں سے: مشرف حسین محضرؔ، صدر مشاعرہ انجینئر وسیم احمد، صاحب کتاب خاور سرحدی، اجرا کرتے ہوئے جناب طارق گاندھی، مہمانِ خصوصی انجینئر اقبال اور کنوینر اولیس جمال شمسی.





گزشتہ دنوں گدی سماج کے ایک سیمینار دہلی میں ممبر آف پارلیمنٹ محمد مقیم خاں کے بنگلے پر سیفی سرونجی کی کتابوں
کا اجرا کرتے ہوئے محمد مقیم خاں آل انڈیا گدی سماج کے صدر علاء الدین آزاد میرٹھ کے عبدالجبار سیفی سرونجی
عبدالرحمٰن گدی عبدالغنی ایڈوکیٹ.

Quarterly
Issue No. 57
INTISAB
SIRONJ



(دائیں سے بائیں) پروفیسر محمد زماں آزردہ، اقبال مسعود، نگار عظیم، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، محمد خالد عابدی، مختار شمیم، رشید انجم، سیفی سرونجی اور انو اگروال



(دائیں سے بائیں) مشہور فلم ساز اور ڈائریکٹر مرزا کو اپنا مجموعہ پیش کرتے ہوئے مختار شمیم،
ساتھ ہیں ضلع کلکٹر شریمتی اسمتا گاٹے چندرا